نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد- ۳۵	جنوری سنہ ۳۹ء	شمار- ۱

ملاحظات

جسوقت ۲۸ء میں مومن نمبر شایع ہوا، اسی وقت میں نے ارادہ کیا تھا کہ ایک اشاعت مصحفی کے لئے بھی وقف کردوں گا، اور اپنے بعض احباب سے اس کا اظہار بھی کر دیا تھا۔ پھر اتفاق دیکھئے کہ اس کے بعد ظفر نمبر بھی نکل گیا، غالب بھی ہوگیا، اُردو شاعری کا بھی ایک پرچہ شایع کردیا گیا، اور اس کے علاوہ معلوم نہیں کتنے سالنامے نگار کے اور نکلے لیکن جو خراج مصحفی کے حضور میں مجھے پیش کرنا چاہئے تھا وہ برابر ملتوی ہوتا رہا- لیکن ایک لحاظ سے یہ تاخیر مفید بھی ثابت ہوئی، کیونکہ جن حضرات نے اس اشاعت میں مصحفی پر اظہار خیال کیا ہے ان کی فکر میں باندازۂ چند سال اور زیادہ پختگی پیدا ہوگئی ہے اور ہو سکتا ہے کہ اب سے پہلے وہ اتنا اور ایسا نہ لکھ سکتے۔

میر و مصحفی کے متعلق میری آگاہی بہت دیرینہ ہے۔ میں طالب علم کی حیثیت سے اپنے وطن فتحپور ہی میں تھا، جب اول اول کسی مضمون میں مصحفی کے یہ اشعار میری نگاہ سے گزرے:-

جب اس نے اُٹھائی تیغ ہم پر ❊ ہاتھوں کی پناہ ہم نے کرلی

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم ❊ تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

تیرے ہوتے جو مجھے یاد بھی آیا کوئی کام — میں نے موقوف اسے وقتِ دگر پر رکھا

اور مجھے بہت اچھے معلوم ہوئے۔ اس وقت میری عمر چودہ پندرہ سال کی ہوگی اور میں خود بھی نہایت ثقیل رنگِ غالب میں شعر کہتا تھا، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ دوسروں کے اشعار مجھے اسی رنگ کے پسند آتے تھے جسے میر و مصحفی کا رنگ کہا جاتا ہے۔ اس کا سبب غالباً یہ تھا کہ ایسے شعر مجھ سے بن نہ آتے تھے اور ان کی آسانی ہی مجھے بہت دشوار معلوم ہوتی تھی۔ یہ میں اسوقت کہہ رہا ہوں، ورنہ اُس عمر میں جب حجت و دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی، اس چھان بین کا کسے ہوش تھا۔ الغرض میری وابستگی کلام مصحفی و میر کے ساتھ مومن سے بھی پہلے کی ہے اور اس لئے اُصولاً مجھے سب سے پہلے انھیں دونوں کو لینا چاہئے تھا، لیکن میر کو تو میں نے اس لئے ترک کر دیا کہ اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا تھا اور کچھ اس لئے بھی کہ سورج کو سورج کہنے سے فائدہ ہی کیا ہے۔ مصحفی کی طرف توجہ کرنے میں اس لئے تاخیر ہوئی کہ اسکا کلام ملتا نہیں اور جو عام طور سے بازار میں میسر آتا تھا وہ اتنا اور ایسا نہ تھا کہ اسے سامنے رکھ کر کوئی فیصلہ کیا جاتا۔ صرف ایک نسخہ جس میں کلام مصحفی کا انتخاب رامپور میں کیا گیا تھا، کہیں کہیں ملجاتا تھا، لیکن وہ بہت ناقص و نامکمل تھا اور اسے دیکھ کر مصحفی کی شاعری پر کوئی حکم لگانا قرین انصاف نہ تھا۔ اس کے بعد جب حسرت موہانی نے غیر مطبوعہ دواوین کا ایک انتخاب شایع کیا تو مصحفی کی شاعری سمجھنے کا کچھ موقعہ ملا۔ لیکن چونکہ اس کا پورا کلام سامنے موجود نہ تھا اور جی یہی چاہتا تھا کہ سب کا سب مطالعہ میں آجائے اس لئے اور بھی تاخیر ہوتی رہی۔

مصحفی کے چھ دیوانوں کا ذکر نہ صرف گلشن بیخار میں پایا جاتا ہے بلکہ خود مصحفی کے بیان سے بھی اسکی تصدیق ہوتی ہے:-

مصحفی آج دعا مانگے ہے تجھ سے یا رب — ایک ہے ذات تری سب پہ غفور اور رحیم
یہ جو دیوان چھیوں اسکے ہیں مانند سہیل — بزم شاہاں میں لباس انکا رہو جلد ادیم

لیکن آزاد نے لکھا ہے کہ ان کے پاس ساتویں اور آٹھویں دیوان بھی موجود تھے، لیکن یہ آٹھوں دیوان کہاں میسر آتے، اس لئے آخر کار یہی فیصلہ کیا گیا کہ مصحفی کا جتنا اور جیسا کلام بھی ملسکتا ہے اسی پر قناعت کرنا چاہئے چنانچہ سالگزشتہ میں نے اس کا اعلان کر ہی دیا اور میرے احباب نے اس کی تکمیل میں اتنی محنت کی کہ میرے لکھنے کے لئے بھی کوئی گنجایش نہ چھوڑی۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلا مقالہ مولوی امیر احمد صاحب علوی بی۔ اے کا ہے، یہ مضمون ہر پہلو سے اتنا جامع و بسیط ہے کہ مصحفی کے سمجھنے کے لئے صرف اسی ایک مضمون کا پڑھ لینا کافی ہے۔ اس میں مصحفی کی ولادت سے لیکر وفات تک انکے حالات زندگی اور انواع شاعری کے متعلق وہ سب کچھ موجود ہے جو ایک مستفسر کی پوری طرح تشفی کرسکتا ہے۔

مصحفی کے سنہ ولادت اور جائے ولادت کی تحقیق، اس کی ابتدائی تعلیم و تربیت، اس کا تلمذ، اسکی شاعری کا آغاز، اسکی تدریجی ترقی، اسکی تصانیف، اس کے تلامذہ، اس کے سوانح حیات، اسکی لکھنوی زندگی، اس کے متعلق تذکرہ نویسوں کی رائیں، اس کے اصناف سخن پر تبصرہ اور اسی طرح کے اور تمام مباحث جو مصحفی کی انسانی و شاعرانہ زندگی سے متعلق ہو سکتے ہیں، سب اس مقالہ میں موجود ہیں اور اس قدر حُسن ترتیب، و مؤرخانہ کاوش و استدلال کے ساتھ ان مسایل کو پیش کیا گیا ہے کہ اگر صرف یہی ایک مقالہ شایع کر دیا جاتا تو کافی تھا

اس کے بعد دوسرا مقالہ جناب فراق گورکھپوری کا ہے۔ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ اُردو غزل گوئی میں مصحفی کا کیا مرتبہ تھا اور اس کا انفرادی رنگ کیا تھا۔ فنِ انتقاد میں سب سے زیادہ مشکل چیز یہی ہے کہ ہم ایک مصنف کا حقیقی میلان معلوم کر سکیں اور خصوصیت کے ساتھ غزل گوئی میں تو اسکی تعیین اور زیادہ دشوار ہے، کیونکہ ایک شاعر بہت سے اشعار اور کبھی کبھی پورا دیوان اپنے حقیقی رنگ سے بالکل الگ ہٹ کر کہ جاتا ہے (منشی امیر احمد صاحب مینائی کا صنمخانۂ عشق اس کی کھلی ہوئی مثال ہے کہ دیوان سارے کا سارا داغ کے تتبع میں کہا گیا اور اسمیں کوئی ایک شعر بھی ایسا نہیں ہے جو مصنفِ مرآۃ الغیب کے دماغ کا نتیجہ کہلایا جائے) لیکن فراق نے اپنی فطری نکتہ رسی سے کام لیکر نہایت خوبی کے ساتھ بتایا ہے کہ مصحفی کا انفرادی رنگ کیا تھا اور یہ جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ وہ ہر رنگ کے مقلد تھے اور خود ان کا طبیعی رنگ کوئی نہ تھا بالکل غلط ہے۔ جناب فراق نے اس سلسلہ میں ان کے تمام قابلِ ذکر ہمعصر شعراء کو بھی لے لیا ہے جن کا نام مصحفی کے ساتھ لیا جا سکتا تھا اور بتایا ہے کہ مصحفی کو ہم اُن سے کیونکر ممتاز کر سکتے ہیں۔ حسبِ عادت فاضل مقالہ نگار نے مصحفی کی شاعری کے کسی پہلو کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور انتقاد عالیہ کا پورا حق ادا کر دیا ہے۔

مصحفی کی شاعری پر اس کے علاوہ ایک مضمون جناب مجنوں گورکھپوری کا ہے اور دوسرا مولانا حسرت موہانی کا، جناب مجنوں کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ "مصحفی کے کلام سے خود ان کا مقام متعین ہو جاتا ہے، وہ اس محفل کے رُکن تھے جس کے صدر نشین میر تھے۔ دلّی کے شاعروں نے اُردو غزل کو داخلیت کی انتہائی منزل تک پہونچا دیا تھا یہاں تک کہ اُردو شاعر صرف اپنے باطن میں کھو کر رہ گیا تھا اور اب ضرورت تھی کہ وہ داخلیت کے حصار سے باہر نکلے، اسی خارجی میلان کا دوسرا نام لکھنوی دبستان شاعری ہے، لیکن لکھنوی شاعر اصل فرض کو بھول کر اپنی رو میں بہت دور چلا گیا اور صرف تکلف و تصنع کو شاعری سمجھ لیا۔ مصحفی ان دونوں میلانات یعنی داخلیت و خارجیت کے درمیان ایک خطِ اعتدال ہیں۔ اسی نتیجہ پر جناب فراق بھی پہونچے ہیں۔

مولانا حسرت کا خیال ہے کہ مصحفی میں میر و سودا، فغاں و سوز، جرأت و شاہ نصیر سب کا رنگ پایا جاتا ہے اور جن غزلوں یا بیتوں میں ان تمام اساتذہ کی خوبیوں کو ان کی کہنہ مشقی اور اُستادی یکجا کر دیتی ہے تو ان کا شمار

اُردو شاعری کے بہترین نمونوں میں کیا جا سکتا ہے۔ مولانا نے اپنے مقالہ میں مصحفی کے اشعار پیش کرکے بتایا ہے کہ جو سادگی و صفائی، نرمی و حلاوت مصحفی کے یہاں پائی جاتی ہے وہ کم کسی استاد کو نصیب ہوئی تھی اور خصوصیت کے ساتھ مشکل زمینوں میں جیسے شگفتہ اشعار مصحفی نے نکالے ہیں ویسے کسی کو نصیب نہیں ہوئے۔

مصحفی کی غیر مطبوعہ مثنویوں پر جناب آسی کا مقالہ دیکھنے کی چیز ہے، انھوں نے ان کے دوسرے ہمعصر شعراء کی مثنویوں سے مقابلہ کرکے بتایا ہے کہ مصحفی اس رنگ میں بھی کسی سے کم نہ تھے۔ مصحفی کی جو مثنویاں دی گئی ہیں وہ اسوقت تک کہیں شایع نہیں ہوئی تھیں اور ہم جناب آسی کے ممنون ہیں کہ انھوں نے اپنے نوادر مخطوطات سے یہ بیش بہا عطیہ نگار کو مرحمت فرمایا۔ اسی سلسلہ میں ہم جناب ہوش ملیح آبادی کے بھی ممنون ہیں کہ انھوں نے مصحفی کا ایک غیر مطبوعہ ترجیع بند ہمیں عنایت کیا اور جناب مشیر احمد صاحب علوی کے بھی جنھوں نے مصحفی کے دو غیر مطبوعہ تذکروں (ید بیضا اور نور ازل) پر تبصرہ کرکے ملک کے سامنے بالکل نئی چیز پیش کی۔

انتخاب کلام کے متعلق صرف یہ عرض کرنا ہے کہ آخر کے دو صفحے مصحفی کے ایک غیر مطبوعہ دیوان کا انتخاب ہیں یہ دیوان بھی ہم کو جناب آسی سے ملا تھا۔

اس سلسلہ میں اُن بعض مضامین کا ذکر بھی ضروری ہے جو ہمیں ملے اور شایع نہ ہو سکے۔ ان میں ایک مقالہ جناب مختار الدین صاحب آرزو کا ہے۔ اس میں انھوں نے نہایت محنت و کاوش سے مصحفی کے تمام شاگردوں کا ذکر کیا ہے جن کی تعداد سَو سے متجاوز ہے، مقالہ نہایت بسیط و مفید ہے لیکن اس کے تمہیدی صفحات ہمیں موصول نہ ہوئے اور اس لئے اشاعت ملتوی کردی گئی۔ امید ہے کہ آرزو صاحب اس کی تکمیل فرمادیں گے اور ہم آئندہ کسی اشاعت میں قارئین نگار کے سامنے پیش کر سکیں گے۔

ایک اور مقالہ جناب محمد رشید صاحب گورکھپوری کا قابل اشاعت تھا جس میں انھوں نے مصحفی کے حالات اور شاعرانہ خصوصیات سے بحث کی ہے، لیکن جناب امیر احمد صاحب علوی اور فراق و مجنوں کے مضامین کے بعد اس کی اشاعت ایک ہی بات کی تکرار ہوتی اس لئے اس کو شایع نہیں کیا گیا، ہم جناب محمد رشید صاحب کے ممنون ہیں کہ انھوں نے نگار کے لئے گرانقدر مقالہ لکھنے کی زحمت گوارا فرمائی۔

تیسرا مقالہ جناب مولوی تمکین کاظمی صاحب کا تھا جس میں انھوں نے مصحفی کی شاعری کی چند خصوصیات سے بحث کی ہے اور چوتھا کاظمی بیگم (آمنہ تمکین کاظمی) کا جس میں مصحفی کی زندگی کا مطالعہ خود ان کے کلام کی روشنی میں کیا گیا ہے۔ یہ دونوں مقالے خوب ہیں، لیکن محض اس لئے کہ اس نوع کے انتقادی مقالے درج ہو چکے تھے شایع نہ ہو سکے۔ ہم جناب تمکین کاظمی اور ان کی بیگم صاحبہ کے ممنون ہیں کہ انھوں نے باوجود قلت فرصت کے

نگار کو موردِ الطاف بنادیا۔

ایک اور مقالہ جس کے شایع نہ ہوسکنے کا ہمیں افسوس ہے ہمارے عزیزدوست مولانا عبدالمالک آروی کا ہے، اس کا عنوان ہے "مصحفی کا تذکرۂ عقدِ ثریا" لیکن اس سلسلۂ انتقاد میں بعض ایسے دلچسپ مباحث انھوں نے چھیڑ دئے ہیں اور ایسی مفید معلومات فراہم کی ہیں کہ ان کی اشاعت ناگزیر ہے۔ آیندہ ماہ کی اشاعت میں آپ اسے ملاحظہ فرمائیں گے۔ غنیمت ہے کہ ان کے درمیان رسم تشکر قایم نہیں ورنہ میں اس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے بشکل مناسب الفاظ پا سکتا۔

حیدرآباد میں آریہ سماج کی تحریک

سررشتۂ معلومات عامہ سرکارِ عالی نے ایک پمفلٹ شایع کیا ہے جس میں آریہ سماجی ادارے کی ان کارگزاریوں پر جو حیدرآباد میں جاری ہیں دلچسپ طریقہ سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس میں آریہ سماجوں کی تقریروں، تحریروں، گیتوں اور بھجنوں کے ایسے متعدد حوالے درج ہیں جن سے موثر انداز میں اس اصلی نفسیاتی جذبہ کا پتہ چلتا ہے جو اس تحریک کے پس پشت کام کر رہا ہے، گو بظاہر یہ تحریک مذہبی نوعیت کی معلوم ہوتی ہے لیکن درحقیقت اس میں انتہائی تشدد آمیز سیاسی اور فرقہ واری رجحانات پیدا ہو گئے ہیں، دہلی کی آریہ سارودیشک سبھا نے حکومت سرکارِ عالی سے جو چودہ مطالبات کئے ہیں انھیں سلسلہ وار درج کیا ہے اور ہر مطالبہ کے مقابل اصل صورت حال واضح کرنے کے لئے علحدہ نوٹ دیدئے گئے ہیں۔ مذہبی رسوم کی انجام دہی، اکھاڑوں کے قیام اور خانگی مدارس کے قیام اور نگرانی سے متعلق جو قواعد نافذ ہیں۔ اور جنھیں آریہ سماجی ان مظالم اور ناانصافیوں کی نمایاں مثالوں کے طور پر ہندوؤں اور خاصکر آریہ سماجیوں پر ڈھائی جا رہی ہیں نشر کرنے سے کبھی نہیں تھکتے۔ انھیں پورے طور پر نقل کر دیا گیا ہے تاکہ پڑھنے والے ان کی مبینہ طرفداری کے متعلق خود رائے قایم کر لیں۔ ایک دوسرے ضمیمہ میں وہ حالات بیان کئے گئے ہیں جن سے مجبور ہو کر حکام نے متعدد آریہ سماجی اخباروں کا داخلہ ریاست میں بند کر دیا اور آخری ضمیمے میں ان اُمور سے ناقدانہ بحث کی گئی ہے جو ایک حال میں شایع شدہ پمفلٹ میں جس کا عنوان "حیدرآباد میں آریہ سماج کا مسئلہ" ہے، پیش کئے گئے ہیں۔

جو لوگ ابتک آریہ سماجی ذہنیت سے بے خبر ہیں ان کے لئے اس پمفلٹ کا وہ حصہ سب سے زیادہ صدمہ پہونچانے والا اور آنکھیں کھولنے والا ہے جس میں پے درپے ایسے حوالے دئے گئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ آریہ سماجی ایڈیشنگ زیادہ تر کس قسم کے مواد پر مشتمل ہوتا ہے، یہ بیانات کہ "انجیل جھوٹ سے بھری ہوئی ہے، پیغمبر اسلام کے والد ایک ہندو قبیلہ کے فرد تھے، بھگوت گیتا ایک کثیف کتاب تھی، سری کرشنا ایک بدمعاش

اور چور تھے اور بانیِ اسلام نے اپنی بیٹی سے شادی کی تھی"۔ ان جواہر ریزوں میں سے چند ہیں جو خالص مذہبی پہلو سے تعلق رکھتے ہیں۔ لوگوں کو اس پر اکسانا کہ وہ اُٹھیں، حیدر آباد کو بنیاد سے ہلا دیں، مسلمان عورتوں کی عصمت دری کریں، مسلمانوں کو غلامی کے گڑھے میں ڈالدیں، نظام کے تخت کو چھ مہینے کے اندر چھین لیں، مسلمانوں کو ہندوستان میں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے اور یہ کہ آریوں کو یہ کوشش کرنی چاہئے کہ ہندوستان میں ایک مسلمان بھی باقی نہ رہے ۔ یہ اس سیاسی بصیرت کے چند نمونے ہیں جو اس مذہبی تحریک کے مبلغ پیش کرتے رہتے ہیں، ان مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جو طریقے آریہ حضرات استعمال کرتے ہیں وہ یہ ہیں کہ مسلح جلوس نکالے جائیں، قانون شکنی اور احکام کی خلاف ورزی کی جائے، ریاست کے خلاف نفرت پیدا کیجائے ممالک محروسہ میں جو مختلف فرقے آباد ہیں ان میں آپس میں نسلی منافرت پیدا کی جائے، دوسرے مذاہب اور فرقوں کے خلاف دل آزار تقریریں کی جائیں اور ریاست کے خلاف عملاً تخریبی شورش کی جائے۔ ہر اس شخص کے لئے جو حیدر آباد کے آریہ سماج کی امتیازی خصوصیات معلوم کرنے کا خواہشمند ہو، اس پمفلٹ کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا۔

ہم آیندہ اشاعت میں وضاحت کے ساتھ بتائیں گے کہ وہ تحریک جس کا اجمالی خاکہ ان سطور میں دیا گیا ہے اس کی تفصیل کتنی تکلیف دہ، کس قدر لغو و غلط اور ہندوستان کے مستقبل کے لئے کس درجہ خطرناک ہے۔

توقیت

توقیت کے متعلق اس وقت تک بہت کم حضرات نے خریداری کی رضامندی ظاہر کی ہے۔ براہِ کرم پھر اس پر غور کیا جائے کہ جن اصحاب کے پاس ۱۹۳۶ء کا پورا فایل نگار کا موجود ہے ان کے لئے اس کا حاصل کرنا کس قدر ضروری ہے

توقیت کی کتابت ہو رہی ہے اور اسی مہینے طیار ہو جائے گی، جن حضرات کی رقم وصول ہو چکی ہے ان کو آخر ماہ تک یہ کتاب پہونچ جائے گی۔

قارئین نگار میں سے وہ اصحاب جنھوں نے اس پر اسوقت تک غور نہیں کیا ہے وہ براہ کرم بیرنگ کارڈ ہی کے ذریعہ سے ہم کو اپنے ارادہ خریداری سے مطلع فرمادیں۔

منیجر نگار

حیاتِ مصحفی

بارھویں صدی ہجری کے وسط میں جبکہ سلطنت مغلیہ کا آفتاب اقبال لب بام اور اُردوئے معلّٰی کا اخترِ بخت تاباں تھا پُرانی دلّی کے قریب قصبۂ اکبرپور میں قبیلۂ شیوخ کے ایک مقتدر رکن ولی محمد بن درویش محمد کو غلام ہمدانی نام فرزند عطا ہوا جو افقِ شاعری پر چودھویں کے چاند کی طرح چمکا۔

شیخ ولی محمد کے اسلاف تمتع دنیوی سے بہرہ مند تھے "نوکری خانۂ بادشاہ" آبائی پیشہ تھا۔ قیام بیشتر شاہجہاں آباد میں رہتا تھا لیکن قصبات کو شرافت کا ملجا سمجھ کر اکبرپور کے توطن کو دلّی کی بود و باش پر ترجیح دیتے تھے مستورات کا مسکن وہیں تھا اور اسی مبارک زمین پر اُس بلند اقبال صاحبزادے کی ولادت ہوئی جو مصحفی کے تخلص سے دُنیائے ادب میں مشہور و معروف ہے اور جس کا نام نظمِ اُردو کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

قایم مقام نام تخلص ہے مصحفی — کب صفحۂ جہاں سے مرا نام کم ہوا

سالِ ولادت

سالِ ولادت کسی تذکرے میں درج نہیں۔ مولانا حسرت موہانی نے ایک مضمون[1] میں سن پیدائش ۱۱۶۴ھ لکھا ہے، لیکن کسی سند کا حوالہ نہیں دیا۔ مصحفی نے تذکرۂ ریاض الفصحا میں جو ۱۲۳۶ھ میں تمام ہوا، اپنی عمر[2] ۸۰ سال کے قریب بتائی ہے اور دیوانِ ششم کے دیباچہ میں جو ۱۲۲۴ھ میں لکھا گیا ساٹھ[3] سال سے تجاوز ظاہر کی ہے اور یہ بھی تحریر کیا ہے کہ ان کی ولادت احمد شاہ کے عہدِ سلطنت میں ہوئی جو یکم جمادی الاول ۱۱۶۱ھ کو تخت نشین ہوئے تھے۔ لہذا سنہ ولادت نہ ۱۱۶۴ھ ہے نہ ۱۱۵۶ھ بلکہ[4] ۱۱۶۱ھ کے قریب سمجھنا چاہئے۔

---

[1] اُردوئے معلّٰی بابت جون ۱۹۰۶ء (جلد ۲ نمبر ۶)۔ [2] "سنہ عمرم تا الی الیوم قریب بہ ہشتاد رسیدہ باشد۔ اکنون دل از دنیا برکندہ جز یاد الٰہی و مصروف بودن بہ نماز و روزہ چیزے دیگر نمی خواہد۔ او سبحانہ عاقبت بخیر کناد۔" اس حساب سے سنہ ولادت ۱۱۵۶ھ آتا ہے۔ [3] "تولدِ من در احمد شاہی ست۔ تا الیوم عمرم از شصت متجاوز خواہد بود۔ ۱۲۲۴ھ در لکھنؤ تحریر یافت" تذکرہ جلوۂ خضر از صفیر بلگرامی۔ صفحہ ۳۶۔ [4] اس حساب سے وہ ۱۲۲۴ھ میں ۶۰ سال سے زیادہ کے یعنی ۶۳ برس کے تھے اور ۱۲۳۶ھ میں ۷۵ برس کے تھے۔

وطن زمانۂ حال کے تذکرہ نویسوں نے مصحفی کو "باشندۂ امروہہ" تصور کیا ہے لیکن شعرائے اُردو کا قدیم ترین تذکرہ جس میں مصحفی کا احوال شامل ہے میر حسن مصنف مثنوی سحرالبیان نے ۱۱۸۸ھ اور ۱۱۹۲ھ کے درمیان مرتب کیا تھا[1] اور اس میں صراحتہً لکھا ہے کہ مصحفی کے بزرگوں کا وطن اکبرپور تھا" مولدش اکبرپور کہ قصبہ ایست وطن بزرگانش از قدیم متصل دہلی"۔ میر حسن اور مصحفی کا برسوں لکھنؤ میں ساتھ رہا تھا، میر حسن کے صاحبزادے میر مستحسن خلیق اپنے والد ماجد کے حکم سے شعر و سخن میں مصحفی کے شاگرد ہوئے تھے اور مصحفی خود تحریر کرتے ہیں کہ میر حسن اُن سے رابطۂ دوستی رکھتے تھے "تا زندہ بود با فقیر بسیار رابطۂ دوستی درست داشت"[2] لہٰذا میر حسن سے زیادہ صحیح روایت کسی تذکرہ نویس کی نہیں ہو سکتی۔ میر قدرت اللہ قاسم دہلوی بھی مصحفی کے دوست تھے اور ان کے مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ اپنے ضخیم تذکرۂ شعراء میں مصحفی کو ساکن امروہہ نہیں لکھتے بلکہ مردم بیرونجات سے قرار دیتے ہیں جس سے مقصود "باشندۂ مفصلات دہلی" بھی ہو سکتا ہے۔

"از مردم بیرونجات است اما بہ تقریب روزگار با کلانہائے خود در بدو شعور دار حضرت دہلی شدہ نشو و نما یافتہ"

نواب مصطفٰے خاں شیفتہ تذکرۂ گلشن بے خار میں اور منشی کریم الدین دہلوی طبقات شعرا میں مصحفی کی بابت لکھتے ہیں کہ "اصل اُن کی قصبۂ امروہہ سے ہے"۔

مصحفی نے اپنا حسب و نسب "مجمع الفوائد" میں تحریر کیا تھا مگر وہ کتاب اب نایاب ہے اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ مصحفی کے اسلاف کس زمانہ تک قصبۂ امروہہ میں رہے اور کب وہاں کی سکونت ترک کر کے مضافات دہلی میں آباد ہوئے مرزا علی لطف نے تذکرہ "گلشن ہند" میں تحریر کیا کہ "مصحفی تخلص۔ غلام ہمدانی نام ساکن امروہہ اپنی قوم کا اشراف ہے"[4] نتیجہ یہ ہوا کہ تمام متاخرین تذکرہ نگاروں نے بالاتفاق شیخ کو باشندۂ امروہہ قرار دیدیا اور ایک فاضل انشاپرداز کو مصحفی کے کلام میں "امروہہ پن" محسوس ہونے لگا لیکن صحیح روایت صرف میر حسن کی ہے جس کی تصدیق خود شیخ نے کی ہے:۔

دلی کہیں ہیں جس کو زمانے میں مصحفی
میں رہنے والا ہوں اُسی اُجڑے دیار کا

نکتہ شناسوں کے لئے یہ شہادت بھی قابل لحاظ ہے کہ مصحفی اپنے "تذکرۂ ہندی" نیز "ریاض الفصحا" میں دلی کا ذکر جابجا بڑی محبت سے کرتے ہیں اور وہاں سے اُجڑ کر لکھنؤ بسنا "جلائے وطن" سے تعبیر کرتے ہیں۔ "تکمیل فارسی و نظم و نثر آں بہ شاہ جہاں آباد در سی سالگی بخوبی میسر آمدہ بود۔ در ایامیکہ جلائے وطن کردہ دریں دیار تازہ آمدہ قیام ورزیدم علم عربی خواندہ ام" لیکن امروہہ کو اپنا یا اپنے اسلاف کا وطن کسی جگہ نہیں لکھا۔

میر قدرت اللہ قاسم کا بیان ہے کہ مصحفی "بدو شعور" سے اپنے بزرگوں کے ساتھ دلی آئے۔ شیفتہ کی روایت ہے کہ "عنفوان جوانی سے شاہجہاں آباد میں اقامت اختیار کی"۔ کریم الدین دہلوی کہتے ہیں کہ "عنفوان شباب" میں آئے مرزا علی لطف لکھتے ہیں کہ "ایک مدت شاہ عالم بادشاہ غازی کے عہد میں مقیم شاہجہاں آباد رہے"۔

---

[1] تذکرۂ شعرائے اُردو مولفۂ میر حسن صفحہ ۱۹۰ — [2] تذکرۂ ہندی مصحفی صفحہ ۶۹ — [3] ریاض الفصحا صفحہ ۲۸۷ — [4] تذکرۂ گلشن ہند صفحہ ۲۲۷۔

رام بابو صاحب سکسینہ "تاریخِ ادبِ اُردو" میں بغیر کسی سند کے تحریر فرماتے ہیں کہ "آغازِ جوانی میں وطن چھوڑ کر ۱۱۹۰ھ میں دلّی آئے۔ اُنھوں نے ۱۱۹۵ھ میں شہرت حاصل کرلی تھی کیونکہ تذکرۂ میر حسن میں ان کا ذکر عزت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ خود مشاعرہ بھی کرتے تھے جن میں معزز شعرا مثل انشاؔ اور میر حسن و جراُت وغیرہ کے جمع ہوتے تھے بارہ برس دلی میں رہ کر مثل اور شعرا کے لکھنؤ آئے"۔[1]

آخر الذکر روایت سرتاپا غلط ہے کیونکہ ۱۱۹۰ھ میں مصحفی سی سالہ تھے۔ آغازِ جوانی کا وقت گزر چکا تھا۔ تذکرۂ میر حسن ۱۱۹۲ھ سے پہلے مرتب ہوا تھا۔ ۱۱۹۵ھ میں میر حسن و جراُت دلّی میں موجود نہ تھے اور ۱۱۹۰ھ کے بعد بارہ برس تک دلی میں قیام ممکن نہ تھا کیونکہ وہ بارھویں صدی کے اختتام سے پہلے لکھنؤ آچکے تھے جیسا کہ آیندہ عرض کیا جائیگا البتہ قاسم۔ شیفتہ۔ کریم الدین اور لطف کی روایات کی تطبیق یوں ہوسکتی ہے کہ:۔ جب دلّی کی حکومت میں "تفرقۂ شدید" رونما ہوا۔ نمک حرام وزیر نے احمد شاہ کو نابینا کیا۔ خاندانِ مصحفی کا روزگار بگڑا تو یہ قبیلۂ اشرافِ اکبرپور کی (جو اب ایک گاؤں رہگیا ہے) سکونت ترک کرکے امروہہ میں آباد ہوا جہاں مصحفی کا عہدِ طفلی گزرا۔ اس کے بعد ۱۲ یا ۱۳ برس کی عمر میں دوبارہ دلّی آئے اور اُس وقت شاہ عالم سریر آرائے سلطنت ہوچکے تھے۔

عہدِ طفلی تذکرۂ ہندی میں گوہریؔ بدایونی کی بابت لکھا ہے کہ ان کے دو شعر میں نے عالمِ طفولیت میں عالم شاہ پیرزادے کی زبان سے سنے تھے اور ابھی تک یاد ہیں:۔[2]

روبرو پلکوں کے مت جا بس کے بانوں کو نہ چھیڑ
آفت آوے گی تو اس زنبور خانوں کو نہ چھیڑ

آخرش مارا پڑا ہاتھوں سے اُن کے گوہریؔ
ہم نہ کہتے تھے کہ ان بانکے پٹھانوں کو نہ چھیڑ

عالم شاہ محزوؔن کے حال میں لکھتے ہیں کہ وہ قصبۂ امروہہ کے پیرزادوں سے تھے۔ محرم میں مرثیے اور سلام کہتے تھے "جس زمانہ میں کہ فقیر مکتب نشین تھا اُس ضلع میں محزوؔن کی شاعری کی شہرت تھی"۔ سید محمد زماں زماؔں کی بابت تحریر ہے کہ وہ قصبۂ امروہہ کے سادات عالی تبار سے تھے۔ دنیا کی بیوفائی سے تنگ آکر تبدیل لباس کیا اور ایک باغیچہ میں تنہا رہتے تھے۔ "فقیر اپنے اُستاد کے ساتھ عالمِ مکتب نشینی اور ابتدائے شوق موزونی میں ایک دن انکی صحبت میں پہونچا تھا" اس کے بعد زماؔں کا ایک شعر نقل کیا ہے:۔

عارض ہے گل کا صاف ولیکن جھلک نہیں
نرگس کے چشم ہے پہ کٹیلی پلک نہیں

حزیںؔ کی بابت لکھتے ہیں کہ "اُس کا نام[3] معلوم نہیں۔ فردوس آرامگاہ کے عہد کا شاعر تھا۔ اس کے تین شعر عالمِ مکتب نشینی سے یاد ہیں"۔

---

[1] تاریخ ادب اُردو۔ صفحہ ۲۲۹، ۲۳۰ ملخصاً۔ [2] تذکرۂ ہندی۔ صفحہ ۱۸۲۔ "سلطنت خانۂ ایں روسیاہ ہم خاک برابر شد"
[3] حزیں کا نام میر محمد باقر تھا۔ مرزا جانِ جاناں مظہر کے شاگرد تھے۔ قدرت اللہ قاسم لکھتے ہیں کہ "فردوس آرام گاہ کے عہد میں بھی ایک حزیں تھا اور بس

ایک غیر معروف شاعر شہید کی بابت مصحفی لکھتے ہیں کہ "دورۂ میر و مرزا سے ہے، پختہ گو معلوم ہوتا ہے اور اسکے دو شعر مجھ کو عالمِ مکتب نشینی سے یاد ہیں"۔

میر عبد الرسول نثار اکبر آبادی کے احوال میں لکھتے ہیں "فقیر نے ان کو ابتدائے شاعری میں قصبۂ امروہہ میں دیکھا تھا۔ حسب ذیل شعر تذکرۂ میر حسن صاحب میں محمد شاکر ناجی کے نام سے لکھا ہو لیکن میں نے اُس کو عبد الرسول نثار کی زبان سے سُنا ہے:-

اس کا رخسار دیکھ جیتا ہوں   عارضی میری زندگانی ہے

الغرض مصحفی کا عہد طفلی امروہہ میں گزرا۔ ابتدائی تعلیم یہیں ہوئی۔ شعر گوئی کی بسم اللہ بھی ہو گئی۔ اسکے بعد بارہ تیرہ برس کی عمر میں تحصیل علم کے لئے دلی آئے۔ فارسی نظم و نثر کا درس لیا۔ لیکن شاعری کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ محاورات و اصطلاحات کی تحقیق میں زیادہ وقت صرف کرتے تھے۔ درسیات کی تکمیل نہ ہو سکی۔ تلاش معاش میں آنولہ گئے ٹانڈے میں رہے۔ لکھنؤ میں ایک سال گزارا۔ پھر دلی آئے تب تیس سال کی عمر میں نظم و نثر فارسی کی تحصیل سے فراغت ہوئی اور سنِ شریف چالیس سے متجاوز ہو چکا تھا جب عربی میں درجۂ فضیلت حاصل کیا۔

صاحب آبِ حیات[۱] نے چھینٹا دیا ہے کہ "علمیت کا حال معلوم نہیں۔ مگر تذکروں سے اور خود ان کے دیوانوں سے ثابت ہے کہ زبان فارسی اور ضروریات شعری سے باخبر تھے اور نظم و نثر کی کتابوں کو اچھی طرح دیکھ کر معلومات وسیع اور نظر بلند حاصل کی تھی"، لیکن شمس العلما کو یہ خبر نہ تھی کہ مصحفی نے عربی میں طبیعیات۔ الہیات اور ریاضیات کا ملا حسن کے نامور شاگرد ملا مستقیم ساکن گوپامئو سے درس لیا تھا۔ صدرا اور میبذی پڑھی تھی۔ قانونچہ میں مولوی مظہر علی نحوی کے شاگرد تھے۔ ادب عربی میں اس قدر استعداد بہم پہونچائی کہ تقریباً ایک جزو عربی غزلیات کا اور متعدد قصیدے نعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں تصنیف کئے تھے۔ مقامات حریری کے بعض ابواب کی شرح لکھی تھی قرآن شریف کے معانی و مطالب حل کرنے کے لئے تفاسیر کی احتیاج نہ تھی۔ "اکثر کتابہائے عربی مثل مختصر و مطول بیک مطالعۂ من آسان می شوند و ہیچ مطلبے غامض از فکرِ من در پردۂ اختفائی ماند"۔

اساتذہ

لکھنؤ میں جن اساتذہ سے عربی کی فضیلت حاصل کی اُن کے اسمائے گرامی ابھی بیان ہوئے۔ دلی میں میزان الصرف مولوی نیاز احمد[۲] سے پڑھی تھی جو اُس وقت طالبعلم تھے اور اب دنیائے تصوف میں شاہ نیاز بریلوی کے لقب سے مشہور ہیں لیکن پتہ نہیں چلتا کہ فارسی کا اُستاد کون تھا۔ صرف یہ لکھا ہے کہ "فیض صحبت بزرگاں سے نظم و نثر کی تکمیل ہوئی"[۳]۔ معلوم ہوتا ہے کہ متعدد اساتذہ کی محفلوں میں حاضر ہو کر علم سیکھا اور دلی میں

---

[۱] مولوی محمد حسین آزاد مرحوم — [۲] ریاض الفصحا صفحہ ۲۸۷ — [۳] ریاض الفصحا صفحہ ۲۳۹ —

کسی خاص بزرگ کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ عہد "مکتب نشینی" امروہہ میں گزرا تھا۔ وہاں کے بھی کسی اُستاد کا نام ظاہر نہیں کیا یہ مسلمہ ہے کہ شاعری کا آغاز امروہہ میں ہو گیا تھا۔ بعض سخن سنجوں سے ملاقات وہیں ہوئی تھی۔ میر عبدالرسول نثار کی بہت تعریف کرتے ہیں "وہ مرد جہاندیدہ اور فہمیدہ ہے ---- فقیر نے اس کو ابتدائے شاعری کے وقت قصبۂ امروہہ میں دیکھا تھا۔ اکثر بعد ہفتہ وعشرہ کے ملاقات ہوتی تھی اور تذکرۂ شعر باہم ہوتا تھا۔ وہ میر ومرزا کے معاصر شاعر سحر کار فصیح وبلیغ تھے۔ عمر ان کی تقریباً ساٹھ برس کی ہوگی اب معلوم نہیں کہ زندہ ہیں یا مر گئے۔" ممکن ہے کہ نثار کو اپنی ابتدائی غزلیں دکھائی ہوں، مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں۔

تذکرۂ فارسی گویان مسمیٰ بہ "عقد ثریا" میں ایک جگہ لکھا ہے کہ محتشم خاں محتشم قوم کنبوہ ساکن شاہجہاں آباد شخص مسن وعمدہ معاش تھے۔ فقیر نے ان کو اپنی شعر گوئی کے ابتدائی زمانے میں قصبۂ امروہہ میں دیکھا تھا۔ ہندی اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے" مگر اُردو شعرا کے تذکرے میں ان کا نام بھی نہیں لکھا۔ لہذا ان سے غالباً کوئی استفادہ نہیں ہوا۔ تذکرۂ "سراپا سخن" میں ہے کہ مصحفی میر امانی کے شاگرد تھے لیکن یہ روایت بھی پایۂ اعتبار سے ساقط ہے "امانی" تخلص "میر امانی" نام۔ خواجہ آثم مرثیہ گو کے فرزند سنہ ۱۱۸۰ھ تک دلی میں تھے۔ اس کے بعد مرشد آباد چلے گئے اور وہیں سنہ ۱۱۸۰ھ میں انتقال کیا۔ مصحفی کم سنی میں تحصیل علم کے لئے دلی آگئے تھے اس لئے ممکن ہے کہ انھوں نے میر امانی کو دیکھا ہو، شاہجہاں آباد میں ایک "امانی" اور بھی تھے جن کا ایک شعر شیفتہ نے گلشن بے خار میں نقل کیا ہے مگر ان امانی کا نام تک معلوم نہیں۔ مصحفی نے اپنے تذکرۂ شعرا میں کسی "امانی" کا نہ حال لکھا نہ کوئی شعر نقل کیا اگر ان سے کچھ فیض پایا ہوتا تو تذکرے میں ان کا نام ضرور لکھتے۔ دلی کے ایک اور شاعر میر امانی نام۔ اسد تخلص تھے جن کا حسب ذیل شعر غالب کی طرف نافہمی سے منسوب کیا گیا تو انھوں نے رعایت[1] لفظی سے نفرت ظاہر کی۔

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی
مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

میر امانی اسد کا کچھ کلام مصحفی نے تذکرۂ ہندی میں نقل کیا ہے اور ان کو "جوان ظریف مزاج" لکھا ہے۔ وہ مصحفی کے ہم عمر تھے اور اس لائق نہ تھے کہ مصحفی کے ادنےٰ شاگردوں کے بھی اُستاد ہو سکتے۔ غرض مصحفی کا کسی اُستاد سے باقاعدہ اصلاح لینا ثابت نہیں ہوتا۔ طبیعت قدرت نے موزوں بنائی تھی۔ بغیر غور وفکر کے شعر کہتے اور خود ہی اغلاط واسقام کو دور کرتے تھے۔ فطری شاعر خدا کے شاگرد ہوتے ہیں ان کو کسی اُستاد کی ضرورت نہیں۔ شاہ حاتم اور مرزا مظہر جانجاناں بھی کسی کے فن شعر میں شاگرد نہ تھے۔ قصہ مختصر بارہ تیرہ سال کی عمر سے اکیس بائیس برس کے سن تک مصحفی تحصیل علم کی سعی کرتے رہے مگر تنگدستی سے پراگندہ دل تھے۔ دلی میں اشراف گردی کا دور دورہ تھا۔ شاہ عالم مشرقی اضلاع میں سیر وتفریح فرما رہے تھے۔ نواب نجیب الدولہ امیر الامرا کو مرہٹوں کے خوف سے چین نہ تھا۔ البتہ

[1] عود ہندی

اودھ میں نواب شجاع الدولہ کی خود سرانہ ریاست تھی۔ اور دولت کی فراوانی عیش و عشرت کی افزونی سے فرخ آباد اور روہیلکھنڈ میں بھی علوم و فنون کی بارگاہیں سجی تھیں۔ دلی سے دل تنگ ہو کر جو اہلِ کمال جلاوطن ہوتے وہ بیشتر لکھنؤ کا رُخ کرتے تھے۔ ورنہ نواب احمد خاں بنگش کی سرکار یا روہیلوں کے دربار میں پناہ ڈھونڈھتے تھے۔

آنولہ فرخ آباد۔ بریلی۔ آنولہ۔ بسولی اور ٹانڈہ وغیرہ میں شعرا کا مجمع تھا۔ مصحفی بھی اپنی تعلیم ناتمام چھوڑ کر دلی سے جدا ہوئے اور سعد اللہ خاں مرحوم کے دارالسلطنت آنولہ میں اقامت اختیار کی۔ یہ پتہ نہیں چلتا کہ آنولہ میں ان کا مربی کون تھا اور کتنی مدت وہاں قیام رہا۔ میر مراد علی حیرت ساکن مراد آباد سے یہیں ملاقات ہوئی۔ ان کے اشعار پاکیزہ ہوتے تھے۔ فرماتے ہیں:۔

نظر آیا یہ جہاں نقش بر آب آخر کار ۔۔۔ تاج سر پہ سے گرا مثل حباب آخر کار

سادہ رویوں کی ولا مہر و وفا پر مت بھول ۔۔۔ منھ پہ دیویں گے تجھے صاف جواب آخر کار

مصحفی ہنوز آنولہ ہی میں تھے کہ حیرت کو ایک رئیس کی فرمایش سے پہاڑ کی طرف جانا پڑا اور اُسی سمت ان کی زندگی کا آفتاب غروب ہو گیا۔

عشقی مراد آبادی سے بھی یہیں ملاقات ہوئی اور ان کا ایک شعر مصحفی کو بڑھاپے تک یاد رہا:۔

کوئی تو ہے گل چہرہ کوئی سرو رواں ہے ۔۔۔ دیکھا تو یہاں ایک سے ایک آفت جاں ہے

عزیز خاں بیجان قوم افغان سے اکثر ملاقات کا اتفاق ہوتا تھا۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:۔

ایسے ناداں ہیں ہم تم کو نہ پہچانیں گے ۔۔۔ ہم سخن غیر سے ہوتے ہو جو آوازبدل

عظیم تخلص ایک سپاہی پیشہ جوان سے یہیں تعارف ہوا اور انھوں نے اپنی ایک غزل سنائی جس کے تین شعر مصحفی نے انتخاب کئے۔

شاہ حاتم دہلوی کے شاگرد قدیم نعیم اللہ خاں نعیم سے بھی سلسلۂ ارتباط یہیں شروع ہوا تھا مگر وہ چند روز کے بعد نواب محمد یار خاں کی سرکار میں نوکر ہو گئے (اس دربار کی تفصیل آگے آئے گی)، اکثر بیمار رہتے تھے اور جوانی میں بمرض استسقا انتقال کیا۔ کہتے ہیں:۔

آفت کی نشانی ہی رہے ہم تو زمیں پر ۔۔۔ جو سنگ بلا چرخ سے آیا سو ہمیں پر

مصحفی آنولہ ہی میں تھے کہ فدوی لاہوری کا وہاں گزر ہوا۔ یہ حضرت ایک بنئے کے بیٹے تھے۔ مکند رام نام تھا۔ مغلوں کے زیر اثر مسلمان ہو کر فدوی کے لقب سے شہرت حاصل کی۔ کچھ عرصہ تک نواب ضابطہ خاں (پسر نواب نجیب الدولہ) کے پاس "بارگیروں" میں نوکر رہے اور ان کی فرمایش سے یوسف زلیخائے جامی کا نظم میں ترجمہ کر کے ادب اُردو میں ایک مثنوی کا اضافہ کیا۔

قدرت اللہ خاں قاسم لکھتے ہیں کہ "وہ جاہل محض، گندہ ناتراش، بیہودہ اور یاوہ گو تھے" مرزا رفیع سودا کی ہجو لکھی تھی جس کا ایک مصرعہ ہنوز زبانزد ہے:- "بھڑوا ہے مسخرا ہے سودا اسے ہوا ہے" اور اسی کے جواب میں سودا نے "بوم و بقال" کی ہجو لکھ کر فدوی کی تشہیر کی۔

صاحب تذکرہ گلزار ابراہیم فرماتے ہیں کہ سودا سے مباحثہ کرنے فرخ آباد گئے تھے اور ذلیل ہوئے۔ غرض آنولہ تشریف لائے تو مصحفی بھی ان کی شورش سنکر ایک روز زیارت کے لئے گئے دیکھا کہ خانہ جنگیوں کی بدولت اکثر اعضا مجروح[1] تھے۔ چند اوباش ان کے گرد جمع تھے۔ شعر و سخن کی صحبت ہوئی مگر چند ہی روز کے بعد وہ آنولہ سے چلے گئے اور ٹانڈہ میں نواب محمد یار خاں کی ملازمت کی۔ وہاں بھی نہ بنی اور پچاس سال کی عمر میں بمقام مراد آباد انتقال کیا۔

نعیم اور فدوی سے ملاقاتیں آنولہ سے کوچ کا نقارہ تھیں۔ دو ہی[2] تین مہینہ کے بعد مصحفی بھی ٹانڈے کی طرف عازم ہوگئے

ٹانڈہ نواب علی محمد خاں روہیلے کے چھوٹے بیٹے محمد یار خاں نام امیر تخلص ٹانڈے میں (جو رامپور کے قریب ایک قصبہ ہے) مسند امارت بچھائے تھے۔ علم موسیقی اور ستار نوازی میں یگانۂ روزگار تھے۔ اہل علم کی سرپرستی کرتے تھے۔

سنبھل ضلع مراد آباد کے ایک شخص انصاری کبیر علی نام کبیر تخلص طبیب ریاست تھے۔ مزاج میں ظرافت تھی:-

ایک ہی یار سے جی ناک میں آیا ہے کبیر — زیست معلوم اگر ایسے ہی دو چار ملے

انھوں نے نواب کو اُردو شاعری کا شوق دلایا۔ مرزا رفیع سودا اور میر سوز کو طلبی کے خطوط لکھے گئے۔ یہ دونوں بزرگ اُسوقت فرخ آباد میں تھے اور وہاں نواب احمد خاں بنگش کے دیوان ریاست مہربان خاں رند کی سرکار میں بصیغۂ شاعری عز و امتیاز رکھتے تھے حاضر خدمت نہ ہوسکے البتہ سودا کے نامور شاگرد قیام الدین قایم چاند پوری بدایوں کے قریب بسولی میں موجود تھے حسب الطلب ٹانڈے پہونچے۔ سو روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی اور نواب کی اُستادی کا شرف ملا

تجھ کو قایم رکھے اللہ بہت سا اے امیر — مجتمع سایہ میں ہیں جس کے سخنداں اتنے

"چشمۂ شیریں" کے قریب شعرا کا جمگھٹا ہوا، فدوی لاہوری اور میر نعیم کی حاضری کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔ قایم کے شاگرد پروانہ علی شاہ مراد آبادی پروانہ تخلص بھی اُستاد کی معرفت سلسلۂ شعرا میں ملازم ہوئے، جوان شوریدہ سر قلندر وضع تھے۔ بھنگ و شراب سے ذوق تھا اور اسی کے ساتھ ساتھ خدا طلبی کا شوق۔ ریاضیات سے قلب کو صاف کرکے صاحب کشف بھی ہوگئے تھے۔ مولوی قدرت اللہ رامپوری بھی ٹانڈے میں وارد ہوئے انھوں نے "تذکرۂ ہندی گویان" کا مولف بنکر شہرت پائی۔ قایم کے کلام کی پختگی تبصرہ سے مستغنی ہے۔ ان کا ایک شعر ضرب المثل ہو گیا ہے:-

قسمت کو دیکھ ٹوٹی ہے جا کر کہاں کمند — کچھ دور اپنے ہاتھ سے جب بام رہ گیا

---

[1] زیادہ از مرتبہ شاعری قدم در راہ امرد پرستی می گذاشت چند جا خانہ جنگی ہم کردہ وبہ کودکان حسین تعشق۔ اکثر اعضایش دیدم کہ مجروح بودند" تذکرہ ہندی صفحہ ۱۶۶ و ۱۶۷۔ [2] تذکرہ ہندی صفحہ ۱۶۷۔ "بعد دو سہ ماہ فقیر ہم باریاب مجلس شد"

صاحب تذکرۂ آبِ حیات کی رائے ہے کہ "ان کا دیوان ہرگز میر و مرزا کے دیوان سے نیچے نہیں رکھ سکتے"[1] اور کریم الدین دہلوی لکھتے ہیں کہ "بعض بعض آدمی جو کہ اس کو سودا سے بہتر کہتے ہیں حق یہ ہے کہ سچے ہیں اور بعضے کم مایہ اور بے استعداد جو کہ اس کو برابر سودا کے گنتے ہیں خیال سودا اور دیوانگی کا کرتے ہیں" قائم کا ایک شعر راقم کی زبان پر مدتوں تک رہا اور دل نہیں مانتا کہ اس جگہ درج نہ کیا جائے:-

قائم آتا ہے مجھے رحم جوانی پہ ترے　　مر چکے ہیں اسی آزار میں بیمار بہت

قائم ٹانڈے میں تازہ وارد تھے کہ مصحفی بھی امیر کی جود و سخا کا شہرہ سن کر وہاں پہونچے۔ نواب کی شان میں قصیدہ لکھا، قائم کی سفارش سے دربار میں رسائی ہوئی اور سرکار میں ملازم ہو گئے۔ قائم اُسوقت لباس درویشی میں تھے اور تصوف کا رنگ غالب تھا۔

اُٹھ جائے گر یہ بیچ سے پردہ حجاب کا　　دریا ہی پھر تو نام ہے ہر اک حباب کا

چند ہی روز میں "بسبب سلیم مزاجی و نسبت تام شاعری رابطۂ شدید" ایسا بہم ہوا کہ اشعار نواب کے مسودے جو اصلاح کے لئے قائم کے پاس آتے وہ مصحفی کے سپرد کر دیتے تھے۔ تین مہینے بڑے لطف سے گزرے۔ نعیم اللہ خاں نعیم سے اکثر ملاقات ہوتی تھی قائم سے یکجائی تھی اور صبح و شام ایک ہی ساتھ کھانا تناول کرتے تھے۔ یکایک بادِ حوادث نے اس محفل کا چراغ گُل کیا۔ شاہ عالم بادشاہ دہلی نے مرہٹوں کی سازش سے شوال ۱۱۸۵ھ میں ضابطہ خاں (پسر نواب نجیب الدولہ) پر چڑھائی کی اور روہیلوں کو ایسی شکست دی کہ سارا علاقہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا اور ضابطہ خاں کے زن و فرزند تک اسیر ہو گئے۔ نواب محمد یار خاں کا کارخانہ درہم و برہم ہوا، شعرا و ندما کی مجلس بہشت آئین میں سنگ تفرقہ پڑا۔ ہر ایک نے جدا جدا راہ لی۔ مصحفی فرار ہو کر لکھنؤ پہونچے مگر ٹانڈے کی دلچسپ صحبتوں کی یاد مدتوں فراموش نہ ہوئی۔ بڑھاپے کے وقت لکھتے ہیں:-

"واللہ کہ یاد آں صحبت گزشتہ داغ ناکامی بر دل دردمندی گزارد"

لکھنؤ بارِ اول

مصحفی کے سیرت نگار کو اب قیاسات کی سرحد سے نکل کر حقایق میں قدم رکھنے کا موقع ہے۔ ضابطہ خاں کی شکست کتب تواریخ میں مندرج ہے اور مصحفی کی شہادت ہے کہ "فقیر در آں حادثہ جانگزا بہ لکھنؤ رسیدہ بود"۔ لہٰذا مصحفی کا لکھنؤ میں قدوم پہلی بار یقیناً ۱۱۸۵ھ میں ہوا۔ مرزا رفیع سودا بھی فرخ آباد سے لکھنؤ آ چکے تھے۔ مصحفی ان کی زیارت کے لئے حاضر خدمت ہوئے اور سودا کے جامع الکمالات ہونے کی شہادت دی لکھتے ہیں کہ:-

"وہ غزل میں صائب وقت اور قصیدے میں خاقانی تھے علم موسیقی سے آگاہ تھے۔ "سگان آبریشم پشم" کی پرورش کا شوق تھا۔ زبان ریختہ میں قصیدے لکھنے کے نقاش اول تھے، اب جو کوئی قصیدہ کہے وہ ان کا پیرو اور متبع ہے"

مصحفی جب دوبارہ لکھنؤ آئے تو مرزا رفیع سودا کے انتقال کو تین چار سال گزر چکے تھے۔ ایک دن ماہ محرم میں آغا باقر

[1] تذکرۂ ہندی۔ صفحہ ۱۷۹

کے امام باڑے میں اُن کے مرقد کی زیارت ہوئی۔ لوحِ مزار پر میر فخر الدین ماہر کی تاریخ کندہ تھی جس میں تعمیہ تھا "خلافِ قانون مورخان" سمجھ کر انھوں نے نئی تاریخ کہی جس کا آخری مصرعہ تھا "سودا کجا و آں سخن دلفریب او" اور اس مصرعہ سے بے کم و کاست ۱۱۹۵ھ برآمد ہوتے ہیں جو سودا کا سال وفات تھا

۱۱۸۵ھ تک نواب شجاع الدولہ زندہ تھے۔ دارالسلطنت فیض آباد تھا۔ لکھنؤ کی وہ حالت تھی جس کا نقشہ میر حسن نے مثنوی گلزار ارم میں کھینچا ہے :-

ہر اک گھر خس کا سا دل یہاں ہے ۔ فراغت سے یہاں کس کا مکاں ہے

اہل کمال کی قدر دانی نہ تھی سال بھر تک ٹھوکریں کھاتے رہے۔ روزگار کی کوئی صورت نہ نکلی تو دوبارہ دہلی کا رخ کیا "بہ شاہجہاں آباد رفتہ رخت اقامت دراں دیار مینو نشان انداخت" یہ واقعہ ۱۱۸۶ھ کا ہے۔

دہلی میں اقامت

انجمن ترقی اُردو کے روحِ رواں مولوی عبدالحق صاحب نے تذکرۂ شعرا مولفۂ غلام ہمدانی مصحفی کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ "مصحفی لکھنؤ میں سال ہی بھر رہنے پائے تھے کہ طبیعت اچاٹ ہوئی اور پھر دلّی کا رُخ کیا لیکن دلّی میں کیا رکھا تھا، حالت پہلے سے بھی بدتر تھی آخر تھوڑے دنوں کے بعد ہی دوبارہ لکھنؤ پہونچے۔" آخری الفاظ ترمیم طلب ہیں۔ مصحفی[۱] "تھوڑے دنوں کے بعد" لکھنؤ نہیں آئے بلکہ بارہ چودہ برس تک دلّی میں سکونت پذیر رہے مصحفی خود تحریر فرماتے ہیں کہ "میں دور نواب نجف خاں مرحوم میں بارہ سال تک شاہجہاں آباد میں گوشۂ عزلت میں رہا اور اس مصائب و تفکرات کے زمانے میں تلاشِ معاش کے لئے کسی کے دروازہ پر نہیں گیا" امیر الامرا نواب نجف خاں کا دور ضابطہ خاں کی معزولی کے بعد ۱۱۸۵ھ سے شروع ہوا، ذو الفقار الدولہ[۲] خطاب عنایت ہوا۔ شاہ شطرنج سے سیاہ سفید کے اختیارات لیکر مرتے دم تک اپنے عہدے پر بحال رہے اور ۱۱۹۶ھ میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ اس دوازدہ سالہ مدت کے اختتام تک مصحفی کا دہلی میں قیام مندرجۂ بالا اقتباس سے ثابت ہے۔ اور اس کے بعد بھی دو سال مزید دارالسلطنت میں مقیم رہنے کی شہادت[۳] مصحفی کے تذکرۂ شعراء فارسی مسمّٰی بہ "عقد ثریا" میں موجود ہے۔ محمد حیات بیتاب کے احوال میں لکھا ہے کہ "میں غلام علی خاں ولد بھکاری خاں کے ہمراہ سنہ ایک ہزار ایک سو اٹھانوے (۱۱۹۸) ہجری میں صعوبت سفر اُٹھا کر شاہجہاں آباد سے لکھنؤ آیا"۔ اس سفر کی تفصیل آئندہ بیان ہوگی فی الحال اسقدر کافی ہے کہ مصحفی کا قیام ۱۱۹۸ھ تک یقیناً دلّی میں رہا۔ اور وہ ۱۱۸۶ھ میں وہاں پہونچے تھے۔ دارالسلطنت میں معاش کے لئے تجارت کا سلسلہ شروع کیا اور اُسی کے ساتھ بزرگوں کے فیض صحبت سے نظم و نثر فارسی کی تکمیل کی

بزرگانِ دہلی

فارسی کے ایک بدیع العصر فاضل انجب تخلص جنھوں نے ۳۰ سال اصفہان میں کسب علوم کیا تھا، اور شیخ علی حزیں کے ماموں تھے اسوقت دلّی میں جلوہ افروز تھے۔ مولانا نظامی گنجوی کی تقلید میں

---

۱ تذکرہ ہندی۔ صفحہ ۲۴۸ — ۲ ۲۶ اپریل ۱۷۸۲ء تاریخ انتقال نجف خاں کی ہے — ۳ عقد ثریا۔ صفحہ ۱۴۱

خمسہ لکھا تھا۔ نظیری نیشاپوری کے جواب میں ایک دیوان سات روز میں تیار کیا تھا۔ دوسرا دیوان ساٹھ ہزار اشعار کا موجود تھا۔ مہابھارت کے اٹھارہ پرب کا فارسی نظم میں ترجمہ کیا۔ اور ان کی تصنیفات کا انبار ایک بار شتر سے زیادہ ہو گیا تھا۔ سو برس سے زیادہ کی عمر تھی۔ مصحفی مشتاقِ ملاقات ہو کر ایک روز خدمت میں حاضر ہوئے۔ دیکھا کہ وہ "مردِ نحیف آفتابِ لبِ بام" تھے شعر و شاعری پر گفتگو ہوئی۔ حسب الحکم اپنی تازہ غزل سنائی۔ لبِ مبارک سے آفریں کی صدا آئی اور حکم ہوا کہ کبھی کبھی آیا کرو۔ دوبارہ ایک مہینے کے بعد حاضر ہوئے ان کے دیوان کا مطالعہ کیا اور اپنے اشعار سنائے۔ اس کے چند ماہ بعد انکا انتقال ہوگیا

ذوقی رام حسرت دہلوی جنھوں نے محاوراتِ فارسی پر وہ عبور حاصل کیا کہ مرزایانِ ایران ان کی زبان کا لوہا مانتے تھے۔ تتبعِ بابا فغانی، طرز شناسِ وحشی کاشانی اور نظیریِ عصر کے القاب سے سخن سنجوں کی محفل میں یاد کئے جاتے تھے۔ ایک دیوانِ ضخیم تصنیف کیا۔ جس میں متاخرین کے انداز سے متقدمین کے عشق خیز اور شور انگیز جذبات نظم کئے تھے اُسوقت دہلی کو رشکِ اصفہان بنائے تھے۔ مصحفی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور رابطۂ آشنائی مدتوں قایم رہا

شاہ نیاز بریلوی کے مرشد مولانا فخر الدین سلسلۂ چشتیہ کے عَلم بردار صاحبِ وجد و سماع تھے مصحفی کو خدمتِ اقدس میں نیاز حاصل تھا اور حسنِ عقیدت سے ان کی مجالس میں حاضر ہوتے تھے۔ وہ شاعر نہ تھے مگر موزونیِ طبع سے کبھی کبھی شعر کہتے تھے۔ ان کی ایک بیت تذکرۂ فارسی گویان میں تبرکاً درج ہے:۔

بادلم نرگسِ شہلائے تو غوغا دارد
جنگِ دیوانہ و مست است تماشا دارد

غالباً انھیں بزرگوں کے فیضِ صحبت سے فارسی کی تکمیل ہوئی۔ دلّی لُٹ چکی تھی سلطنت کا صرف نام باقی تھا۔ فارسی کا ذوق و شوق جاں بلب تھا۔ مگر نظمِ اُردو کے اساطین دلّی میں رونق افروز تھے۔ خدائے سخن میر تقی میر" باوجود عیالداری کے توکل اختیار کئے ہوئے" شہر کے ایک گوشہ میں عُزلت نشین تھے۔ ابنائے زمانہ سے کسی کو مخاطبِ صحیح نہ سمجھ کر ہر کس و ناکس سے گفتگو نہ کرتے تھے لیکن مصحفی کے حال پر بہت[۱] مہربانی فرماتے تھے۔

آزاد کی روایت ہے کہ ایک مشاعرے میں میر تقی بھی موجود تھے۔ مصحفی نے غزل پڑھی:۔

تنہا نہ وہ ہاتھوں کی حنا لے گئی دل کو
مکھڑے کے چھپانے کی ادا لے گئی دل کو

جب یہ شعر پڑھا:۔

یاں لعلِ فسوں ساز نے باتوں میں لگایا
دے پیچ اُدھر زلف اُڑا لے گئی دل کو

تو میر صاحب نے فرمایا کہ "بھئی اس شعر کو ذرا پھر پڑھنا" ان کا اتنا کہنا ہزار تعریفوں کے برابر تھا، شیخ اسی قدر الفاظ کو اپنے کمال کی سند سمجھے۔ کئی دفعہ اُٹھ اُٹھ کر سلام کئے اور کہا کہ میں اس شعر پر اپنے دیوان میں ضرور لکھوں گا کہ حضرت نے دوبارہ پڑھوایا تھا۔

[۱] تذکرۂ ہندی ۔ صفحہ ۲۰۴

مرزا رفیع سودا کے اُستاد شاہ حاتم جن کو دلی کی رونق کے وقت امیرزادہائے والا تبار اور روسائے ذوالاقتدار مسند پر جگہ دیتے تھے اب زمانہ کی ہوا بدلی دیکھکر متوکلی اور خانہ نشینی اختیار کر چکے تھے۔ پچھتر[1] سال سے زیادہ کی عمر ہو چکی تھی مگر مشاعروں میں قدم رنجہ فرماتے تھے۔ شیخ نے مشاعرے کا سلسلہ اپنی قیام گاہ پر شروع کیا تو اکثر بعد مغرب اس بزم کو بھی سرفراز کرتے تھے۔

مرزا جانجاناں مظہر کمال عزت و وقار سے مسند درویشی پر جلوہ افروز تھے۔ بے نیازی سے گزارتے، لیکن بادشاہ سے گدا تک انکی آستاں بوسی کو موجب افتخار جانتے تھے۔ سید انشا دریائے لطافت میں لکھتے ہیں کہ "جب راقم والد مرحوم کے ساتھ دارالخلافت میں وارد ہوا تو جناب فیض مآب مرزا جانجاناں مظہر علیہ الرحمہ کا آوازۂ فصاحت و بلاغت سنکر ان کی زیارت کا مشتاق ہوا۔ چار و ناچار خدا کو ترشوا۔ ڈھاکے کی ململ کا جامہ پہن، دستار سرخ سر پر باندھ کٹار لگا کر بہ سواری فیل خدمت سراپا افادت کے لئے روانہ ہوا۔ مرزا صاحب جامع مسجد کے قریب بالائے بام رونق افروز تھے۔ ٹوپی اور پیراہن سفید رنگ در بر، دوپٹہ ناسپاتی رنگ بصورت سموسہ بر دوش میں نے کمال ادب سے سلام کیا۔ فرط عنایت اور کثرت مکارم اخلاق سے سلام کا جواب دیا اور اس بے لیاقت کا سر بغل میں لیکر اپنے پہلو میں جگہ دی"۔

جب مصحفی نے دارالخلافت کی اقامت اختیار کی تو وہ بھی اکثر خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ ایک دن ان سے مرزا صاحب نے بیان فرمایا کہ اُن کے والد کا نام مرزا جان تھا۔ اورنگ زیب کے اواخر عہد میں مظہر کی ولادت ہوئی اور یہ خبر بندگان اقدس تک پہونچی تو ارشاد ہوا کہ اس کا نام جان جان رکھنا چاہئے۔ مرزا صاحب کی شہادت[2] تک مصحفی دلی میں موجود تھے اور ایک دردناک تاریخ وفات فارسی میں نظم کی تھی۔ اُردو شاعری کو تصوف کی چاشنی سے آشنا بنانے والے خواجہ میر درد سجادۂ درویشی کو زینت دیتے تھے تمام عمر شاہجہاں آباد سے قدم باہر نہیں نکالا۔ علم و فضل میں یگانۂ روزگار، موسیقی میں مہارت رکھتے تھے

---

[1] شاہ حاتم کا نام ظہور الدین تھا۔ ان کی تاریخ تولد لفظ "ظہور" سے نکلتی ہے یعنی ان کا سالِ ولادت ۱۱۱۱ھ تھا۔ مصحفی نے جب تذکرۂ فارسی گویان مسمی بہ "عقد ثریا" کی ترتیب شروع کی تو ان کی عمر ۸۳ سال کی تھی۔ تذکرے میں درج ہے کہ "ہشتاد و سہ سال عمر دارد" اس سے ثابت ہوا کہ "تذکرۂ عقد ثریا" کا آغاز ۱۱۹۴ھ سے ہوا تھا۔ اسی تذکرے میں بعد کو اضافہ کیا گیا کہ "ماہ مبارک رمضان ۱۱۹۷ھ میں رحلت کی۔ اور فقیر نے رحلت کی تاریخ کہی" یہ تاریخ فارسی میں ہے اور اس کا آخری مصرعہ ہے کہ۔ "آہ صد حیف شاہ حاتم مُرد" اس مصرعہ سے بھی ۱۱۹۷ نکلتے ہیں۔ آزاد نے لکھا ہے کہ "۹۶ برس کی عمر میں ۱۲۰۷ھ میں فوت ہوئے مگر مصحفی نے تذکرۂ فارسی میں لکھا ہے کہ ۱۱۹۷ھ میں فوت ہوئے اور ۸۶ برس کی عمر پائی" معلوم نہیں کہ آزاد کے پاس ۱۲۰۷ھ میں انتقال ہونے کی کیا سند تھی۔ مصحفی نے تذکرۂ فارسی میں جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ اوپر درج کیا گیا اس میں یہ نہیں لکھا ہے کہ حاتم نے ۹۶ سال کی عمر میں وفات پائی بلکہ تذکرۂ ہندی گویان میں جس کی ترتیب لکھنؤ جا کر ۱۲۰۹ھ میں شروع ہوئی تحریر ہے:۔ "عمرش قریب بہ صد رسیدہ بود۔ سہ سال است کہ در شاہجہاں آباد ودیعت حیات سپردہ خدایش بیامرزاد۔ در تذکرۂ فارسی احوال او مع تاریخ رحلت صورت تحریر یافتہ"۔

[2] تاریخ ضربت ۷ محرم اور تاریخ وفات ۱۰ محرم ۱۱۹۵ھ ہے۔

اور اس وسیلہ سے اکثر اُستادانِ فن حاضر مجلس ہوتے۔ ہر مہینے کی دوسری تاریخ کو ان کے والد شاہ محمد ناصر مصنف نالۂ عندلیب کے مزار پر محفل سماع ہوتی تھی اور مغنیانِ چابکدست قانون نوازی اور نغمہ پردازی کی داد دیتے تھے۔ مصحفی جب تک شاہجہان آباد میں رہے مہینہ دوسرے مہینہ خدمت اقدس میں بے غرضانہ جاتے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی میر محمد اثر سے بھی ملاقات تھی جو بعد کو برادر بزرگ کی وفات[1] کے بعد سجادہ نشین ہوئے اور اپنی طرز جدید کی مثنوی خواب و خیال کی بدولت سخنورانِ دہلی کی تاریخ میں حیاتِ جاوید پائی۔

احباب ان اساطین سخن کے ماسوا بیسیوں لعل بے بہا اور گوہر یکتا دلی میں جگمگا رہے تھے۔ جن میں سے میر محمدی بیدار، بقا اللہ خاں بقا، مرزا جان طپش، محمد عارف عارف، ثناء اللہ خاں فراق، میر محمد جواد ہادی اور میاں حاجی تجلی سے مصحفی کا سلسلہ آشنائی تھا۔ بیدار مولانا فخر الدین دہلوی کے مرید تھے اور اپنے مرشد کی زیارت کے لئے غازی الدین خاں کے مدرسہ میں آیا کرتے تھے۔ مصحفی سے بھی ملاقات ہوتی تھی اور "صحبتِ شعر بہ میاں می آمد" رعایت لفظی کے ناپسندیدہ رنگ کو ترک کر کے اپنے کلام میں تصوف کی چاشنی ملائی تھی

بیدار راہِ عشق کسی سے نہ طے ہوئی — صحرا میں قیس کوہ میں فرہاد رہ گیا

نہ بتکدے سے کام نہ مطلب حرم سے تھا — محوِ خیالِ یار رہے ہم جہاں رہے

بقا، حافظ لطف اللہ خوشنویس کے بیٹے شاہ حاتم اور میر درد کے شاگرد تھے۔ مصحفی سے رشتۂ آشنائی مربوط تھا۔ عرصہ تک دونوں یکجا رہے اور صبح و شام ایک ساتھ کھاتے پیتے تھے، سراپا خلق اور ظریف مزاج تھے۔ طبیعت ہجو کی طرف مایل تھی۔ میر اور سودا کو خاطر میں نہ لاتے تھے

کھول دیوان دونوں صاحب کے — اے بقا ہم نے جب زیارت کی

کچھ نہ پایا سوائے اس کے سخن — ایک تو تو کہے ہے اک ہی ہی

میر تقی سے چشمک کا قصہ مشہور ہے۔ بقا کا شعر تھا:۔

ان آنکھوں کا نت گریہ دستور ہے — دو آبہ جہاں میں یہ مشہور ہے

میر صاحب نے کہا:۔

وہ دن گئے کہ آنکھیں دریا سی بہتیاں تھیں — سوکھا پڑا ہے اب تو مدت سے یہ دو آبہ

بقا بگڑ کر کوسنے لگے:۔

---

[1] تاریخ وفات دردِ دلم ۱۴ صفر ۱۱۹۹ھ ہے۔ اُسوقت مصحفی لکھنؤ میں تھے۔ بڑھاپے کے وقت درد و اثر کو یاد کرتے ہیں:۔

مصحفی دلّی کو لکھ بھیجی تھی میں نے یہ غزل — پر بتا سنکر اسے درد و اثر نے کیا کہا

میر نے گر ترا مضمون دو آبہ کا لیا　　اے بقا تو بھی دعا دے جو دعا دینی ہو
یا خدا میر کی آنکھوں کو دو آبہ کر دے　　اور بینی کا یہ عالم ہو کہ تربینی[1] ہو،

مصحفی سے دوستی کا تعلق زندگی بھر قائم رہا۔ بلکہ اسی رشتہ سے بقا کے نامور شاگرد شیخ ظہور اللہ نوا بدایونی جنکو مرزا جہاندار شاہ پسر شاہ عالم کی سرکار سے "خوش فکر خاں" کا خطاب عنایت ہوا تھا شیخ کو "چچا" کہتے تھے۔ نوا کا ایک قطعہ نواح لکھنؤ میں ابھی تک زبانزد ہے:-

نوا قاصد کو واں بھیجا تھا مَیں نے اس توقع پر　　کہ دیکھیں گے جواب نامہ لاتے شام قاصد کو
سو گزری شام اب شب ہی یقیں یہ دلکو آتا ہے　　کہ گزرینگے بہت سے اب یونہیں ایام قاصد کو
خط آنا اک طرف اب چاہئے پیغامبر ثانی　　کہ جا کر دے مری جانب سے وہ پیغام قاصد کو
ارے تو خط کو آیا تھا دیا صورت پرستی کو　　چل اپنے کام لگ اس کام سے کیا کام قاصد کو

طپش تخلص محمد اسماعیل نام۔ عرف مرزا جان سے برسوں رابطۂ آشنائی رہا۔ خواجہ میر درد کے شاگرد تھے۔ کلام شستہ و پاکیزہ ہوتا تھا۔ بنگالہ جا کر بہت شہرت پائی "مثنوی بہار دانش" کے مصنف تھے

کہا جو دل سے چل تجھکو تماشہ اک دکھلاؤں　　تہ کاکل عرق آلودہ وہ گردن جھلکتی ہے
لگا کہنے طپش میں گھر سے باہر کس طرح نکلوں　　اندھیری رات ہے برسات ہے بجلی چمکتی ہے

عارف کشمیری رفوگر تھے۔ مصحفی ان کی دوکان پر جاتے تو بہت "دل گرمی" سے پیش آتے تھے۔ حکیم ثناء اللہ خاں فراق خواجہ میر درد کے شاگرد تھے۔ شعر و سخن سے خدا داد مناسبت تھی۔ مصحفی جب تک شاہجہاں آباد میں رہے ان سے رابطۂ دوستی روز بروز ترقی کرتا رہا۔ وہ علم طب کی تحصیل کر کے دلّی کے مشہور حکیموں میں شمار ہوئے۔ ان کا ایک لاجواب شعر راقم کو بچپن سے یاد ہے:-

آنا یہ ہچکیوں کا مجھے بے سبب نہیں　　بھولے سے اسنے یاد کیا ہو عجب نہیں

ہادی: سید صحیح النسب تھے۔ ایک مدت تک نواب عماد الملک کے رفیق رہے اس کے بعد توکل پر گزر کرنے لگے۔ مصحفی جب تک شاہجہاں آباد میں رہے ہادی برابر ان کے مکان پر تشریف لایا کئے۔ ایک شعر ان کا بھی سنئے:-

طور دین اس بت کے ہاتھوں ہائے ابتر ہو گیا　　جس مسلماں نے اُسے دیکھا سو کافر ہو گیا

میاں حاجی تجلی ولد میر محمد حسین حکیم۔ میر تقی میر کے ہمشیر زادے فن ریختہ میں بے نظیر تھے۔ دیوان ضخیم ترتیب دیا ان کی مثنوی لیلیٰ مجنوں (بقول کریم الدین دہلوی کے) پسند خواص نہوئی مگر عوام میں مقبول تھی اور اس کا مطبوعہ نسخہ

---

[1] ایک اور شاعر کہتے ہیں۔　　تین تربینی اور دو آنکھیں مری　　اب الہ آباد بھی پنجاب ہے
دوسرا جواب دیتا ہے:-　　آب باراں آب گنگ آب جمن آب دو چشم　　کانپور اس برشگالِ ہجر میں پنجاب ہے

ہنوز کتب خانوں میں محفوظ ہے :-

عشق میں کرتے ہیں بدنام تجلی کو عبث
وہ بچارا کبھی اس کوچہ میں آیا نہ گیا

عنایت اللہ حجام

حجام تخلص - عنایت اللہ نام - سہارنپور کے رہنے والے مدت مدید سے شاہجہاں آباد میں موتراشی کرتے تھے - وہ نہ بازاروں میں پھرتے نہ دوکان پر بیٹھتے بلکہ خانہ نشین رہتے تھے - مدرسہ غازی الدین خاں کے قریب سکونت تھی - مولانا فخر الدین کے مرید تھے اور ان کے خطِ مبارک کی اصلاح کے لئے منگل اور جمعہ کو خدمت کیمیا خاصیت میں حاضر ہوتے تھے - نوجوانی سے لباس مشائخ پہنتے - تاج فقیرانہ سر پر رکھتے وجد و حال میں شریک ہوتے تھے اور اپنے محلہ میں "شاہ جی" کے خطاب سے مشہور تھے - طبیعت موزوں تھی اس لئے باوجود کم علمی کے شعر خوب کہتے تھے - اور بال سے زیادہ باریک مضامین نظم کرتے تھے

ہر دم نظر آتے ہیں نئے یار تمہارے
ہم جی چکے گر ہیں یہی اطوار تمہارے

اس شوخ کے کوچے میں نہ جایا کرو حجام
چھن جائیں نہ اک دن کہیں ہتھیار تمہارے

حجام پڑا سخت حیاناک کے پالے
کچھ اور تو کیا بات کہ وہ منہ سے نکالے

لگ چلتا ہوں اُس شوخ سے رستے میں تو مجھکو
جھنجھلا کے یہ کہتا ہے کہ چل دور رزالے

۱۱۸۷ھ میں وہ نو عمر تھے - مصحفی نے ایک مثنوی لکھی جسکے حسب ذیل اشعار میر حسن نے اپنے تذکرے میں نقل کئے ہیں :-

زبس آئینہ رو ہے طفل حجام
نہیں بن دیکھے اس کے دل کو آرام

جو دیکھے وہ اُنگلیاں گوری گوری
پئے خورشید پائی کی کٹوری

وہ جس کے روبرو ناگاہ آیا
اُسے حیرت نے آئینہ دکھایا

ملا جب آئینہ کو ایسا نائی
بنائی چار ابرو کی صفائی

نہ کھینچے خامہ مو اس کی تمثال
کہ وہ ہے عاشقوں کی ناک کا بال

سنے ہے مصحفی اب تو بھی فی الحال
منڈا کر سر کو ہو جا فارغ البال،

آغاز شہرت

مصحفی نے دربار شاہی سے کوئی تعلق پیدا نہیں کیا - امرا اور رؤسا کی آستانہ بوسی نہیں کی - دلی کے کوچہ چیلان[1] میں سکونت تھی اور گوشہ عافیت میں زندگی بسر کرتے تھے - لیکن حسن کلام کی شہرت دلی سے فیض آباد تک پہونچی اور میر حسن نے اپنے تذکرہ شعرا میں جو ۱۱۹۰ھ یا ۱۱۹۱ھ میں مرتب ہوا

---

[1] مرزا نعیم بیگ جوان کے احوال میں لکھا ہے کہ ان کی اقامت "کوچہ چیلہ ہا" میں تھی اور بہ سبب "ہم محلگی" کے ان سے کبھی کبھی ملاقات ہوتی تھی - اس سے معلوم ہوا کہ مصحفی کا مکان بھی کوچہ چیلان میں تھا - تذکرہ ہندی صفحہ ۶۶

مصحفی[1] کو "بہارستان باغ سخندانی وچمنستان گلزار معانی" کے رنگین القاب سے یاد کیا اور لکھا کہ وہ دلی[1] میں تجارت سے بسر اوقات کرتے ہیں۔ قصیدہ۔ غزل۔ مثنوی سب خوب کہتے ہیں۔ کلام بیشتر شاعرانہ ہوتا ہے اور تخلص سے مرد صالح معلوم ہوتے ہیں" انھوں نے مصحفی کے ۱۴ اشعار نقل کئے ہیں۔ مندرجۂ ذیل اشعار ابتدائے کلام کا رنگ دکھانے کے لئے انتخاب کئے جاتے ہیں:-

گل کترے نہ بلبل مری فریاد کے آگے
سرسبز ہو شاگرد کب اُستاد کے آگے

ایک دن روکے نکالی تھی ہیں وال کلفتِ دل
اب تلک دامنِ صحرا ہے غبار آلودہ

تلخ ہو بولنے میں اس کے مزا ہے کچھ اور
چھیڑ کر گالیاں کھانے میں مزا ہے کچھ اور

مار ڈالا ہے مجھے زلف کی دکھلا کے لٹیں
بیوفا تسپہ بھی کہتا ہے جفا ہے کچھ اور

جہاں کا گل بنے وہ شوخ یارب
مجھے تو اس چمن کا خار وخس کر

اغیار کی محفل میں جو تم جاتے ہو شب کو
آرہتی ہے اس بات کی ہم تک بھی خبر روز

اے مصحفی اس کوچہ میں دل بسکہ لگا ہے
جاتے نہیں اور کرتے ہیں ہم عزمِ سفر روز

پہلا شاگرد موزون طبعانِ شاہجہاں آباد میں سے جس نو آموز کو سب سے پہلے مصحفی کے حلقۂ شاگردی میں داخل ہونے کی عزت نصیب ہوئی وہ میاں عسکری نام نالاں تخلص قوم مغل سے تھے۔ میر حسن نے ان کو "تازہ گویان آں دیار" کے لقب سے یاد کیا ہے اور شاہ حاتم کا شاگرد لکھا ہے۔ لیکن یہ غلط ہے۔ وہ مصحفی کے شاگرد تھے اور ان کی خدمت میں نیاز مندی کلی اور اعتقاد رکھتے تھے

مشاعرے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد مصحفی نے اپنی قیامگاہ پر مشاعروں کا سلسلہ شروع کیا جن میں شاہ حاتم بھی گاہ گاہ شرکت فرماتے تھے۔ میرامانی اسد۔ مرزا کچھو اکبر۔ غلام اشرف افسر۔ رحیم اللہ جوش۔ محمد پناہ خاں حکیم حکیم ثناء اللہ خاں فراق۔ مست شاگرد اسد۔ میاں عسکری نالاں۔ مرزا محمد ہاتف ہاتف۔ قدرت اللہ خاں قاسم۔ لالہ بالمکند حضور۔ محمد امان نثار۔ میر جیون زار کشمیری اور عاقل شاہ عاقل وغیرہ وغیرہ شریک ہوتے تھے۔ ان میں سے اکبر۔ افسر۔ جوش اور نالاں اپنے کلام پر اصلاح بھی لیتے تھے۔ مست اپنے اُستاد اسد کے ساتھ مشاعروں میں حاضر ہوتے تھے مصحفی نے اس زمانہ میں ایک غزل کہی تھی جس کا مصرع تھا: "کبھی ملا تو کرے بارے مہرباں ہم سے"۔ مست نے تضمین کی۔

مشاعرے میں چل اے مست مصحفی جو کہے
کبھی ملا تو کرے بارے مہرباں ہم سے

---

[1] بہارستان باغ سخندانی وچمنستان گلزار معانی شیخ ہمدانی المتخلص بہ مصحفی طبع روانش جدول کتاب فصاحت وفکر بیانش مسطر بیاض بلاغت رنگینی نظمش سرخی باب گلستان و پیچیدگی الفاظش چون سنبل بوستان از نجبائے امروہہ مولدش اکبر پور کہ قصبہ ایست وطن بزرگانش از قدیم متصل دہلی الحال در شاہجہاں آباد بہ پیشۂ تجارت بسر می برد از دیوان او دو سہ جزو بہ نظر در آمدہ۔ قصیدہ و غزل و مثنوی ہمہ خوب۔ کلامش بیشتر شاعرانہ از تخلص او معلوم می شود کہ مردے صالح است۔ (تذکرۂ شعرائے اُردو مولفۂ میر حسن صفحہ ۱۹۰)

محمد پناہ حکیم سید صحیح النسب تھے۔ خطاب خانی اور منصب ہزاری سے سرفراز خواجہ میر درد کے شاگرد تھے۔ کہتے ہیں:-

پوچھتے کیا ہو حکیمِ جگر افگار کا گھر — ایک تکیہ سا ہے اس شوخ کی دیوار کے پاس

محمد امان نثار معماری کے فن میں اُستاد تھے۔ لکھنؤ جاکر راجہ ٹکیت رائے کی سرکار میں رسوخ حاصل کیا۔ دلی میں مصحفی کے دوست تھے اور شاہ حاتم کے شاگرد۔ کہتے ہیں:-

صورت موافقت کی کوئی سوجھتی نہیں — صاحب کی وضع اور مرا طور اور ہے

قدرت اللہ قاسم اور ثناء اللہ خاں فراق سے روشناسی پہلے ہو چکی ہے۔ مرزا ہاتف کا ایک شعر اظہارِ کمال کے لئے کافی ہے

خط آنے پہ یہ حسن نہ یہ مان رہے گا — ایسے میں اگر ملئے تو احسان رہے گا

لالہ بالمکند حضور کہنہ مشق شاعر۔ خواجہ میر درد کے شاگرد تھے۔ مصحفی کے یہاں مشاعرے میں ضرور حاضر ہوتے تھے۔ ایکبار لطف علی خاں ناطق کے مکان پر مشاعرہ تھا اور میر تقی کا ایک مصرعہ طرح کے لئے دیا گیا تھا۔ ردیف اُدر بمعنی "طرف" تھی۔ فصحاءِ وقت نے اس لفظ کو خلاف اُردو سمجھ کر اعتراض کیا مگر حضور نے ایسی خوبصورتی سے نباہا کہ کسی کو حرف رکھنے کی گنجائش نہ ہوئی۔

رکھتا ہوں میر صاحب وقبلہ سے میں سند — یہ جانتا نہیں کہ زباں ہے کہاں کی "اُدر"

امین الدین خاں امین کے والد عہد نواب نجیب الدولہ میں قاضی تھے۔ وہ مصحفی کے ہمسایہ میں رہتے اور صحبتِ مشاعرہ میں شریک ہوتے تھے۔ موزوں طبع تھے کہتے ہیں:-

کون آتا ہے یہ کس کے پاؤں کی آواز ہے — ہر صدائے پا میں جس کے سو طرح کا ناز ہے

قتیل شاعروں کا سلسلہ جاری تھا کہ بساطِ سخن پر ایک نیا مہرہ آیا اور بیت بازی کا رنگ بدل گیا مرزا نجف خاں امیر الامرا کا لشکر ضابطہ خاں کے قلعہ غوث گڑھ کو زیر و زبر کرکے دلی پہونچا اور اس کے ساتھ مرزا قتیل شاہجہاں آباد آئے۔ دیوالی سنگھ نام۔ درگاہی مل کے بیٹے قوم کے کھتری تھے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں مرزا محمد باقر شہید اصفہانی کی تعلیم سے مسلمان ہوئے۔ بجائے دیوالی سنگھ کے مرزا محمد حسن نام ہوا۔ اُستاد شہید تھے۔ شاگرد کا تخلص قتیل ٹھہیرایا۔ عہد طفلی سے موزوں طبع تھے اور شعر فارسی درست وشستہ کہتے تھے۔ قوت حافظہ لاجواب تھی۔ تاریخ سلف برزبان، عروض و قافیہ الہیات وریاضیات میں برق۔ زبان فارسی پر اس درجہ عبور کامل کہ مدتوں ان کے رقعات شمالی ہند کے درس میں داخل رہے استغنا بدرجہ کمال تھا۔ بے سروپا خانہ بدوش پھرتے تھے۔ کچھ عرصہ تک اراکین ریاست فیض آباد کی سرکار سے پرورش ہوئی اس کے بعد آوارہ ہوکر شاہجہاں آباد پہونچے۔ مصحفی کبھی کبھی فارسی غزلیں بھی کہتے تھے اور ایک مختصر دیوان تیار تھا۔ کسی زباندان سے ملاقات ہوتی تو دیوان فارسی صندوقچہ سے نکالکر اپنے اشعار سناتے تھے۔ قتیل کا کلام سنا۔ اپنی فارسی غزلیں سنائیں

۱۔ قتیل دریائے لطافت کی ترتیب میں بھی شریک تھے۔ انشاء لکھتے ہیں کہ:- "رد کردۂ او بے تامل رد کردۂ من و پسندیدۂ او پسندیدۂ این کمترین بیان بودہ است داد صغر کہن میانہ من و او در ہر چیز حصہ برادرانہ قرار پذیرفتہ" (دیباچہ دریائے لطافت)

باہم محبت ہوئی اور رابطۂ دوستی ایسا قایم ہوا کہ پہلی ملاقات سے اخیر وقت تک خلوص و اتحاد میں فرق نہ آیا

بطرزِ کلیم اور قدسی — جان و دل سے یہ یار ہیں دونوں
کوئی سمجھے تو مصحفی و قتیل — شعر میں یادگار ہیں دونوں

مرنے کے بعد بھی حسرت سے یاد کرتے ہیں :-

مصحفی کس زندگانی پر بھلا میں شاد ہوں — یاد ہے مرگِ قتیل و مُردنِ انشا مجھے

قتیل کے اثر سے مشاعروں میں اُردو غزلوں کے علاوہ فارسی اشعار بھی پڑھے جانے لگے۔ فارسی کی طرحیں دیجاتی تھیں اور مصحفی و قتیل ایک دوسرے سے گوئی سبقت لیجانے کی کوشش کرتے تھے

تذکرۂ شعرا رفارسی گویان

مرزا قتیل نے سیر و سیاحت کی تھی۔ ہر قسم کی محفلوں اور مجلسوں میں شریک ہوئے تھے۔ معاصرین کے احوال و اشعار جستہ جستہ لوحِ خاطر پر منقوش تھے۔ ایک دن مصحفی کو تذکرۂ شعرا رفارسی گویان کی تحریر کا شوق دلایا بعض معاصرین کے نام بتائے اور ان کے احوال کا مسودہ مصحفی کے قلم سے لکھوایا۔ چند ماہ کے بعد قتیل لکھنؤ چلے گئے لیکن مصحفی کو تذکرہ نویسی کا چسکا پڑ گیا۔ مشاعرے ملتوی ہوئے اور فرصت کا بیشتر وقت تلاش اشعار و احوال سخن سنجاں میں صرف ہونے لگا۔ اس تذکرے کی ترتیب ۱۱۹۴ھ یا ۱۱۹۵ھ میں ہو گئی تھی۔ لیکن ۱۱۹۹ھ[1] میں "عقدِ ثریا" نام پاکر باقاعدہ اختتام ہوا۔

فارسی اور اُردو دواوین

اب تک فارسی کے دو دیوان تیار ہو چکے تھے۔ پہلا دیوان[2] جس کی زبان بطور جلال اسیر اور ناصر علی کے تھی چوری گیا۔ دوسرا دیوان نظیری نیشاپوری کے جواب میں تھا اور تیسرا بطور خود مرتب کر رہے تھے۔ سلطنت مغلیہ کا شاہنامہ لکھنا شروع ہوا تھا۔ دو جزو نظم ہو چکے تھے مگر تکمیل کی نوبت نہ آئی اور وہ دفتر گاؤ خورد ہو گیا۔ اُردو کے بھی دو دیوان مرتب ہوئے۔ پہلا دیوان چوری گیا جس کی بابت لکھنؤ میں بیٹھ کر فخریہ کہتے تھے :-

اے مصحفی شاعر نہیں پورب میں ہوا میں — دلّی میں بھی چوری مرا دیوان گیا تھا

دوسرا دیوان ناتمام تھا کہ مشاعروں کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا گیا۔ میاں[3] خورم علی خورم کے مکان پر محفل آراستہ ہوتی تھی

لہ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۱۹۹ھ کے بعد بھی اس تذکرے میں رد و بدل کرتے رہے۔ کرپا دیال عرف کنور سین مضطر خلف دیوان بینی پرشاد کے حال میں ۱۲۰۰ھ "تا امسال کہ سنہ یک ہزار و دو صد و سیزدہ ہجری است عمرش بست و پنج سالہ ..... یکے از راسخ الاعتقادان یک رنگ فقیر است" پنڈت بڈھا دھر فصیح کشمیری کی بابت لکھتے ہیں "اسمش در یک ہزار و دو صد و دوازدہ ہجری داخل تذکرہ کردہ شد"

لہ تذکرۂ ہندی۔ صفحہ ۲۴۸ — سہ ریاض الفصحا۔ صفحہ ۲۳۰۔

مشاعروں کا دوسرا دور

ذوق کے اُستاد شاہ نصیر بھی شریک ہوتے تھے۔ نو مشقی کا عالم تھا لیکن طبیعت میں روانی اور تیزی تھی۔ چند سال کے بعد اساتذہ دہلی میں شمار ہوئے مگر قوت شاعری کے آثار اُسوقت بھی نمایاں تھے۔ مرزا علی نقی محشر لکھنوی شاہجہاں آباد میں پناہ گزیں تھے۔ لکھنؤ میں اُن سے اور مرزا علی مہلت شاگرد جرأت سے مناظرہ ہوا تھا اور یہ طے پایا تھا کہ گومتی پار جاکر تلوار سے فیصلہ کرلیں۔ مہلت اس ڈوئل میں زخمی ہوئے۔ وارثوں نے ہر چند دریافت کیا مگر ضارب کا نشان نہ دیا اور عرصۂ قلیل میں اُسی زخم سے فوت ہوگئے۔ محشر دعوئے خون کے خوف سے فرار ہوکر شاہجہاں آباد آئے تھے وہ بھی مصحفی کے مشاعروں میں شریک ہوئے ان کے دماغ میں دعوائے شاعری ایسا سمایا تھا کہ کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ اُن کا قول تھا کہ:۔

گفتگو اُردو زباں کی کوئی ہم سے سیکھ جائے — کیا ہوا دلّی میں محشر اپنی پیدائش نہیں

دو ایک سال کے بعد اکبرآباد وغیرہ کی سیر کرکے لکھنؤ واپس گئے۔ مقتول کے وارثوں نے پہلے خاموشی اختیار کی اور بعد کو قابو پاکر سنہ ۱۲۰۶ھ کے عشرۂ محرم میں مہلت کے خون کا قصاص لیا۔ مرزا عظیم بیگ عظیم بھی مشاعروں میں حاضر ہوتے مگر ہمیشہ صدر مجلس میں نشست کی کوشش کرتے تھے۔ وہ پہلے شاہ حاتم کے شاگرد تھے بعد کو مرزا رفیع سودا سے استفادہ کیا۔ دماغ میں دعوائے شاعری جاگزیں تھا اور خود کو ممتاز سمجھتے تھے

کیجیو عظیم کو بھی یارب غریقِ رحمت — آوارۂ جنوں تھا اک صاحبِ سخن تھا
اور معنی بند ایسا ہندی زباں کا صائب — ہندوستاں سے لیکر مشہور تا دکن تھا

گمان ہوتا ہے کہ اس صحبت میں اُردو کا دوسرا دیوان مصحفی تمام کرلیتے مگر آب و دانہ نے شاہجہاں آباد چھوڑنے پر مجبور کیا۔

دلّی سے کوچ

مرزا نجف خاں ذوالفقار الدولہ کا ۱۱۹۶ھ میں انتقال ہوگیا تھا۔ پانچ مہینہ کے بعد افراسیاب خاں منصب امیر الامرائی پر قابض ہوئے اور سلطنت کا کاروبار اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ شاہ عالم کے اختیارات سلب ہوئے لیکن کوئی مفر و مامن نہ تھا۔ ولی عہد مرزا جہاندار شاہ امیر الامرا سے بیزار تھے مگر محل سے نکلنے کی اجازت نہ تھی۔ نگرانی کے لئے جاسوس مقرر تھے۔ انھوں نے خیال کیا کہ انگریزوں کے گورنر جنرل امداد و اعانت پر مستعد ہوں تو سلطنت کے مردہ جسم میں تازہ جان پڑجائے۔ ایک مصاحب کو کلکتہ بھیجا۔ وہاں سے جواب ملا کہ گورنر جنرل بعض امور کی درستی کے لئے لکھنؤ جانے والے ہیں۔ مرشد زادۂ آفاق وہیں تشریف لائیں۔ خدمت گزاری کے لوازم اور بندگی کے مراسم بجالائے جائیں گے۔ اوائل ماہ جمادی الآخری ۱۱۹۸ھ میں وارن ہیسٹنگز لکھنؤ پہونچے اور شاہزادہ بھی رات کے وقت بھیس بدل کر قلعہ کی چھتوں سے پھاند کر گرتا پڑتا لکھنؤ آیا۔ نواب وزیر اودھ اور گورنر جنرل نے خاطر مدارات کی لیکن دہلی کے معاملات میں مداخلت اُسوقت ایسٹ انڈیا کمپنی کے مصالح کے خلاف تھی اس لئے گل مقصود کی بو بھی نصیب نہ ہوئی۔ امور مملکتِ خویش خسرواں دانند۔ بادشاہ کی طرف سے نواب آصف الدولہ اور وارن ہیسٹنگز گورنر جنرل

کرکے "خلعت نوازش شاہانہ" غلام علی خاں[1] ولد بھکاری خاں منصب دار شاہی کی معرفت لکھنؤ روانہ کئے گئے۔ محمد پناہ خاں حکیم (جن کا نام پہلے آچکا ہے) ہمراہ ہوئے۔ مصحفی بھی ان حضرات کے ساتھ صعوبات سفر برداشت کرتے ہوئے ۱۱۹۸ھ میں لکھنؤ پہونچے۔ بارہ برس کے بعد شاہجہاں آباد سے جدائی ہوئی مگر اس مدت میں دلی خوب دیکھی تھی اور اردوئے معلیٰ کی زباندانی کا سرٹیفکٹ مل گیا تھا۔ پورب میں بیٹھکر حاسدوں سے کہتے ہیں:۔

بعضوں کا گماں یہ ہے کہ ہم اہل زباں ہیں　　دلی نہیں دیکھی ہے زباںداں یہ کہاں ہیں

اور چھپتر برس کی عمر میں تحریر کرتے ہیں کہ "زبان فارسی و ہندی از ایام شباب مثل غلام و کنیز شب و روز پیش من کمر بستہ حاضری ماند"

لکھنؤ میں اقامت

لکھنؤ میں چند روز غلام علی خاں کے ہمراہ رہے اس کے بعد شاہجہاں آباد واپس جانے کا قصد کیا

مصحفی لکھنؤ میں دلی سے　　آیا تھا کرکے راہ دور دراز

لیکن اس خاک میں بھی نشے ہیں　　کچھ نہ دیکھا بجز نشیب و فراز

مرزا محمد حسن قتیل نواب وزیر کے ملازم تھے۔ آشنائی سابقہ کی بنا پر واپسی سے مانع ہوئے اور کہا "بادیہ پیمائی سے کیا حاصل ہے چندے یہاں رہو۔ اس معمورے کی سیر کرو" محمد پناہ خاں حکیم دلی چلے گئے مگر یہ مرزا قتیل کے اصرار سے ٹھیرے رہے محمد حیات بیتاب ساکن بلگرام کے مکان پر قتیل نے فروکش کرایا۔ وہ شعر و سخن سے ذوق رکھتے تھے۔ رائے سرپ سنگھ دیوانہ کے شاگرد تھے۔ بہت خلق اور تواضع سے پیش آئے اور مصحفی کو عزت و تکریم سے مہمان کیا

مرزا جواں بخت جہاندار شاہ شاہانہ ٹھاٹھ سے لکھنؤ میں مقیم تھے۔ شعرا کی قدر افزائی کرتے اور خود بھی شعر کہتے تھے۔ مہینے میں دو بار مشاعرے منعقد کرتے۔ سخنوروں کو جو بدا بھیجکر یاد فرماتے اور ہر ایک سے نہایت گرمجوشی کرتے تھے

نواب شمس الدولہ قسمت۔ نواب بارگاہ قلی خاں کے صاحبزادے جن کی سیادت۔ شجاعت اور شرافت کی شہرت عام تھی صاحب عالم کی سرکار میں مختار کل اور مصحفی کے معتقد تھے۔ مرشد زادۂ آفاق کی جناب میں تعریف کی۔ حضور بھی مشتاق ہوئے اور عید کا دن ملاقات کے لئے طے ہوا۔ مصحفی نے تہنیت عید کا قصیدہ تیار کیا اور ایک رباعی لکھی لیکن دربار میں اژدحام کی وہ کثرت تھی کہ قصیدہ پڑھنے کا موقع نہ ملا۔ قسمت، حاضرین کی صفیں چیرتے ہوئے سرکار تک پہونچے اور مصحفی کا قصیدہ شاہزادے کے ہاتھ میں دیا مگر تہیدستان قسمت کو کچھ فایدہ نہ ہوا۔ رباعی یہ تھی:۔

یارب تیری بزم رشک گلزار رہے　　اور بخت جواں سدا تیرا یار رہے

ہے مصحفی غریب کی نت یہ دعا　　جب تک کہ جہاں رہے جہاندار رہے

---

[1] غلام علی خاں مصحفی کے دوست تھے۔ انھوں نے عالی گوہر بادشاہ کی تواریخ لکھی تھی۔ ان کے والد نواب بھکاری خاں کسی وقت صوبہ دار لاہور رہے تھے۔ غلام علی خاں کی بابت مصحفی ۲۵۔۳۰ برس کے بعد لکھتے ہیں کہ "آں بزرگ ایں عاصی را کمال دوست داشتہ" ریاض الفصحا صفحہ ۲۹۹

[2] میر حسن کہتے تھے:۔　"زبس یہ شہر ہے یہ ہرپہ بستا　　کہیں اونچا کہیں نیچا ہے رستا"

نواب مہربان خاں رند جن کی سرکار میں کبھی سوداؔ اور سوزؔ ملازم تھے ریاست کا کارخانہ درہم و برہم ہونے کے بعد لکھنؤ میں گوشہ گزیں تھے۔ محلہ رستم نگر میں رہتے تھے۔ مرزا قتیلؔ کے ساتھ مصحفی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے مگر وہاں خود تباہ حالی تھی

اے مصحفی مت پوچھ کہ دلّی سے نکل کر کیا کیا نہ ہم کتنے پشیمان ہوئے ہیں

لالہ کانجی مل صباؔ۔ قوم کایستھ سکسینہ۔ فیروز آباد کے رہنے والے لکھنؤ میں نشو و نما ہوا۔ صاحب ثروت تھے۔ نو عمری سے شاعری کا شوق تھا۔ مصحفی کے شاگرد ہوئے۔ اپنے مکان پر عزت و حرمت سے مہمان کیا اور چند مہینوں میں مختصر دیوان تیار کر لیا۔ مصحفی لکھتے ہیں کہ "صباؔ کی طبیعت کو شعر سے بہت مناسبت تھی اگر اُن کی عمر وفا کرتی خوب ترقی کرتے مگر افسوس ہے کہ پچیس سال کی عمر میں مدقوق ہو کر جہان فانی سے کوچ کیا اور باقی ماندوں کے دل پر داغ حسرت چھوڑ گئے"۔

میر خلیق کی شاگردی

اسی زمانے میں میر حسنؔ سے ملاقات ہوئی۔ وہ اسوقت مثنوی سحر البیان لکھ رہے تھے۔ انکے صاحبزادے میر مستحسن خلیقؔ کو غزل گوئی کا شوق تھا۔ سولہ برس کی عمر سے شعر کہتے اور اپنے والد سے اصلاح لیتے تھے چند ملاقاتوں میں مصحفی کی زباندانی اور فضیلت کا میر حسن کے دل پر ایسا سکہ بیٹھا کہ بیٹے کو نصیحت کی "مصحفی اپنے فن میں بے نظیر ہیں جو کچھ ممکن ہو ان سے سیکھ لو" خلف سعید نے والد ماجد کے حکم کی اطاعت واجب سمجھی شوق سے اکثر حاضر ہوتے اور اپنے کلام پر اصلاح لیتے تھے۔ اُستاد نے خلیقؔ کی ذہانت دیکھ کر اسی وقت پشین گوئی کی تھی کہ زمانے نے فرصت دی تو یہ لڑکا خوب کہے گا۔ آج دنیا جانتی ہے کہ وہ مرثیہ گوئی کے طرزِ جدید کے موجد ہوئے اور ہمعصروں کی بارگاہ میں اپنے باکمال فرزند میر انیسؔ سے کم مقبول نہ تھے

تذکرۂ شعراءِ ہندی گویاں

میر حسن نے مثنوی سحر البیان ۱۱۹۹ھ میں تمام کی اور مصحفی نے اسکی تاریخ کہی:۔

"یہ بُت خانۂ چین ہے بے بدل"۔ اسی سال مصحفی نے اپنا تذکرۂ فارسی گویان ختم کیا اور اسکی تاریخ تالیف "زہے باغِ باصفا" قرار دی۔ میر مستحسن خلیقؔ نے اصرار کیا کہ اسی طرز سے شعراءِ اُردو کا تذکرہ بھی مرتب کیا جائے مصحفی پہلے ٹالتے رہے ان کو منظور نہ تھا کہ (بقول خود)[1] اپنی اوقات عزیز کو ایسے امرِ لاطائل کے اشتغال میں صرف کریں جس کو دوسروں نے فخریہ اپنے ذمہ لیا تھا" مگر عزیز شاگرد کے پیہم تقاضے سے مجبور ہو کر "طوعاً و کرہاً" اس بادیۂ پُرخار میں قدم رکھا۔ تذکرے کی تالیف سنہ ۱۲۰۰ھ سے شروع ہو گئی تھی۔ میر حسن زندہ تھے ان کو کئی جگہ[2] "سلمہ اللہ تعالےٰ" کے اضافہ سے یاد کیا ہے۔ مرزا جہاندار شاہ بھی بقید حیات تھے ان کی بابت لکھا ہے کہ "کبھی کبھی شعر ہندی اور فارسی بھی کہتے ہیں"۔ یہ دونوں بزرگ سنہ ۱۲۰۱ھ میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ میر حسن کی تاریخ انتقال "شاعرِ شیریں زبان" خود مصحفی کی تصنیف کردہ ہے اور مرزا جہاں دار کی بابت صاحب تذکرۂ گلشن ہند کی روایت ہے کہ "سنہ بارہ سو ایک ہجری میں بلدۂ بنارس کے اندر اس سریر آرائے بارگاہ شوکت و اجلال نے تخت نشینی ملک فنا کی چھوڑ کر اور رنگ آرائی کشورِ بقا کی اختیار کی"۔ تذکرے کی ترتیب سے سال دو سال میں فراغت ہو گئی تھی لیکن مصحفی کو اسکی اشاعت سے گریز تھا۔ اور مسودہ کسیکو نہ دکھاتے تھے۔ ایک دن امام بخش خاں کشمیری جن سے دلّی میں ملاقات تھی تشریف لائے اور مسودہ

---

[1] دیباچہ تذکرہ ہندی گویان۔ صفحہ ۳ — [2] مثلاً صفحہ (۸۸) خاکسار کے احوال میں دیکھو

دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ مصحفی نے معرفتِ سابقہ کا لحاظ کرکے مسودہ ان کے حوالہ کر دیا۔ وہ علم سے محروم تھے لیکن اساتذہ کے اشعار جمع کرنے کا شوق رکھتے تھے۔ میر شاہ حسین حقیقت شاگرد جرأت کو تذکرہ لکھنے کے لئے ملازم رکھا تھا شعرار دہلی کے اشعار و احوال جو مصحفی نے بڑی محنت سے بہم پہونچائے تھے انھوں نے خفیہ طور پر اس مسودے سے نقل کرائے اور حقیقت کا تذکرہ شعرا یختہ تیار کرا دیا۔ کسی دوست نے اس تذکرے کا جزوِ اول مصحفی کو لاکر دکھایا۔ انھوں نے آفتاب اور آصف وغیرہ کے احوال دیکھ کر پہچان لیا کہ ان کے مسودے سے سرقہ کیا گیا ہے۔ نہایت آزردہ ہوئے مگر اس تذکرے کی عبارت ناقص تھی اور احوال و اشعار کے نقل کرنے میں بھی غلطیاں ایسی فاحش ہوئی تھیں کہ غصہ ٹھنڈا ہو گیا اور حسبِ ذیل قطعہ لکھ کر وہ جزو تذکرہ حقیقت کا واپس کر دیا

جانتے ہیں سب کہ اک مدت سے یاں مصحفی کے تذکرے کا شور ہے
تذکرہ یہ جو حقیقت نے لکھا بے حقیقت مصحفی کا چور ہے

اس کے بعد تذکرہ طاقِ نسیاں پر رہا۔ پریشانیِ خاطر اور نامساعدیٔ زمانہ نے فرصت نہ دی کہ تصحیح و ترمیم کی جائے کئی سال کے بعد ۱۲۰۹ھ میں حک و اصلاح کے بعد صاف کیا گیا اور «جلدِ بے نظیر» تاریخ اختتام رقم ہوئی

مشاہیرِ سخن مصحفی بارہ سال دلی میں رہ کر دوبارہ لکھنؤ آئے تو زمین و آسمان کا فرق تھا۔ اب لکھنؤ دار الحکومت تھا اور آصف الدولہ کی سخاوت و عالی ہمتی نے شہر کی صورت بدل دی تھی۔ ہر فن کے باکمال یہاں جمع تھے۔ مرزا رفیع سودا کی وفات ہو چکی تھی مگر میر تقی دلی سے ان کی جگہ آ گئے تھے۔ میر حسن یہیں مقیم تھے۔ میر سوز تشریف فرما تھے۔ جرأت نغمہ سرائی کر رہے تھے۔ ان کے اُستاد جعفر علی حسرت بھی زندہ تھے بقا اللہ خاں بھی وارد ہو گئے تھے اور ان کے علاوہ بیسیوں شعرا اور ادیب۔ علما و فضلا اکٹھا تھے میر تقی اور بقا اللہ خاں سے مصحفی کے قدیم تعلقات تھے۔ میر حسن سے ربط و اخلاص کا احوال بیان ہو چکا ہے۔ میر سوز علاوہ کمالاتِ شاعری اور درویشی کے تیر اندازی۔ خوشنویسی۔ اور علم مجلس میں بے نظیر تھے سن شریف ستر سال سے متجاوز تھا۔ مصحفی کے حال پر شفقت بزرگانہ فرماتے۔ غائب و حاضران کی تعریف سے تر زبان رہتے تھے۔

جعفر علی حسرت: ابو الخیر عطار کے لڑکے رائے سرب سنگھ دیوانہ کے شاگرد تھے۔ مدت تک شاعری ذریعۂ معاش رہی۔ مرزا جہاندار شاہ کی سرکار میں درخور ہوا۔ بعد ازاں نوکری چھوڑ کر اکبری دروازے میں عطاری کی۔ مصحفی سے مشاعروں میں ملاقات ہوتی تھی حسرت کی شاعری پر ان کا تبصرہ یہ تھا:۔

گرچہ چلا بھی ہووے تو ہاں سوز کا سا ہو کس کام کی وگرنہ چھنالے کی شاعری
کیسا ہی بڑھ چلے وہ کلام شریف پر سرسبز ہو کبھی نہ رذالے کی شاعری
بعضوں نے تب تو شعر پہ حسرت کے یہ کہا کیا دال موٹھ بیچنے والے کی شاعری

حسرت کے نامور شاگرد قلندر بخش جرأت کا اصلی نام یحییٰ ماں تھا۔ بیجے رائے ماں کی اولاد میں تھے جس کے نام سے چاندنی چوک دہلی کے قریب کوچہ رائے ماں مشہور تھا۔ صغر سنی سے یورب آ گئے تھے یہیں نشو و نما پائی، کلام میں اس قدر پختگی پیدا ہوئی کہ

اُستاد سے زیادہ شہرت پائی۔ علم نجوم اور ستار نوازی میں بھی دخل تھا۔ جوانی میں نابینا ہو گئے تھے۔ مصحفی سے ہمسری کا دعوے رکھتے تھے۔ ظاہر میں ارتباط تھا، لیکن قلوب صاف نہ تھے۔ مصحفی لکھتے ہیں کہ "در ہمسری من می میرد و در باطن ہمیشہ تخم کینہ می کارد"

میر نعیم خاں کی رفاقت

غرض بڑے بڑے کاملانِ فن لکھنؤ میں تشریف فرما تھے۔ عرصہ تک مصحفی کی آمد سے رؤسائے شہر کو آگاہی نہ ہوئی:۔

کوئی واقف نہیں احوال سے میرے اب تک | میں تو اس شہر میں ہوں گوشہ نشیں مدت سے
مصحفی نام تو میرا ہے جہاں میں ہر چند | گھر میں بیٹھا ہوں میں مانند نگیں مدت سے

مرزا ضیا آفتی آشفتہ[2] شاگرد میر سوز نے مشاعرہ منعقد کیا اور اس میں پہلی بار لکھنؤ کے قدر شناسوں کو مصحفی کی غزل خوانی سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا۔ اُستادی کے لئے پیام آنے لگے۔ لالہ کانجی مل صبا کا مکان چھوڑ کر شہر کے ایک مقتدر رئیس میر محمد نعیم خاں کی رفاقت اختیار کی اور مدت تک انھیں کے دولتکدے پر فروکش رہے۔ اسی زمانہ میں میر اکبر علی اختر جن کی ظرافت اور لسانی کی دھوم تھی اور آتشبازی بنانے میں بے نظیر تھے۔ میر نعیم خاں کی سرکار میں بسلسلۂ ملازمت آئے۔ مصحفی کے نیازمند ہوئے اور اپنے کلام پر اصلاح لینے لگے۔ میاں شاہ جیو برق جن کی پہلی غزل کا مطلع تھا:۔

یوں لاکھ ہوں دنیا میں تو کچھ کام نہیں ہے | واللہ کہ تجھ بن مجھے آرام نہیں ہے

مصحفی کے شاگرد ہوئے۔ اور اُستاد کے حکم سے تخلص برق قرار دیا۔۔ نواب شجاع الدولہ مرحوم کے مدار المہام راجہ بینی بہادر کے ذی شعور صاحبزادے راجہ جسونت سنگھ عرف کاکاجی مدت سے مصحفی کے غائبانہ نیازمند اور ملاقات کے مشتاق تھے۔ انکی لکھنؤ میں تشریف آوری کی خبر سنتے ہی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ پہلے فارسی اشعار کہتے اور رائے سرب سنگھ دیوانہ کو دکھاتے تھے اب اردو شاعری میں مصروف ہوئے اور مصحفی کی شاگردی اختیار کی۔ پروانہ تخلص تھا۔۔ میر نعیم خاں کی ملازمت مصحفی نے دو تین سال کی تھی کہ طبیعت پر وحشت کا غلبہ ہوا۔ شعر و شاعری سے نفرت ہو گئی۔ میر اکبر علی موافق معمول کے اصلاح کی غرض سے حاضر ہوتے تھے۔ ان کی اوقات آزادگی میں خلل پڑتا تھا شاگرد سے کہا کہ تم میاں قلندر بخش جرأت کے پاس جاؤ اور اُن سے اصلاح لو۔ وہ پہلے راضی نہ ہوتے تھے مگر آزردگیِ طبیعت کے خوف سے مجبوراً جرأت کے حضور میں گئے اور صورت حال ظاہر کی۔ انھوں نے کہا کہ مجھ سے اور مصحفی سے دوستی ہے۔ تمہارے قول کا اعتبار نہیں اگر ان کا رقعہ لاؤ تو شاگردی منظور ہو سکتی ہے، ورنہ نہیں۔ دوسرے روز مصحفی کے پاس آئے اور رقعہ طلب کیا۔ اُستاد نے تحریر عنایت کی اور وہ اپنا کلام جرأت کو دکھانے لگے۔۔ پہلے انجم تخلص تھا اور شاعری کا رنگ یہ تھا:۔

---

[1] تذکرہ ہندی۔ صفحہ ۲۶ ۔۔ [2] آشفتہ موروثی طبیب تھے۔ شعر دردمندانہ شستہ و صاف کہتے تھے:۔

چہرہ کچھ اندنوں غمِ نہاں سے زرد ہے | ظاہر میں کچھ مرض نہیں پر دل میں درد ہے
لڑتے تو رات اس سے میں غصہ میں لڑ لیا | پر جب وہ اٹھ چلا تو کلیجہ پکڑ لیا

صدا آواز کی بھی ہم تو سننے کو ترستے ہیں
خوشا حال انکا ہے جو آپ کے ہمسایہ بستے ہیں

اب جرأت کے شاگرد ہوئے۔ اختر تخلص ہوا اور مذاق بدل گیا

کھڑے ہیں لوگ باہر سے جو سب چرچا ابھی
کون تھا وہ جس کو تم شب گھر کے اندر لے گئے

بولے گھبرا کر ہمیں پیٹے جو یہ حرکت کرے
سامنے اس کے گلے تک ہم جو خنجر لے گئے

مرزا مینڈو سرسبز

مرزا زین العابدین خاں عرف مینڈو۔ نواب سالار جنگ مرحوم کے فرزند۔ جوان باعلم و حیا۔ صاحب فہم و ذکا تھے ان کے اسلاف فرخ سیر کے عہد میں ہندوستان آئے اور رتبۂ عالی جاہی پر فائز ہوئے ہمیشہ بادشاہوں اور وزیروں کے مقرب رہے۔ مرزائے موصوف کو طفولیت سے شعر گوئی کا شوق تھا اور سترہ سال کی عمر میں دیوان مرتب کر لیا۔ سرسبز تخلص تھا

اُس کے کوچے کی طرف میں تو نہ جاؤں سرسبز
کششِ دل ہے کہ کھینچے لئے جاتی ہے مجھے

مصحفی کی مشاقی اور پختگیٔ کلام کے معتقد تھے۔ گوہر نایاب کی قدردانی کی۔ شیخ کو اپنے دامنِ عاطفت میں لیا اور چار سال تک بہت عزت و احترام سے اپنے ساتھ رکھا۔ یہ قصہ سنہ ۱۲۰۳ھ یا سنہ ۱۲۰۴ھ کا ہے۔ شاگردوں کے انبوہ میں اضافہ ہوا جنہیں سے تنہا۔ گرم اور منتظر کا تعارف اس مقام پر مناسب ہے۔

تنہا محمد علی نام۔ تنہا تخلص۔ بزرگوں کا وطن شاہجہان آباد تھا۔ لیکن لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم پائی۔ نوعمری سے شعر کہتے تھے۔ مرثیہ خوانی کا بھی شوق تھا۔ سپاہیوں میں ملازم تھے مصحفی کے شاگرد اور مخلص نیاز مند تھے۔ اُستاد نے سرٹیفکٹ دیا کہ "اس کا خیال بہت رسا ہے" چند روز میں خود مرتبۂ اُستادی کو پہونچے اور ناسخ کا سا ہونہار اُن سے مشورہ لینے لگا۔

غیر سے شکوہ مرا بس دیکھی دانائی تری
میں ہوا رسوا تو کیا ہوگی نہ رسوائی تری

آئے تو وے آن کے اک آن نہ ٹھیرے
میں کتنا کہا وہ کسی عنوان نہ ٹھیرے

آغاز ہی میں ہو گئی وحشت مجھے تنہا
اس فصل میں شاید کہ گریبان نہ ٹھیرے

یہ تو فرمائیے ہم آپ کا کیا لیتے ہیں
آپ بیوجہ جو مُنھ ہم سے چھپا لیتے ہیں ✓

گرم مرزا حیدر علی گرم ولد نیاز علی بیگ ساکن شاہجہان آباد مصحفی کی خدمت میں سب شاگردوں سے زیادہ رسوخ و اعتقاد رکھتے تھے۔ جو کچھ رطب و یابس موزوں کرتے اصلاح کے لئے پیش کرتے تھے۔ اُستاد لکھتے ہیں کہ "باوصف مشق کے اس کی طبیعت میں اسقدر ذکاوت معلوم ہوتی ہے کہ بشرط مزاولت یہ بھی کوئی چیز ہوگا!!"

شب رخصت ہے رہو تم مرے گھر آج کی رات
جاں بلب چھوڑ کے جاتے ہو کدھر آج کی رات ✓

آگے آنکھوں کے اندھیرا سا سر شام سے ہے
دیکھئے ہوتی ہے کس طرح سحر آج کی رات ✓

یوں آپ جو کچھ جی میں ہو فرمایئے صاحب گالی نہ مجھے غیر سے دلوایئے صاحب

تادیر میں اس بزم میں بیٹھوں تو کہے یوں اب رات بہت آئی ہے گھر جایئے صاحب

منتظر میاں نور الاسلام منتظر تخلص ولد شاہ فیض علی۔ شاہ عاقل سبز پوش چشتی کے عزیز تھے۔ نظم و نثر فارسی کی اکثر کتب درسی پڑھی تھیں۔ عربی بھی جانتے تھے۔ دس بارہ سال کی عمر سے مرضِ عشق میں گرفتار ہوئے۔ طبیعت موزوں تھی۔ "بہ اتنا سنائے دلفریبیٔ محبوب فکر شعر میں مصروف رہتے اور دن رات مثل مجنونوں کے صرف کرتے تھے"۔ سترہ سال کی عمر میں مصحفی کے شاگرد ہوئے اور اپنی راسخ الاعتقادی کی برکت سے شاعری میں وہ درجہ حاصل کیا کہ مصحفی خود اُن پر ناز کرتے تھے ۱۲۰۹ھ میں لکھتے ہیں کہ "گرم آٹھ سال سے مشورۂ کلام کے لئے فقیر کے پاس آمد و شد رکھتے ہیں اور اس عرصہ میں کسی دوسرے کی طرف رجوع نہیں کیا۔ اگرچہ بعض اشخاص نے ان کی ذہانت طبع دیکھ کر اپنے حلقۂ بیعت میں کھینچنا چاہا لیکن انھوں نے ہرگز التفات نہ کیا۔ اب ان کی کلہ شکنی کے لئے وہ میرے برابر موجود ہیں اور ان کا کلام غایت لطف و صفا سے اس درجہ کو پہونچا ہے کہ فقیر کے کلام سے کم پایہ نہیں رکھتا۔ وہ اس خاکسار بے مقدار کے شاگردانِ رشید سے ہیں اور آجتک انکی عمر ۲۵ سال کی ہے" کلام کا نمونہ دیکھئے

ہردم خیالِ یار جو پیشِ نظر رہا ہجراں میں بھی وصال ہمیں بیشتر رہا

چاہت کی بات مجھ سے نہ دم دے کے پوچھئے اپنے ہی جی سے آپ قسم دے کے پوچھئے

مرزا سلیمان شکوہ جب غلام قادر کی نمک حرامی سے شاہ عالم نورِ بصارت کھو بیٹھے اور حکومت دوسروں کے قبضۂ اختیار میں گئی اس کے دوسرے برس شاہ عالم کے نورِ نظر مرزا سلیمان شکوہ (جو بادشاہ کے تیسرے بیٹے تھے) قلعۂ معلٰی سے بے سروسامانی کے ساتھ نکلے اور ۱۲۰۵ھ میں لکھنؤ پہونچے۔ نواب وزیر نے استقبال کیا اور عرصۂ دراز تک لکھنؤ میں عزت و احترام سے رکھا۔ آصف الدولہ فدویانہ سلوک کرتے تھے۔ ایک ایک الائچی اور گلوری کی بخشش پر آداب گاہ سے بار بار آداب بجالاتے تھے۔ چھ ہزار روپیہ ماہوار جیب خرچ کے لئے مقرر کیا گیا اور جنرل مارٹن کی ٹیڑھی کوٹھی میں ان کا شاہانہ کارخانہ دربار دہلی کے نمونہ پر آراستہ ہوا وہ بڑے علم دوست اور ہنر پرور تھے۔ جو صاحب کمال دلی سے آتا اس کی بقدر استطاعت امداد کرتے اور اپنے سایۂ عاطفت میں پناہ دیتے تھے۔ شعر و سخن سے بہت ذوق تھا۔ ہر مہینے مجلس مشاعرہ منعقد کرتے تھے۔ دلی میں شاہ حاتم کو اپنا کلام دکھایا تھا۔ لکھنؤ میں ولی اللہ محب شاگرد مرزا رفیع سودا سے اصلاح لیتے تھے۔ ۱۲۰۹ھ[1] کے قریب ولی اللہ کا انتقال ہوا تو مصحفی کے شاگرد ہوئے۔ پچیس روپیہ ماہوار اُستاد کی تنخواہ مقرر کی جو شاہزادے کی استطاعت پر نظر کرتے ہوئے قابلِ ملامت نہ تھی۔ اس کے علاوہ عیدین کے قصائد پر انعام و اکرام

---

[1] "دو سال است کہ بمرضِ مزمن ناسور بادداع جہان فانی کردہ۔ مرقدش در پیر جلیل است" "تذکرۂ ہندی احوال "محب"۔ صفحہ ۲۳۱

"نیک دو سال کہ دریں شہر فقیر بار یاب مجلس حضور پرنور شدہ او (مرزا نعیم بیگ جوان) راہ بہماں طریقۂ راسخ الاعتقادی بحرف یافتہ" "تذکرۂ ہندی احوال جوان" صفحہ ۶۶۔ تذکرۂ ہندی کا سال اختتام ۱۲۰۹ھ ہے لہٰذا سمجھنا چاہئے کہ ۱۲۰۷ھ میں محب کا انتقال ہوا اور اسی کے بعد مصحفی باریاب مجلس حضور پرنور ہوئے

ماتے تھے مصحفی سے تین چار مہینے بعد
در دیشی میں

ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ
ہندوستان سے باہر صرف سالانہ چندہ آٹھ روپیہ یا بارہ شلنگ

نگار

ششماہی چندہ میں نگار کا جنوری نمبر
بوجہ اضافہ ضخامت و قیمت شامل نہ ہوگا

جلد ۳۵ | فہرست مضامین جنوری سنہ ۱۹۳۹ء | شمارہ ۱

ملاحظات	اڈیٹر	۳
حیاتِ مصحفی	امیر احمد علوی بی۔اے	۹
اُردو غزل گوئی میں مصحفی کا مرتبہ	فراق گورکھپوری ام۔اے	۶۸
مصحفی کی غیر مطبوعہ مثنویاں	عبدالباری آسی	۹۶
مصحفی اور انکی شاعری	مجنوں گورکھپوری ام۔اے	۱۲۰
مصحفی	حسرت موہانی بی۔اے	۱۳۳
مصحفی کی دو گمشدہ بیاضیں	مشیر احمد علوی بی۔اے	۱۴۰
مصحفی کا ایک غیر مطبوعہ ترجیع بند	ہوش ملیح آبادی	[illegible]
انتخاب کلام مطبوعۂ مصحفی	اڈیٹر	
انتخاب کلام غیر مطبوعۂ مصحفی	اڈیٹر	

غیر سے دلوایئے صاحب
آئی ہے گو

UNIVERSITY LIBRARY
9 JAN
ALLAHABAD

مصحفی

سال

"ایک دو سال کر دریں شہر فقیر باید یا بجلد
صفحہ ۲۶ — تذکرہ مصحفی کا سال اختتام ۱۲۰۹ھ ہے جبکہ

سے سرفراز فرماتے تھے مصحفی سے تین چار مہینے بعد قلندر بخش جرأت کو بھی دولت ملازمت حاصل ہوئی اور نوازش خسروانہ سے سربلند ہوئے۔ میر سوز اسوقت لباس درویشی میں تھے لیکن مجلس مشاعرہ میں ان کو بھی ایک دوشالہ اور ایک پٹو عنایت ہوا۔

رنگین نظم اردو میں ریختی کے موجد۔ سعادت یار خاں رنگین جن کے والد طہماسپ یار خاں تورانی نواب نجف خاں کے عہد میں صاحب اقتدار تھے اور وہ خود فن سپہ گری اور سواری اسپ میں بے نظیر۔ بسلسلۂ تجارت لکھنؤ آئے۔ مرزا سلیمان شکوہ کے دربار میں تقرب و امتیاز پایا۔ نوعمری سے شعر کہتے اور شاہ حاتم سے اصلاح لیتے تھے۔ لکھنؤ میں از راہ انصاف اپنے دیوان پر از اول تا آخر مصحفی سے اصلاح لی۔ بعد کو انشا سے دوستی ہوئی اور دستار بدل بھائی ہو گئے۔ دریائے لطافت کی تالیف کے وقت یعنی ۱۲۲۲ھ میں تعلقات اتنے گہرے تھے کہ انشا فخریہ لکھتے ہیں۔ "در رنگین، راقم را با وصف ہیچمدانی مسلم الثبوت وبہتر از شعرائے ماضی وحال زبان ریختہ میداند"

عجب رنگینیاں ہوتی ہیں کچھ باتوں میں اے انشا ۔۔۔ بہم مل بیٹھتے ہیں جب سعادت یار خاں اور ہم

انشا انشا پہلے سے دربار میں حاضر تھے بلکہ شاہزادے کی مجلس مشاعرہ میں شرکت بھی مصحفی نے انھیں کے اصرار سے کی تھی۔ خود لکھتے ہیں کہ "جس زمانہ میں کہ ترتیب مجلس مشاعرہ کا حکم ہوا اس فن کے اکثر کاردان حضور میں حاضر ہوتے تھے یہ فقیر حقیر باوجود گوشہ نشینی کے اس کام میں زیادہ رسوائی رکھتا تھا اس لئے میر انشاء اللہ خاں کے کہنے سے حسب الطلب حضور باوصف شکستہ حالی کے شریک مجلس یاراں ہوا اور اسی تاریخ سے حلقۂ ملازمان حضور میں آگیا"۔ انشا تخلص۔ میر انشاء اللہ خاں نام۔ میر ماشاء اللہ خاں مصدر کے لڑکے تھے۔ جنھوں نے نواب سراج الدولہ ناظم بنگال کے عہد میں عروج پایا۔ ولادت مرشدآباد میں ہوئی اور عہد شباب پورب میں گزرا۔ طبیعت موزوں تھی۔ شعر کہتے اور پدر بزرگوار سے اصلاح لیتے تھے۔ اپنے والد کے ساتھ مرزا نجف خاں کے عہد امارت میں دلی آئے۔ شاہ عالم نے شفقت کی اور اپنی مجلس میں جگہ دی۔ مصحفی اسوقت کنج عزلت میں ارا کین حکومت سے قطع تعلق کئے ہوئے تھے۔ درباری شعرا سے معرکے ہوئے۔ کہن سال مشاقوں نے انشا پر اعتراضات کئے۔ مرزا عظیم بیگ سے ناچاقی ہوئی جس کی تفصیل حکیم قدرت اللہ خاں قاسم نے مجموعۂ نغز میں لکھی ہے۔ مرزا عظیم بیگ اچھے شاعر تھے مگر بقول قاسم "بسیار بر خود غلط" سید انشا بذلہ گو اور لطیفہ سنج تھے مگر بقول قاسم "شوخ طبع۔ ہنگامہ آرا اور خود بیں" عظیم نے ایک غزل کہی جو بحر رجز میں تھی۔ مگر کچھ شعر اتفاقاً بحر رمل میں جا پڑے تھے۔ انشا نے بر سر مشاعرہ تقطیع کی فرمائش کی اور ایک مخمس پڑھا جس کا مطلع تھا:-

گر تو مشاعرے میں صبا آج کل چلے ۔۔۔ کہیو عظیم سے کہ ذرا وہ سنبھل چلے
اتنا بھی حد سے اپنے نہ باہر نکل چلے ۔۔۔ پڑھنے کو شب جو یار غزل در غزل چلے
بحر رجز میں ڈال کے بحر رمل چلے

لہ تذکرہ ہندی احوال "سلیمان" صفحہ ۱۲۰-

عظیم کو شرمندگی ہوئی اور اسی مخمس کی طرح میں دل کا بخار نکالا جس کے نو بند صاحب مجموعۂ نغز نے نقل کیے ہیں ایک ٹیپ لاجواب تھی:-

شہ زور اپنے زور میں گرتا ہے مثل برق — وہ طفل کیا گریگا جو گھٹنوں کے بل چلے

غزلوں کے مقطع میں فخریہ چشمکیں ہونے لگیں۔ انشا نے یہاں تک کہدیا کہ میرا اور ان لوگوں کا کلام ایسا ہے جیسے کلام الٰہی اور مُسیلمہ کذّاب کا الفیل ما الفیل۔ ستم بالائے ستم یہ کہ شاہ عالم کے دربار میں شکایت کی۔ بادشاہ مشاعرے میں اپنی غزل بھیجا کرتے تھے۔ انشا نے عرض کی کہ فلاں فلاں اشخاص حضور کی غزل پر تمسخر اور مضحکہ کرتے ہیں۔ بادشاہ نے مشاعرے میں غزل بھیجنا موقوف کردی۔ شعراء دلی کو نہایت رنج ہوا۔ چنانچہ اس کے بعد جو مشاعرہ ہوا اس میں بہت بے لطفی ہوئی۔ فساد کا اندیشہ تھا مگر میر مشاعرہ نے صلح کرادی۔ ولی اللہ محب نے کہا:-

مجلس میں چلے چاہئے جھگڑا شعراء کا — ایسے ہی کسی صاحب توقیر کے آگے
یہ بھی کوئی دانش ہے کہ پہونچے یہ قضایا — اکبر تئیں یا شاہ جہانگیر کے آگے

یہ مشتبہ ہے کہ دہلی میں مصحفی سے ملاقات ہوئی یا نہیں۔ مصحفی سنہ ۱۱۹۸ھ میں لکھنؤ گئے اور وہیں سنہ ۱۲۰۰ھ کے قریب تذکرۂ ہندی گویان کا آغاز کیا۔ اس کے ابتدائی حصہ میں انشا سے ملاقات ہونے کا مذکور نہیں۔ صرف یہ لکھا ہے کہ "ان کا دیوان فقیر کی نظر سے گزرا"۔ حالانکہ مصحفی کا دستور یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس شاعر سے ملاقات جسمانی کی نوبت آتی ہے اس کی بابت ضرور لکھتے ہیں کہ "میں نے اس کو لکھنؤ میں دیکھا" یا "دلی میں فلاں موقع پر ملاقات ہوئی" وغیرہ وغیرہ

قصہ مختصر۔ دلی سے اُچاٹ ہو کر انشا لکھنؤ آئے اور نمکخواری قدیم کے سلسلہ سے مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں پہونچے اور شاہزادے کے مختار و نائب خانزاد خاں بہادر سے صیغۂ اخوت بڑھکر گوناگوں الطاف خسروی کے سزاوار بن گئے۔ مصحفی انہیں کے اصرار سے شاہی مشاعرے میں حاضر ہوئے اور اُسی دن اُستادی کا خلعت ملا۔

تذکرۂ ہندی کا اختتام

چند سال نہایت آرام و عافیت سے بسر ہوئے شہزادے کی غزلوں پر اصلاح دیتے اور اپنا تیسرا دیوان تمام کرتے تھے۔ میر تقی کی مثنوی "دریائے عشق" کے جواب میں مثنوی "بحر المحبت" غالباً اسی زمانہ میں لکھی گئی۔ تذکرۂ ہندی گویان جس کا مسودہ کئی سال سے تیار تھا اسی زمانے میں بعد تصحیح احوال و اشعار صاف کیا گیا اور خاتمہ پر قطعہ ذیل تحریر ہوا:-

چونکہ از فضلِ خدا ساختہ شد — جلد ایں تذکرہ مانند بہشت
سالِ او چوں ز خرد پرسیدم — یک ہزار و دو صد و نہ بنوشت

شاہزادے کی مدح و ثنا سے تر زبان رہتے اور دعا کرتے تھے کہ "حق تعالیٰ اس قدرشناس شعرا کو جلد تخت سلطنت و جہانبانی پر مسلط کرے تاکہ دولت خواہان حضور کی دلی مراد جو شب و روز دعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے رہتے ہیں جلد بر آئے۔

تخت طاؤس پہ جب ہوئے سلیمان کا جلوس — مورچھل ہاتھ میں میں بال ہما کا لیلوں

قطعہ :- یارب یہ مصحفی کی دعا ہے کہ آج کل مشرق سے ایکبار کچھ ایسی ہوا چلے
جو خود بخود سپہر پہ چڑھ مثل آفتاب مغرب زمیں کو تخت سلیماں چلا چلے

سید انشا بھی شہزادے کو سلطنت ملنے (بہ الفاظ دیگر شاہ عالم اور ان کے ولیعہد کے مرجانے) کی دعا مانگا کرتے تھے

دعا مانگے ہے انشا اللہ اے یارو کہو آمیں سلیماں کا جلوسِ میمنت مانوس ہم دیکھیں

عید غدیر کی تہنیت میں ایک ترجیع بند لکھا جس میں اپنی نیت صاف صاف ظاہر کر دی :-

نہ رہنے پائے زمیں پر جو غیر ذالک ہو عدو جو ہو وے ترا سو عدم کو سالک ہو
یہ خانہ زاد ترا بخشی الممالک ہو، خدا کرے یہ مبارک ہو ایسی عید غدیر
کہ نذر جشن جلوس ابکی سال دیوے وزیر

عجب طرح کا زمانے کو ہووے عز و شرف کہ شاہ جس میں سلیمان وزیر ہو آصف،
صدا بلند ہے ابتو یہی ہر ایک طرف خدا کرے یہ مبارک ہو ایسی عید غدیر
کہ نذر جشن جلوس ابکی سال دیوے وزیر

انشا کی ذہانت اور طباعی میں شک نہیں۔ دریائے لطافت ان کے کمالات کی سند محکم ہے۔ زبان کا جوہری ان کے کلام کو موتیوں سے تولے۔ ظرافت کا شیدائی سیم و زر نثار کرے۔ لیکن لکھنؤ آنے کے بعد ان کی شاعری مسخر نقالی۔ ہوس پرستی اور فحاشی کا معجون بن گئی تھی۔ واردات محبت اور جذبات عشق کی مصوری سے کچھ واسطہ نہ تھا۔ بقول شیفتہ "ہیچ حسنت از الطریقۂ راسخہ شعرانہ گفتہ" ان کو مصحفی کا حریف بنانا الی کو آم کے مقابل لانا تھا۔ مگر عیش پرستوں کی محفل میں ہنسنے والے جمع تھے۔ کشت زعفران کی تلاش تھی اور درد و سوز کے ترانے ناپسند۔

میں ہوں ہنسوڑا اور تو ہے مقطع میرا تیرا میل نہیں

انشا نے معرکہ

ایک مدت تک انشا کی ظرافت اور مصحفی کی متانت میں آویزش نہیں ہوئی مگر دربار کا رنگ آہستہ آہستہ بگڑ رہا تھا۔ مصحفی نے ایک غزل پڑھی جس کا مقطع تھا

تھا مصحفی یہ مائل گریہ کہ پس از مرگ تھی اس کی دھری چشم پہ تابوت میں انگلی

اہل محفل نے غزل کو اُلٹ کر مصحفی کی ہنسی اُڑائی اور مقطع کو یوں ترمیم کیا :-

تھا مصحفی کانا جو چھپانے کو پس از مرگ رکھے ہوئے تھا آنکھ پہ تابوت میں انگلی

مصحفی کو اس قصے کی خبر ہوئی مگر انھوں نے آئین متانت کی پاسداری کی اور بجائے ہجو کے ایک فخریہ غزل لکھی جس کے چند شعر سننے کے قابل ہیں :-

مدت سے ہوں میں سرخوش صہبائے شاعری نادان ہے جس کو مجھ سے ہے دعوائے شاعری
میں لکھنؤ میں زمزمہ سنجانِ شعر کو برسوں دکھا چکا ہوں تماشائے شاعری

اک طرفہ خر سے کام پڑا ہے مجھے کہ ہاں　　سمجھے ہے آپ کو جو مسیحائے شاعری
اے مصحفی ز گوشۂ خلوت بروں خرام　　خالی ست از برائے تو خود جائے شاعری
مجنوں منم چرا دگرے رنج می برد　　در حصۂ من آمدہ لیلائے شاعری

اسی عرصہ میں مصحفی نے ایک غزل کہی جس کے چند اشعار یہ تھے:۔

سر مشک کا ہے تیرا تو کافور کی گردن　　نے موئی پری ایسی نہ یہ حور کی گردن
مچھلی نہیں ساعد میں ترے بلکہ نہاں ہے　　وہ ہاتھ میں ماہئی سقنقور کی گردن
اک ہاتھ میں گردن ہو صراحی کی مزا ہے　　اور دوسرے میں ساقیٔ مخمور کی گردن

اور یہ شعر بے نظیر تھا:۔

کیا جانیے کیا حال ہوا صبح کو اُس کا　　ڈھلکی ہوئی تھی شب ترے رنجور کی گردن

انشا نے اس غزل پر اعتراضات کئے۔ مثلاً:۔

کیا لطف ہے کہ گردن کافور باندھ کر　　مردے کے پاس زندوں کو لا کر سنگھائیے
ایسے نجس کثیف قوافی سے نظم میں　　دندان ریختہ پہ پھپھوندی جمائیے
گردن کا دخل کیا ہے سقنقور میں بھلا　　سانڈے کی طرح آپ نہ گردن ہلائیے

اور اُسی طرح میں خود غزل لکھی جس کے چند اشعار یہ ہیں:۔

توڑوں گا خمِ بادۂ انگور کی گردن　　رکھ دوں گا وہاں کاٹ کے اک حور کی گردن
اُچھلی ہوئی ورزش سے ترے ڈنڈ پہ مچھلی　　ہے نام خدا جیسے سقنقور کی گردن
اے دیو سفید سحری کاش تو توڑے　　اک ٹکے سے خور کے شب دیجور کی گردن
آئینے کی کر سیر کہ شیخ نے تو دیکھے　　یہ خرس کا منہ خوک کا لنگور کی گردن
حاسد تو ہے کیا چیز کرے قصد جو انشا!　　تو توڑ دے جھٹ بلعم باعور کی گردن

مصحفی کی مشاقی اور قادر الکلامی دیکھیے کہ اُسی دشوار طرح میں اعتراضات کے جواب دئے اور انشا کی غزل پر خود اعتراضات وارد کئے۔ قطعہ طویل ہے صرف چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں:۔

کافور سے مطلب ہے مرا اس کی سفیدی　　ٹھنڈھی تو میں باندھی نہیں کافور کی گردن
میں لفظ سقنقور مجرد نہیں دیکھا　　ایجاد ہے تیرا یہ سقنقور کی گردن
لنگور کو شاعر تو نہ باندھے گا غزل میں　　کس واسطے باندھے کوئی لنگور کی گردن
گردن کی صراحی کے لئے وضع ہے نادان　　بیجا ہے "خمِ بادۂ انگور کی گردن"

اس سے بھی میں گزرا غلطی اور یہ سنئے — باندھے ہے کوئی "خوشۂ انگور کی گردن"
جو گردنیں ہیں باندھی ہیں لا تجھکو دکھادوں — تو مجھ کو دکھا دے "شب دیجور کی گردن"

آزاد لکھتے ہیں کہ "منجملہ اور اعتراضوں کے مصحفی کی غزل میں ماہیِ سقنقور میں جو ق پہ تشدید پڑھی جاتی ہے اس پر بھی تمسخر کیا اور شیخ مصحفی نے یہ شعر سند میں دیا:-

ما ہم دو فقیری دو سیہ روئی کونین — رخسارِ سفید امرا را نہ شناسیم

مرزا سلیمان شکوہ نے اس رد و قدح میں انشا کا ساتھ دیا اور اُستاد کی تنخواہ پچیس سے گھٹا کر پانچ کر دی۔

اے وائے کہ پچیس سے اب پانچ ہیں اپنے — ہم بھی تھے کبھی روزوں میں پچیس کے لایق
اُستاد کا کرتے ہیں امیر اب کے مقرر — ہوتا ہے جو درماہہ کہ سائیس کے لایق

مصحفی کے شاگردوں سے شہر بھرا تھا۔ تنہا، منتظر اور گرم سے تعارف ہو چکا ہے۔ وہ اُستاد کی مدد کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ انشا کی ہجو میں ایک مثنوی "گرم نیا بخچہ" لکھی جو نایاب ہے۔ منتظر نے سر مشاعرہ اپنی غزل میں چوٹیں کیں جس کا ایک مصرعہ آبِ حیات کے کرم سے زندہ ہے:- "باندھی دُم لنگور میں لنگور کی گردن"۔ اس میں یہ لطف تھا کہ سید انشا دوپٹہ گلے میں ڈالے رہتے تھے جس کا ایک سرا آگے اور دوسرا سرا پیچھے پڑا رہتا تھا۔ فریقین نے ہجو نگاری میں قلم توڑ دئے۔ انشا کی زبان کی بیباکی محتاج بیان نہیں۔ بحر طویل میں ہجو لکھی جو آبِحیات میں نقل کی گئی ہے۔ مگر آزاد نے اس ہجو سے چند گالیاں مصلحتاً حذف کر دیں حالانکہ وہی زیادہ تر فتنہ و فساد کی باعث ہوئی تھیں۔ وہ فقرے یہ تھے:- غزل و مثنوی پوچ تو لے خارجی از نطفۂ مرجانہ ملعونہ بانو مردود مطرود مغضوب مشہورہ مخذولہ... اندر دہنت شاشۂ ام... شدہ اثبات کہ تو دشمن دینی و بود انسب و بر موقع و لایق کہ ترا لعن نمایند ہمہ اہل سادات و کسانیکہ بر روئے زمین اند... اندر دہنت شاشۂ عالم۔ اس سے بڑھ کر ستم یہ کہ مرزا سلیمان شکوہ سے کہہ دیا کہ مصحفی نے حضور پر چوٹیں کی ہیں۔ انشا شعرا دہلی کے خلاف شاہ عالم سے ایسی ہی شکایت کر کے کامیاب ہو چکے تھے۔ یہاں ان کے صاحبزادے پدر بزرگوار کی طرح دام تزویر میں آگئے اور مصحفی کی اُستادی سے منحرف ہو کر انشا کو اپنا کلام دکھانے لگے۔ جب پایہ مضبوط ہو گیا تو ایک انبوہ کثیر برات کے سامان سے ترتیب دیا اور عجیب و غریب ہجویں تیار کر کے لوگوں کو دیں۔ ایک ہاتھ میں گڈا اور ایک میں گڑیا دونوں کو لڑاتے تھے اور ہجو پڑھتے جاتے تھے جس کا ایک شعر یہ تھا:-

سوانگ نیا لایا ہے دیکھنا چرخِ کہن — لڑتے ہوئے آئے ہیں مصحفی و مصحفن

مصحفی کے شاگردوں نے شہدوں کا سوانگ بھرا اور ایک ہجو کہکر اس کے اشعار پڑھتے ہوئے انشا کی طرف چلے ارکین دربار نے کوتوال سے کہہ کر اس سوانگ کو رکوا دیا۔ آزاد کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مصحفی کے شاگردوں نے ایک سوانگ پہلے بھی نکالا تھا اور اُس کے جواب میں انشا کی طرف سے برات نکلی تھی، لیکن یہ روایت غلط ہے۔ مصحفی نے شہزادے کی خدمت میں

ایک قصیدہ "در معذرت اتہام انشا" پیش کیا تھا اس میں صاف تحریر ہے کہ:-

خفا ہو میری جو بیلے تو کر اسیر مجھے
دگر عدو کی - پنہا اس کو طوق اور زنجیر
مگر یہ بات میں بانی کر سوانگ کا بانی،
اگر میں ہوں تو مجھے دیجئے بدترین تعذیر
میں آپ فاقہ کش۔ اتنا مجھے کہاں مقدور
کہ فکر اور کروں کچھ بغیر آش شعیر
حصول یہ ہے کہ جب کو توال تک قضیہ
گیا ہو از سپئے تہدید شاعرانِ شریر
تو کوال ہی بس ان سے اب سمجھ لے گا
یہ دمبدم کی شکایت کی ہے عبث تحریر
میں اک فقیر غریب الوطن مسافر ہوں
رہے ہے آٹھ پہر جس کو قوت کی تدبیر
یہ افترا ہی بنایا ہوا سب انشا کا
کہ بزم و رزم میں ہے پائے تخت کا وہ مشیر
مزاج شاہ ہو یوں منحرف تو مجھ کو بھی
یہ چاہئے کہ کروں شکوہ اس کا پیشِ وزیر

آخری شعر میں "پیشِ وزیر" شکوہ کرنے کی نیت ظاہر کی گئی تھی وہ بھی پوری ہوئی - ایک قصیدہ طویل نواب آصف الدولہ بہادر کی شان میں تحریر کیا گیا اور حسب ذیل مخمس[1] کے ساتھ نواب وزیر کی بارگاہ میں پیش ہوا:- "مخمس در بیان متہم شدن بہجو گفتن شاہزادۂ عالمیان مرزا سلیمان شکوہ بہادر و انکار آں و استغاثہ نمودن بہ جناب نواب آصف الدولہ بہادر مغفور"

اول تو مدح گوئے پیمبر ہے مصحفی
پھر نغمہ سنج مدحتِ حیدر ہے مصحفی
مسکیں فقیر ہے نہ تونگر ہے مصحفی
مُلکِ سخن کا صاحبِ افسر ہے مصحفی
سب جانتے ہیں اسکو کہ بے شر ہے مصحفی

اس کا دہن ہے یہ کہ کرے شاہ کی ہجا
ہے سب یہ اس غریب پہ انشا کا افترا
بغض اپنا وہ نکالے ہے لے شہ کا ارتلا
کس واسطے کہ اس کا سخن اسپہ ہے رسا
فکر غزل میں لاکھوں سے بہتر ہے مصحفی

ہے جائے عدل آصفِ دوراں تری جناب
رکھتا ہے عرض تجھسے یہ مداحِ بوتراب
پہونچے یہ اپنی داد کو اور ہوئے کامیاب
تا سب کہیں کہ "ناجی" ہو یہ بات بیحساب
ہاجی نہیں کسی کا ثنا گر ہے مصحفی

آیا تھا لکھنؤ سمجھ کر یہ جائے امن
گوشہ میں با شکستہ پڑا تھا برائے امن
اخبار میں لکھا ہی کیا ماجرائے امن
بگڑی نظر پڑے ہے اب اسکو ہوائے امن
جو حکم ہو سو کہئے کہ مضطر ہے مصحفی

---

[1] یہ مخمس شاید آزاد کی نظر سے نہیں گزرا ورنہ ان کو معلوم ہو جاتا کہ انشا اور مصحفی کے جھگڑے نواب آصف الدولہ کے عہد میں ہوئے تھے جو سنہ ۱۲۱۲ھ میں راہی فردوس بریں ہوئے۔ اس مخمس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصحفی کو ادائے مطالب پر کسقدر قدرت حاصل تھی۔

ایسی ہی بدعتیں ہوئیں گر شہر میں عیاں　　اہلِ کمال کا ہے کو رہنے لگا یہاں
کیا واکریگا شعر و سخن میں کوئی زباں　　ہوئیں گی شاعروں کی یہ رسوائیاں جہاں
اس ماجرے سے سخت مکدر ہے مصحفی

شاعر جو آپ اس سے کرے ابتدائے ہجو　　لکھوا کے بھیجے شعر و غزل از برائے ہجو
کیا مدح یہ جواب میں لکھے بجائے ہجو　　اُس کی سُنے۔ نہ اپنی پر اس کو سنائے ہجو
کیا شاعری میں اتنا محقر ہے مصحفی

اس کا نہ کوئی یار۔ نہ یاور ہے اس جگہ　　نہ خویش و اقربا نہ برادر ہے اس جگہ
پر کیا کہے جو حادثہ اس پر ہے اس جگہ　　ہر سو اسی کی ہجو کا دفتر ہے اس جگہ
ناحق مغلظات کا مصدر ہے مصحفی

اس مخمس سے بھی ثابت ہے کہ ہجو بازی اور مغلظات نگاری کا آغاز انشا ہی نے کیا تھا جب مصحفی کے شاگردوں نے عیوض لینے کا ارادہ کیا تو انشا نے اراکین ریاست کو بھڑکا کر حریف کا سوانگ رکوا دیا۔ مصحفی شکستہ خاطر ہوئے اور شاہزادے کی سرکار سے قطع تعلق کرکے خانہ نشین ہو گئے۔

جاتا ہوں ترے در سے کہ توقیر نہیں یاں　　کچھ اس کے سوا اب مری تدبیر نہیں یاں
اے مصحفی بے لطف ہے اس شہر میں رہنا　　سچ ہے کہ کچھ انسان کی توقیر نہیں یاں

مگر انشا کی شعلہ بیانی سے شہر میں آگ لگ چکی تھی۔ ہجو طویل میں تخالف مذہبی کے طعنے تھے۔ شیخ زادے بگڑ گئے۔ گرم و منتظر کی جمعیت زبردست تھی وہ قابو سے باہر ہو گئے۔

کیا میں فرض کہ میں آپ اس سے درگزرا　　بھریگا مجھ سے کوئی گرم و منتظر کا ضمیر
ہزار شہدوں میں بیٹھیں ہزار جا پہ ملیں　　پھریں ہمیشہ لئے جمع ساتھ اپنے کثیر
نہ مانیں تیغِ سیاست نہ قہرِ سلطانی　　نہ سمجھیں قتل کا وعدہ نہ ضربتِ شمشیر

شہر میں بلوے کا خوف ہوا۔ نواب وزیر راجہ جھاؤلال[1] کے معاملہ میں زک اُٹھا چکے تھے اور اپنی بے اختیاری و مجبوری دیکھ کر زندگی سے عاجز تھے شہر میں کشت و خون اور مذہبی فساد سے بدنامی کا اندیشہ تھا لہذا شاعروں کے جھگڑے میں دخل دیا اور انشا کو لکھنؤ سے نکل جانیکا فرمان صادر کیا۔

---

[1] راجہ جھاؤلال پر زماں شاہ والی کابل سے سازش کرنے کا الزام تھا۔ نواب وزیر کی رائے کے خلاف ریذیڈنٹ نے زبردستی جھاؤلال کو جلاوطن کرایا اور وہ عظیم آباد میں جاکر آباد ہوئے۔ سرکار اودھ کے بڑے خیر خواہ وزیر تھے۔ ان کی جلاوطنی سے بمقتضائے غیرت نواب وزیر زندگی سے بیزار ہو گئے اور ایسے عارضۂ مہلک کی تلاش میں تھے جس کے علاج سے حکما عاجز ہوں حکیم شفائی خاں نے عرض کی کہ کھانا کھانے کے بعد نہانے اور اس کی مداومت کرنے سے استسقا ہو جاتا ہے جس کی کوئی دوا نہیں۔ نواب وزیر نے یہی عمل شروع کیا اور بعارضۂ استسقا ہلاک ہوئے

آزاد نے انشا کی ہنگامہ آرائی کا یہ انجام آبحیات میں شامل نہیں کیا مگر تذکرہ خازن الشعرا مولفہ سید میر نجان الہ آبادی میں ہے کہ "جس زمانے میں انشا اور مصحفی میں جھگڑا ہوا اور ہجو تک نوبت پہونچی تو نواب وزیر نے انشا کو لکھنؤ سے چلے جانے کا حکم دیا۔ وہ حیدر آباد گئے اور انشائے راہ سے ایک عریضہ شاہ محمد اجمل الہ آبادی کی خدمت میں بھیجا وہ اس میں یہ شعر بھی تھا

یونہی بے شغل ہمارا کوئی دل رہتا ہے ایک قاتل اسے ہر آن میں مل رہتا ہے

شاہ صاحب نے جواب میں تحریر فرمایا کہ "خوش باش رات پر، نہ راشد انشا اللہ خیر باشد" اور بعض اعمال خاندانی ان کو لکھ بھیجے:۔ عجب فتنہ فرو ہوا۔ منتظر اور گرم ٹھنڈے ہوئے۔ نواب آصف الدولہ کا انتقال ہو گیا تو انشا دوبارہ لکھنؤ آئے معلوم نہیں کہ حیدر آباد تک پہونچے بھی تھے یا نہیں۔ لکھنؤ سے ہجرت کی مدت چند ماہ سے زیادہ کی معلوم نہیں ہوتی۔ واپسی کے بعد اولاً مرزا سلیمان شکوہ کی خدمت میں رہے اس کے بعد علامہ تفضل حسین خاں کی سعی سے نواب سعادت علی خاں کے مصاحب ہو گئے یہ تعین نہیں کیا جا سکتا کہ مصحفی کس سنہ میں سلیمان شکوہ کے دربار سے الگ ہوئے اور انشا کب شہر میں واپس آئے مگر یہ واقعات غالباً سنہ ۱۲۱۱ھ اور سنہ ۱۲۱۲ھ کے ہیں۔ مرزا علی لطف نے سنہ ۱۲۱۵ھ میں تذکرہ گلشن ہند لکھا۔ اس میں مصحفی کی بابت اندراج ہے

"مصحفی تخلص غلام ہمدانی نام ساکن امروہے کا اپنی قوم کا شرافت ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ گفتگو اس کی بہت صاف صاف ہے۔ بندش نظم میں اس کے ایک سخنانی و شیرینی ہے اور مضمنے بندش میں اس کے بلندی اور رنگینی۔ ایک مدت شاہ عالم بادشاہ غازی کے عہد سلطنت میں مقیم شاہجہان آباد کا رہا ہے۔ بالفعل کہ سنہ ۱۲۱۵ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں ایک چودہ برس سے اوقات لکھنؤ میں بسر کرتا ہے۔ ضیق معاش تو وہاں ایک مدت سے نصیب اہل کمال ہے اسی طور پر درہم و برہم اس غریب کا بھی احوال ہے۔ دیوان اس عزیز کا بھرا ہوا نظم کے جمیع اقسام سے ہے۔"

اس تحریر سے یہ نتیجہ نکلا کہ مصحفی سنہ ۱۲۱۵ھ سے پہلے مرزا سلیمان شکوہ کے دربار سے جدا ہو چکے تھے۔ اُسی تذکرے میں انشا کی بابت تحریر ہو۔

"بالفعل کہ سنہ ۱۲۱۵ھ میں مرشدزادہ آفاق مرزا سلیمان شکوہ کے سایۂ عاطفت میں لکھنؤ کے اند۔ اوقات ساتھ قناعت اور شکستہ پائی کے بسر کرتے ہیں۔ کلام ان کا ظرافت اور خوش اختلاطی سے معمور ہے۔"

اس سے ثابت ہوا کہ انشا سنہ ۱۲۱۵ھ سے پہلے لکھنؤ واپس آ چکے تھے ــــ مصحفی نے تذکرہ ہندی گویان سنہ ۱۲۰۹ھ میں تمام کیا اس وقت تک انشا سے معرکہ آرائی نہیں ہوئی تھی اور مصحفی مرزا سلیمان شکوہ کے اُستاد تھے لیکن چشمک کا آغاز ہو گیا تھا کیونکہ میاں منتظر کے احوال میں مصحفی نے ارشاد کیا ہے کہ "وہ (منتظر) دشمنوں کی کلہ شکنی کے لئے میرے برابر موجود ہیں"۔ لہٰذا یہ کل قضیے یقیناً سنہ ۱۲۱۰ھ اور سنہ ۱۲۱۴ھ کے درمیان ہوئے۔ مصحفی کا ایک دیوان مرزا سلیمان شکوہ کے کتب خانہ میں سنہ ۱۲۱۲ھ میں داخل کیا گیا اور اسی دیوان میں "معذرت اتہام انشا" والا قصیدہ بھی شامل ہے اس سے ثابت ہوا کہ انشا سے ہجو بازی سنہ ۱۲۱۱ھ میں ہو چکی تھی۔ نواب آصف الدولہ کا انتقال ربیع الاول سنہ ۱۲۱۲ھ میں ہوا اور اس سے پہلے مصحفی شاہزادے کے دربار سے تعلق قطع کر چکے تھے۔ ۲۶ شعبان سنہ ۱۲۱۲ھ کو نواب سعادت علی خاں مسند نشین ریاست ہوئے ان کی تہنیت جلوس کے قصیدے

انشا و مصحفی دونوں نے لکھے اور انشا نے تاریخ جلوس بھی نظم کی۔ لہٰذا شعبان ۱۲۱۲ھ سے پہلے انشا لکھنؤ واپس آچکے تھے۔ گمان غالب ہے کہ ۱۲۱۱ھ کے وسط میں مصحفی نے مرزا سلیمان شکوہ کی ملازمت چھوڑی اور نواب آصف الدولہ کی وفات کے بعد جمادی الثانیہ یا رجب ۱۲۱۲ھ میں انشا لکھنؤ آئے۔ مرزا وزیر علی خاں کی چند روزہ نوابی تھی۔ افراتفری کے دور میں انشا کی عدولِ حکمی کی طرف توجہ نہ ہوئی اور مرزا سلیمان شکوہ نے اپنے دامنِ عاطفت میں پناہ دیدی۔ اس شرمناک معرکہ آرائی کی لوحِ مزار پر حکیم قدرت اللہ خاں قاسم کا کتبہ ذیل چشمِ عبرت سے دیکھو اور لاحول پڑھ کر اس قضیۂ نامرضیہ پر خاک ڈالو۔

"بمقام لکھنؤ مرشد زادۂ آفاق مرزا سلیمان شکوہ کے مشاعروں میں انشا میاں غلام ہمدانی مصحفی سے جو ایک شاعر مسکین نہاد اور بے پیچ ہیں اس قدر خلاف ہوئے کہ گفتگوئے رکیک سے گزر کر جو شایانِ شانِ ہنرمنداں نہ تھی ہجو گوئی تک نوبت آئی اور وہ بھی ایسی گندہ رعامیوں کی مجلس کے بھی قابل نہ تھی نہ کہ ملوک و سلاطین کی محفل بہشت آئین تک پہونچائی جائے۔ قلم حقایق رقم عرق انفعال سے غرق ہوتا ہے۔ اگر انسان سے کہ سراپا سہو و نسیان ہے خطا بھی ہوئی تو ہو گئی۔ کلام بشر کلام اللہ نہیں ہو کہ بے خطا ہو۔[1]

شعر اگر اعجاز باشد بے بلند و پست نیست
در ید بیضا ہمہ انگشتہا یکدست نیست

افلاس مرزا سلیمان شکوہ کی ملازمت سے مستعفی ہونے کے بعد پانچ چھ سال مصحفی پر سختی سے گزرے اور افلاس و تنگدستی نے ایسا عاجز کیا کہ لکھنؤ چھوڑنے کی نیت کرنے لگے

اب چلئے کہیں کو لکھنؤ سے
اے مصحفی یہاں بہت رہے ہم

مگر پاؤں میں بیڑیاں تھیں اس لئے شہر سے جنبش محال ہوگئی۔ مصحفی کے اہل و عیال کا کسی تذکرے میں مذکور نہیں ہے لیکن راقم آثم نے نو عمری میں سنا تھا کہ انھوں نے لکھنؤ میں عقد کر لیا تھا اور آزاد نے بھی لکھا ہے کہ بڑھاپے میں شادی کی تھی۔ عاشق مزاج شاعر حسن و جمال کے پرستار تھے۔ دلّی میں کہتے تھے

اے مصحفی چل تو بھی قطب کو کہ کہیں ہیں
آتا ہے بہت چھڑیوں میں میوات کا عالم

اور لکھنؤ آکر وردِ زباں تھا۔

نوچندی آئی دھوم سے چل تو بھی مصحفی
جاتی ہیں کربلا کو حسینوں کی ڈولیاں

آبحیات میں ہے کہ ایک سقنی کو دیکھ کر شوخی طبع کے منہ میں پانی بھر آیا:۔

پانی بھرے ہے یاروں یاں قرمزی دوشالہ
لنگی کی سج دکھا کر سقنی نے مار ڈالا

کاندھے پہ مشک لیکر جب قد کو خم کرے ہے
کافر کا نشۂ حسن ہو جائے ہے دوبالا

دریائے خوں میں کیونکر ہم نیم قد نہ ڈوبیں
لنگی کے رنگ سے جب واں تا کمر ہو لالا

انجام کار عشق کے دیوتا کے شکار اور زنجیر عقد میں گرفتار ہوئے۔ شادی کا نتیجہ دانشمندان فرنگ کے قول کے مطابق "ایک لمحہ کا عیش اور ایک مہینہ کی ندامت" ہے۔ ذمہ داریوں میں اضافہ ہوا اور خانگی ترددات سے پریشان رہتے تھے

[1] مجموعۂ نغز۔ احوال انشا صفحہ ۸۱ ۔ ترجمہ ملخصًا

نہ ہردم ہر گھڑی اس ذلت و خواری پہ روتا ہوں　　میں تھا آزاد دل اپنی گرفتاری پہ روتا ہوں
زمانہ سیم و زر سے مصحفی ایسا ہوا کب خالی　　نہ اپنی مفلسی - عالم کی ناداری پہ روتا ہوں

آزاد کا بیان ہے کہ وہ غزلیں بیچنے لگے - اچھے اچھے شعر لوگ مول لیجاتے - جن کو کوئی نہ پوچھتا وہ انکے حصہ میں آتے تھے اور وہی ان کے دیوانوں میں لکھے جاتے تھے - ایک مشاعرے میں جب شعروں کی بالکل تعریف نہ ہوئی تو انھوں نے تنگ ہوکر غزل زمین پر دے ماری اور کہا کہ "روئے فلاکت سیاہ جس کی بدولت کلام کی یہ نوبت پہونچی ہے کہ اب کوئی سنتا بھی نہیں" - فقیر امیر اس روایت کی صحت کا قایل نہیں - کہانی کی بنیاد ان کی غزلوں میں سست اشعار کی افراط پر رکھی گئی ہے - لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ کسی پرگو شاعر کے دیوان میں پانچ فیصدی سے زیادہ بلند اشعار نہیں مل سکتے ہیں

اے مصحفی مشکل ہے غزل ایک سی کہنا　　اک بیت کبھی اچھی بھی ہو جاتی ہو دن میں

علاوہ اس کے مصحفی دوسروں پر اعتراض کرتے تھے :-

ہے شاعروں کی اب کی زمانے کے یہ معاش　　پھرتے ہیں بیچتے ہوئے کالائے شاعری
لیتا نہیں جو مول کوئی مفت بھی اسے　　خفت اُٹھا کے آتے ہیں گھر وائے شاعری

اس لئے یقین نہیں آتا کہ اس اخلاقی جرم کے خود مرتکب ہوتے ہوں - البتہ اُن کے بعض نو آموز شاگردوں کے کلام میں ایسی غزلیں پائی جاتی تھیں جو بتدیوں پر زیب نہیں دیتیں اور اس سے شک ہوتا تھا کہ مصحفی اپنے بہترین اشعار شاگردوں کو عنایت کر دیتے ہیں اور خود ان کی غزلوں کے لئے سست شعروں کا انبار رہ جاتا ہے - مگر - ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

زمانۂ حال کے بعض اساتذہ بھی ازراہِ شفقت اپنے تصنیف کردہ اشعار شاگردوں کو عنایت فرماتے اور ان کی غزلوں میں شامل کر دیتے ہیں - کیا یہ رسم بد مصحفی ہی کی ایجاد تھی - جس کی بدولت اُن پر غزلیں بیچنے کا الزام لگایا گیا - اور کیا ذوق دہلوی نے اُنکی تقلید نہیں کی جس کے طفیل میں ظفر مرحوم کے ساڑھے تین دیوان اُستاد کی تصنیف قرار دیدئے گئے !!!

جب تک سلیمان شکوہ کی سرکار سے تعلق تھا کسی طرح گزر بسر ہوتی رہی - وہاں سے الگ ہوئے تو روزی کا کہیں ٹھکانا نہ تھا اس زمانہ میں لالہ کنور سین مضطر نے بہت خدمت کی اور انھیں کی عنایت سے اُستاد کے قدم لکھنؤ میں جمے رہے

مضطر اور مضطرب

کرپا دیال نام - کنور سین عرف - مضطر تخلص قوم کایستھ سکسینہ - دیوان چوڑامن داس کے پوتے تھے - جو دہلی میں "دیوان خزانۂ عامرہ و پیشکار پنج ہزار مغلیہ" تھے اور نواب سعادت خاں برہان الملک صوبہ دار اودھ کی رفاقت میں وطن چھوڑ کر لکھنؤ آئے اور یہیں "کٹرہ رائے" میں حویلیاں بنوا کر سکونت اختیار کرلی تھی زندگی بھر خدمات نیابت و پیشکاری وغیرہ پر ممتاز رہے - ان کے فرزندان بینی (یا دیبی) پرشاد اور بھوانی پرشاد بھی عمدہ معاش اور باجاہ و ثروت تھے - نواب آصف الدولہ کے عہد میں راجہ بھگوانداس کیہڑ کے صوبہ دار ہوئے تو بینی پرشاد اور بھوانی پرشاد راجہ کے دیوان کل تھے اور خدمات لائقہ انجام دیتے تھے - بینی پرشاد کے نورِ نظر کنور سین مضطر اور بھوانی پرشاد کے لختِ جگر

درگاپرشاد مضطرب بہ سبب موزونیِ طبع عالمِ مکتب نشینی سے شعر کہتے مگر بہ سبب شرم کے کسی کو نہ دکھاتے تھے۔ درگاپرشاد اپنے بھائی سے دو سال بڑے تھے۔ بقول مصحفی سلیقۂ شعر فہمی درست رکھتے تھے لیکن مضطر کی طبیعت میں اگرچہ روانی تھی مگر "بے اطلاعی طرزِ شعر و محاورۂ زبان" سے ناچار تھے۔ درگاپرشاد اور محمد عیسےٰ تنہا میں دوستی تھی۔ وہ ان دونوں بھائیوں کو اپنے اُستاد کی خدمت میں لائے اور حلقۂ شاگردی میں داخل کرایا چند مہینوں کی مشق میں شاعری کا رنگ یوں نکھرا۔

مُضطر:-

دشمن اپنا ہمیں تم سمجھو ہو اور غیر کو دوست | ہم نے بس دیکھ لیا آپ کی دانائی کو
رشک ہے رنگِ حنا پر کہ یہ کس پردے میں | بوسہ دیتی ہے ترے ہاتھوں کی زیبائی کو
اُسکے خالِ تہِ ابرو پہ مجھے آوے ہے رشک | لیکے بیٹھا ہے وہ کیا گوشۂ تنہائی کو
جو سُخن کے خفا ہو نام میرا | کس طرح وہ لے سلام میرا

مضطرب:-

بہت بے اختیاری کر چکے ہم | نہایت آہ و زاری کر چکے ہم
ترے وعدوں پہ ہے اب دم شماری | بس اب اختر شماری کر چکے ہم
اگر یاری یہی ہوتی ہے صاحب | تو بس آگے کو یاری کر چکے ہم

سنہ ۱۲۰۹ھ میں جب مصحفی نے تذکرۂ ہندی گویان تمام کیا۔ مضطر بیس برس کے تھے اور اسی سال اپنے والد کے ساتھ فوجداری محالات چاندپور وغیرہ پر سرفراز ہو کر بریلی کی طرف چلے گئے تھے۔ وہاں سے واپس آئے تو مصحفی کو شکستہ حال پایا۔ دامے درمے اعانت کی۔ درسیات فارسی کی پہلے تکمیل کر چکے تھے۔ فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اب علم عربی و حکمت کی تحصیل شروع کی۔ مصحفی تذکرہ عقد ثریا ۱۱۹۹ھ میں تمام کر چکے تھے مگر عقیدتمند شاگرد کا نام شعراء فارسی گویان کی فہرست میں بڑھایا اور اس کی ثنا و صفت میں قلم توڑ دیا۔

"اس سال کہ ۱۲۱۳ھ ہے اس کی عمر ۲۵ سال کی ہے۔ جوان خوشرو۔ خوشخو حلیم و سلیم۔ آراستہ مزاج۔ متواضع خلیق نیازمندان خادم علما و فضلا۔ طالب صادق فصحا و بلغا۔ دردمند درویش۔ خداپرست۔ خداترس ہے۔ باوجود مستیِ شباب کے سولہ سال کی عمر میں شراب اور دیگر منہیات سے تائب ہوا۔ افعال شنیعہ سے محترز رہتا ہے سیاق و انشاپردازی میں دستگاہ حاصل ہے...... بہ مقتضائے موزونیِ طبع و مناسبت مزاج کہ حسن و عشق کے ساتھ ہے کبھی کبھی شعر فارسی و ہندی مثل نالہ آہ کے دلِ پُر درد سے زبان قلم پر لاتا ہے اور دونوں کے مسودے فقیر کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اسکے ہندی اشعار تذکرۂ ہندی میں درج ہیں۔ فارسی کی طرف رغبت اور فقیر کے راسخ الاعتقاد دان یک رنگ سے ہے۔ اُس کا مذاق کلام سے ظاہر ہے"

مندرجۂ بالا عبارت جو نثر میں قصیدہ ہے مضطر کی خدمت گزاری کی بین شہادت ہے۔ لیکن اُستاد کے دردِ دل کا علاج اس سے نہ ہو سکتا تھا۔ ان کے قلب پر دوستان[1] زبانی کی کج ادائی کا صدمہ تھا۔ مشاعروں میں جانا۔ شاعروں اور امیروں سے ملنا ترک کر دیا۔ شعر گوئی چھوڑ کر گوشۂ عزلت و قناعت میں گمنام وار بسر کرنے لگے۔ شغل کے لئے معلمی کا سلسلہ تھا۔ میاں بشارت اللہ

[1] دیباچہ ریاض الفصحا۔

عرف محمد ذکریا ولد شیخ ہدایت اللہ قدوائی ساکن بسوہ کو قصاید عرفی پڑھائے۔ لالہ چنی لعل حریف ولد روشن لعل قوم کایستھ کو کتب فارسی کا درس دیا اور ان کے چھوٹے بھائی لالہ بینی پرشاد ظریف کو بھی علم سکھایا۔ شاگردوں کی غزلیات پر اصلاح بھی ناگوار تھی گرم و منتظر خدمت میں حاضر ہوتے اور دل بہلانے کی سعی کرتے تھے ایک دن شیخ محمد عیسیٰ تنہا نے عرض کی کہ ہم نیاز مندوں کی مشق کے لئے شعر خوانی کا جلسہ منعقد کیا جائے تو لطف سے خالی نہ ہوگا۔ اور حضور کی دلچسپی کے لئے بھی اولےٰ والنسب ہے عزیز شاگرد کی التماس منظور ہوئی اور طے ہوا کہ شہر کے باہر ایک ویرانے میں جو "روشن آرا" کے نام سے مشہور تھا جلسہ کیا جائے مشاعرے کا عام اعلان نہ ہو اور سوائے شاگردوں کے کوئی غیر بغیر اجازتِ خاص کے شریک نہ ہو۔ میاں نور الاسلام منتظر اور مرزا حیدر علی گرم ان مشاعروں کے شمع مجلس تھے۔ دوسرے شاگرد بھی حاضر ہوتے تھے۔ ان جلسوں کا آغاز ۱۲۱۴ھ یا ۱۲۱۵ھ میں ہوا تھا یعنی وہ وقت تھا جس کی حالت کی طرف مرزا علی لطف نے گلشن ہند میں اشارہ کیا ہے کہ "چودہ برس سے اوقات لکھنؤ میں بسر کرتا ہے ضیق معاش تو وہاں مدت سے نصیب اہل کمال ہے اسی طور پر درہم و برہم اس غریب کا بھی احوال ہے"۔ مشاعرے شروع ہوئے تو شاگرد بھی نئے ہونے لگے۔ میر اعلا علی[1] "مناقب گو" کے فرزند میر انس اسی دور میں شاگرد ہوئے اور روشن آرا کے ویرانے میں ایک لاجواب غزل پڑھی جس کے کم از کم دو شعروں سے اُستادی کی بو آتی ہے۔

ہووے سبھی طرح سے جو ناچار کیا کرے
گر موت بھی نہ آئے تو بیمار کیا کرے

دم توڑے گر نہ کنج قفس میں تڑپ تڑپ
صیاد کہہ تو مرغ گرفتار کیا کرے

میاں بندہ علی شفق بھی اسی وقت کے شاگرد تھے اور ذیل کے اشعار سے روشن آرا کا ویرانہ گونجا تھا

اس لاغری پہ رنج دہ دوستاں ہوں میں
ہر چند ہوں سبک پہ دلوں پر گراں ہوں میں

اے اضطراب دل نہ تصدق چمن کا کر
رہنے دے مجھ کو باغ میں بے آشیاں ہوں میں

بیخود کیا ہے عشق نے ایسا کہ ان دنوں
معلوم کچھ نہیں مجھے یارو کہاں ہوں میں

رہتا ہے دھیان اُس کا شب و روز اے شفق
جاتا ہوں جس مکان میں رہتا جہاں ہوں میں

اس عہد کے تلامذہ میں سے گوربخش ادیب کا نام ہرگز فراموش کرنے کے لائق نہیں۔ وہ ذات کے کہار۔ الکنی داس کے لڑکے اور مفتی گنج کے رہنے والے تھے۔ اپنے شوق سے لالہ بینی پرشاد ظریف کے ہم مکتب ہوئے اور فارسی کی درسیات کا سبق لیا طبیعت موزوں تھی۔ خود بخود شعر کہنے لگے۔ اور ظریف ہی کی سفارش سے مصحفی کے حلقۂ شاگردی میں داخل ہوئے دو چار غزلوں پر اصلاح کی نوبت آئی تھی کہ مشاعرے میں غزل پڑھی اور سننے والوں نے تحسین کی

[1] کاتب الحروف نے لکھنؤ میں بزمانۂ طالب علمی ایک شعر سنا تھا جو بہت دنوں یاد رہا

تو ڑ بت زاہد نے کیوں مسجد یہ بتخانہ کیا
تب تو اک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ کیا

تذکرہ ہندی گویاں میں مصحفی لکھتے ہیں کہ یہ شعر میر اعلا علی اعلا کا ہے جو انس کے والد تھے۔

از بسکہ تو کسی کا صنم یار کم ہوا — روٹھا تو جس سے تجھ سے وہ بیزار کم ہوا

ہم خاک میں ملے تری خاطر دلے میاں — ملنا ترا نہ غیر سے زنہار کم ہوا

اہلِ مجلس دنگ ہو گئے اور مشاعرے کے دو ایک روز بعد شیخ محمد عیسیٰ تنہا نے اُستاد سے عرض کی کہ "اے قبلہ! اگر اسی طرح آپ ہر کس و ناکس کو اپنی محفل قرب میں جگہ دیں گے تو ہم لوگ کہاں رہیں گے جنھوں نے خدمت شریف میں اس فن کے حصول کے لئے استخوان شکستہ کئے ہیں" عزیز شاگرد کی شکایت نے استاد کے دل پر اثر کیا اور کہار کی غزلوں پر اصلاح موقوف ہوئی ادیب کو معلوم ہوا کہ میاں محمد عیسیٰ نے ناحق نیش زنی کر کے اُستاد کا دل منحرف کر دیا ہے تو مایوس ہو کر دربار مصحفی میں حاضری چھوڑی اور اپنے آبائی پیشہ میں مشغول ہوئے۔ چند روز میں نواب سعادت علی خاں کے "تامجان بردار" ہو گئے اور اپنی قوم میں بہت عز و امتیاز پایا۔ نواب وزیر بہت مہربان تھے اور ان کے اشعار سنا کرتے تھے۔ نواب کی رحلت کے بعد غازی الدین حیدر سریر آرائے حکومت ہوئے تب بھی ادیب اپنے منصب پر بحال تھے۔ ایک قصیدہ لکھ کر خدمت نواب میں پیش کیا۔ پانچ اشرفی اور ایک دوشالہ انعام ملا۔ رنج حمالی سے سبکدوش کئے گئے اور خزانۂ عامرہ کی محرری پر مامور ہوئے۔

شاگردوں کی کہانیاں کہاں تک لکھی جائیں روشن آرا کے ویرانے میں معلوم نہیں کتنے شاعر پیدا ہو گئے۔ دو تین سال رونق رہی اور جلسہ روز بروز ترقی کرتا رہا۔ مثنوی "گلزار شہادت" اسی عہد ویرانی کی تصنیف ہے۔

ماہ رمضاں کی تیرھویں شب — کر نظم اسے میں کیا مرتب

تاریخ رقم ہوئی ہے اس کی — بارہ سے سولہ سن ہجری

میاں نور الاسلام کچھ عرصہ سے بیماری سل میں گرفتار تھے۔ اسی اثنا میں ان کو سفر آخرت درپیش ہوا۔ اُستاد کا شیشۂ دل چکنا چور ہو گیا "شکست عظیم بر دلِ من افتاد" روشن آرا کا چراغ گل ہوا اور صحبت مشاعرہ درہم برہم ہو گئی۔ مرزا حیدر علی گرم بھی لکھنؤ سے دل برداشتہ تھے کسی دوست کے ساتھ کالپی چلے گئے اور وہاں سے حیدر آباد جا کر شہرت عام حاصل کی۔ اُستاد کا داہنا بازو ٹوٹ گیا۔ لکھنؤ سے ہجرت کا عزم کرنے لگے

اے مصحفی سنتے ہیں وہاں قدر سخن ہے — بہتر تو ہے گر تو بھی کرے قصد دکن کا

اس افسردہ خاطری کے عالم میں بازار جا رہے تھے کہ راستہ میں نواب مرزا محمد تقی خاں بہادر ہوس سے ملاقات ہوئی وہ ہاتھی پر سوار تھے۔ جیسے ہی مصحفی کی صورت نظر آئی۔ ہاتھی روک کر احوال پرسی کی اور وعدہ قطعی لیا کہ وہ دوسرے روز ان سے ملاقات کریں۔

مرزا محمد تقی خاں ہوس

ہوس تخلص۔ مرزا محمد تقی خاں نام۔ عمائدین ریاست سے تھے۔ ان کے بزرگ ہمیشہ مقرب ملوک و سلاطین رہے، سلسلۂ نسب حضرت مالک اشتر تک پہونچتا تھا۔ خود زیور فضل و کمال سے آراستہ اور نہایت مہذب الاخلاق تھے۔ عہد شباب سے شاعری کا شوق تھا۔ پہلے اپنا کلام میر حسن مصنف "سحر البیان"

کو دکھاتے تھے جب وہ بزرگ سنہ ۱۲۱۱ھ میں غریقِ رحمت ہوئے، تو مصحفی کی شاگردی اختیار کی اور کئی سال تک اصلاح لیتے رہے۔ ہوس کی مثنوی لیلیٰ مجنوں اسوقت تک زندہ ہے۔ زمانہ حال کا ایک تبصرہ نگار لکھتا ہے[1] کہ "ان کی دردناک مثنوی کے آگے میر تقی کی دریائے عشق پانی پانی ہے۔ کلام کی تاثیر دلوں میں چٹکیاں لیتی ہے اور آنسوؤں کے دو چار موتی شاگردِ مصحفی کے اس یادگار پر چڑھا تا ہی پڑتے ہیں" ان کا دیوان اب کمیاب ہے مگر بعض اشعار بقول مصحفی "زبانزدِ صغار و کبار" میں مثلاً

اپنے مرنے کا مجھے غم نہیں پر یہ غم ہے — کون ہوگا ہدفِ تیرِ بلا میرے بعد
کیا عجب مدفنِ لیلیٰ سے جو نکلے یہ صدا — میرے مجنوں ترا کیا حال ہوا میرے بعد
جیتے جی قدر بشر کی نہیں ہوتی پیارے — یاد آئے گی تمھیں میری وفا میرے بعد
اب تو کرتے ہو بہت لطف و کرم تم لیکن — بھول جاتا نہ مجھے بہرِ خدا میرے بعد
تیز رکھیو سرِ ہر خار کو اے دشتِ جنوں — شاید آجائے کوئی آبلہ پا میرے بعد

مصحفی نے پانچ چھ برس سے عام مشاعروں کی شرکت ترک کر دی تھی۔ امیروں اور رئیسوں سے دور دور بھاگتے تھے اس لئے ہوس کو اُستاد کی پریشاں حالی کا حال معلوم نہ تھا۔ راہ گلی میں یکایک زیارت ہوئی تو دل باغ باغ ہو گیا اور جب دوسرے روز اُستاد نے حسب وعدہ دولت خانہ پر کرم فرمایا تو کمال توجہ و مہربانی سے پیش آئے اور شیریں زبانی سے تسخیر کا ایسا افسوں پڑھا کہ اُستاد نے عہدِ توکل و قناعت چھوڑ کر اسی دن سے ہوس کی رفاقت اختیار کر لی۔ یہ واقعہ سنہ ۱۲۱۸ھ[2] کا ہے مدت کے بعد اُستاد کی خدمت نصیب ہوئی تو اظہارِ مسرت کے لئے ایک عظیم الشان مشاعرہ منعقد کیا۔ معنی بندی کے طلسمات کا شوق شہر میں پیدا ہو گیا تھا۔ غزلیں قصیدہ بننے لگی تھیں۔ مضامین تازہ بتازہ کے لئے طرح مناسب تھی شہر کے بیشتر اہلِ کمال نے زبان و بیان کے جوہر دکھائے اور مرزا محمد علی بیگ[3] نے اس مشاعرے کی ایک کتاب بنائی۔ جو نایاب ہے۔ چند اشعار متفرق دستیاب ہو سکے وہ یادگار کے لئے صفحۂ قرطاس کی زینت کئے جاتے ہیں۔ واضح ہو کہ مصحفی کو یہ طرز شاعری پسند نہ تھا وہ فرماتے تھے:۔ الفاظ متین اور لغت لا لا کر — ناحق نہ بنا تو ریختے کو ہوّا

احمد[4] شاگرد جرات

خیالِ مہرِ تاباں گر ہے اسکے روئے روشن پر — تو پھر خطِ شعاعی کا گماں پڑتا ہے چلمن پر
سمجھ کر قاتلِ عالم محبت اُس سے کی ہم نے — وبالِ خونِ ناحق ہے ہمارا اپنی گردن پر

---

[1] "مثنویات" از امیر احمد علوی صفحہ ۴۸۔ [2] مصحفی سنہ ۱۲۲۱ھ میں لکھتے ہیں کہ "چار سال گزشتہ باشد کہ ملازم و رفیق ایشانم"۔ دیکھو دیباچہ ریاض الفصحا

[3] یہ محمد علی بیگ غالباً وہی کاتب ہیں جن کا لکھا ہوا تذکرہ ہندی کتب خانہ مشرقیہ بانکے پور میں محفوظ ہے اور خاتمہ پر حسب ذیل عبارت ہے:۔

"این تصنیف استادِ زمانہ بہ عہد خود خاقانی ثانی شیخ غلام ہمدانی نام و مصحفی تخلص دارد۔ کتبہ محمد علی بیگ خاکپائے خلائق بتاریخ دوم شہر صفر سنہ ۱۲۲۳ھ تمام باشد"۔ [4] شیخ محمد احمد۔ پہلے جرات کے شاگرد تھے۔ ان کے انتقال کے بعد سنہ ۱۲۲۵ھ سے مصحفی کے شاگرد ہوئے

ہوئے ہیں اسقدر ہم محوِ اُلفت اسکی الفت میں | کہ ہم کو دوستی کا ہے یقین ہر ایک دشمن پر
میں وہ بیکس ہوں جسکی گور پر غربت برستی ہے | کوئی جز بیکسی روتا نہیں ہے میرے مدفن پر

اعجاز[1] شاگرد ناسخ:-

نہ تھا ربطِ چمن مجھ کو خزاں آئی جو گلشن پر | صبا نے خاک اُڑائی خوب ہی میرے ہی مدفن پر
چراغِ دل ہمارا بجھ گیا یوں داغِ حرماں سے | کسی نے رکھدیا سرپوش جیسے شمعِ روشن پر
نہیں ڈستی جو مجھ کو وصل کی شب کاکلِ پیچاں | فسونِ عشق تو نے پڑھ دیا اعجاز ناگن پر

ذہین[2]۔ شاگرد میاں دلگیر مرحوم:-

کوئی نازو ادا پر غش ہے کوئی اُسکی چتون پر | ذہین اک ہم فقط پستے ہیں اسکے ڈومنی پن پر
ذرا پاسِ ادب دیکھو میں وقتِ ذبح گو تڑپا | نہ میرے خون کی چھینٹیں پڑیں پر اسکے دامن پر

عاشق (مرزا جوی برادر آغا تقی)

ہے جب سے کسوتِ خاکستری آراستہ تن پر | نہ منت کش ہوں دامن کا نہ بارِ جیب گردن پر
گلو لب تشنۂ آبِ دمِ شمشیرِ قاتل ہے | ہے تسکین عطش موقوف اپنی آب آہن پر
ہیں کب معشوق سنتے عاشقوں کی نالہ و زاری | نہ دیکھا گوشِ گل ہوتے کبھی بلبل کے شیون پر
کہاں بھرتا ہے نظارے سے دل عاشق مزاجوں کا | نہیں بلبل کو سیری گو بٹھا دیں گل کے خرمن پر

فرخ۔ شاگرد ناسخ:-

مرے آگے نہ اے قاتل علم کر تیغ دشمن پر | مجھی کو قتل کر تو خون میرا میری گردن پر
عجب کیا ہو برنگِ سرمہ ہوں گر استخواں پسکر | ز بس بار گنہ ہے ہم سیہ کاروں کی گردن پر
کوئی سروِ رواں شاید پئے گلگشت آتا ہے | سحر سے بیٹھے ہیں مرغِ سحر دیوارِ گلشن پر
نہ ہوگی راہِ الفت طے یہ سر ہے جب تلک تن پر | کریں ہوں ناتواں منزل ہو دور اور بوجھ گردن پر
نظر یوں میکدے میں شب کو آیا فرخِ میکش | کہ زیرِ سر رکھے اک خشتِ خم سوتا ہے گلخن پر

فغاں (شریکِ مشاعرہ تھے نام معلوم نہیں)

کمر باندھی ہو کس گل چہرہ نے تاراجِ گلشن پر | کہ فق ہے رنگِ گل بلبل طپاں ہے اپنے مدفن پر
سبک روح اس جہاں سے لیچلی عریاں تنی ہم کو | غبارِ معصیت ہرگز نہ بیٹھا اپنے دامن پر

---

[1] نواب اصغر علی خاں نام تھا۔ نواب شجاع الدولہ مرحوم کے پوتے تھے۔ [2] لالہ چھنو لعل طرب سلام اور مرثیے کہتے۔ اپنا تخلص بعد کو "دلگیر" مشہور کیا تھا۔ یہ ذہین بھی کایستھ تھے۔ نام معلوم نہیں۔

نگہ سفاک عالم کیوں نہ ہو اُس شوخ پرفن کی
تفوق جس کے ابرو کو فغاں ہے تیغِ آہن پر

محسنؔ - برادر زادہ خواجہ حسن کمہاری

لگا مت بے تامل تیغ ظالم میری گردن پر
رہیں گی حشر تک چھینٹیں لہو کی تیرے دامن پر

زبس روزِ ازل سے آتشِ ہجراں میں جلتا تھا
بجائے ابرِ رحمت آگ برسی اپنے خرمن پر

ہوا ہے تازہ محسنؔ داغِ سودا موسمِ گل میں
گریباں پر کبھی دستِ جنوں ہے گاہ دامن پر

ناسخؔ :-
نہیں ہے سبزۂ خطِ عارضِ محبوب پرفن پر
ہوئے ہیں جمع پروانے یہ آکر شمعِ روشن پر

میں وہ شوریدہ سر دیوانہ تھا جو بعد مردن بھی
چڑھا جاتے ہیں پتھر لوگ آکر میرے مدفن پر

نہیں اس خوف سے ہوتا میں قتلِ غیر پر راضی
نہ لگ جائے کہیں اس کا لہو قاتل کے دامن پر

جہاں میں تیرہ دل جو ہیں وہی بے رنج رہتے ہیں
کہ نازل ہوتی ہے آفت ہوا کی شمعِ روشن پر

اگر ہوتا ہے اک دانہ بھی اس میں میری قسمت کا
فلک بجلی گرا دیتا ہے ناسخؔ سارے خرمن پر

آتشؔ :-
بہار آئی ہوا عالم گل و نسرین و سوسن پر
جوانانِ چمن نازاں ہیں اپنے اپنے جوبن پر

دکھائی دخترِ رز نے یہ میخانے میں نیرنگی
دُمِ طاؤس کا عالم ہوا مینا کی گردن پر

نقاب اُلٹے جو تو رخسار آتش رنگ سے اپنے
پر پروانہ سے آرے چلیں شمعوں کی گردن پر

نہ دیکھا سخت طینت کو کبھی سرسبز دنیا میں
شگوفہ پھوٹنا ممکن نہیں دیوارِ آہن پر

جو کامل ہیں نہیں اندیشہ آتشؔ ان کو بدبیں کا
دہانِ زخم کاری خندہ زن ہیں چشمِ سوزن پر

مصحفیؔ :-
زباں کس نالہ کش کی آج ہے سرگرم شیون پر
گدازِ موم کا عالم نظر آتا ہے آہن پر

دلِ جلاد ہے سختی میں غالب سنگ و آہن پر
کیا کرتا ہے خنجر تیز میرے سنگِ مدفن پر

مصور نے غضب کھینچا ہے نقشہ انکی آنکھوں کا
حیا قربان شوخی پر - ادا صدقے ہے چتون پر

عجب کیا کام بیقدروں سے نکلے گر امیروں کا
رفوئے شال ہے موقوف اک ادھی کی سوزن پر

جواہر شوق سے پہنو رہے پر دھیان اتنا بھی
نہ ہیرا پیس کر کھائے کوئی ہیرے کی سمرن پر

ہو چاہا دل نے وہ پہنے نہ چاہا واہ ری ہمت
رہیگا حشر تک خونِ تمنا اپنی گردن پر

نشاں یہ دل جلوں کا ہے ادھر کو جب صبا آئے
کئی لالے کے گل پائے ترے عاشق کے مدفن پر

اسیری گر مقدر ہے تو ہرگز غم نہ کھا اس کا
گراں لگتا نہیں قمری کو اپنا طوق گردن پر

اسی طرح کا ایک معنی خیز شعر فقیر امیر کو یاد ہے مگر شاعر کا نام معلوم نہیں :-

صنم خانے کی اگلی صحبتیں دلکش جو یاد آئیں
بہت رویا میں رات آوازِ ناقوس برہمن پر

دیوان پنجم و ششم

مصحفی نے ۱۲۱۷ھ سے میر تقی ہوس کی رفاقت اختیار کی اور دس بارہ برس انکے سایۂ عاطفت میں نسبتاً آرام و آسایش سے بسر کئے اور ایک مختصر مثنوی "مرغنامہ مرزا تقی" اسی زمانے میں تصنیف کی روشن آرا کے مشاعروں سے دیوان چہارم تمام ہو کر پنجم شروع ہو چکا تھا۔ دو تین سال میں وہ بھی مرتب ہو گیا اور چھٹے دیوان کی بسم اللہ ہوئی اُردو شاعری کا رنگ اب بالکل تبدیل ہو گیا تھا۔ قدیم اساتذہ کی سادگی متروک اور معنی بندی کا عام شوق تھا مصحفی نے بھی "زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز" پر عمل کیا۔ دیوان ششم کا مطلع اول ہے:۔

تھا جوش طبیعت میں نہ دیوان ششم کا — خود وصل جدا ہو گیا خشتِ سرِ خم کا

یہ دیوان ۱۲۲۴ھ میں تمام ہوا اور اس کی تکمیل کے وقت اُستاد نے ایک طویل دیباچہ لکھا جس میں اپنے طرز شاعری میں تبدیلی کی وجہ بیان کی۔ اس دیباچہ کا آخری حصہ بجنسہ نقل کیا جاتا ہے:۔

"درایامیکہ فقیر بہ سبب کساد بازاری متاع گرانبہائے کلام فارسی بہ مقتضائے رواج زمانہ خود را مصروف بہ این شغل بے نظیر ریختہ داشت عالمے از حسد جامہ در خم نیل زدند۔ و جمع کور باطن منغص شدہ گاہے کہ پنجہ افگندند پیش نہ بردند۔ پس از انقضائے ایام چند چوں سلسلۂ موزونیت دراز کشید حصۂ نعمت ایوان این خوان بہ شیخ ناسخ کہ یکے از دوستان محمد عیسےٰ تنہاست و بہ فقیر هم رسوخ از تہ دل دارد مقسوم گشت۔ تخلص خود را اسم بامسمّی انگاشتہ بر طرز ریختہ گویان سادہ کلام در عرصۂ قلیل خط نسخ کشید۔ و از تعاقبش بر قدم او خواجہ حیدر علی آتش هم در رسیدہ سمند تیز گام خیال را از دائرۂ چرخ اثیر بیروں برد و ہمچنیں ثالث ایشان طالبعلم عیسیٰ تخلص تیغ او و زبان نظم و نثر ذوالفقار علی از نیام بر آوردہ سر ادعای باطل آہنگ را بریدن داد تا اینکہ معاندین و دعوے داران بسوراخ موش خزیدند و از خجالت دیگر قدم در مجلس مشاعرہ نہ نہادند و از گفتہ سست خود پشیمان شدہ جز خاموشی چارہ نہ دیدند۔ اگرچہ عاصی هم از گروہ سادہ گویان بود لیکن بہ فیض صحبت بزرگان در فن فارسی مہارت کلی داشت بلکہ ریختہ خود را مہمان طفیلی فارسی میدانست در مجلسہائے مشاعرہ از روئے این صاحبان کہ اقرار اُستادی من بنفس امر دارند خجالتے نہ کشید بلکہ غزلیات این دیوان ششم را اکثرے بہ رویۂ ایشان گفتہ۔ از حسن قبول محروم مباد۔ تولد من در احمد شاہی است۔ تا الیوم عمرم از شصت متجاوز خواہد بود۔ ۱۲۲۴ھ در بلدۂ لکھنؤ تحریر یافتہ"

جدید شاگرد

ناسخ مصحفی کے شاگرد نہ تھے لیکن محمد عیسیٰ تنہا سے ابتدا میں مشورہ کیا تھا اور وہ مصحفی کے شاگردانِ رشید میں سے تھے۔ "ریاض الفصحا" میں ایک جگہ مرقوم ہو کہ "شیخ امام بخش ناسخ در معنی بندی تازہ علم اُستادی برافراشتہ اند و بہ فقیر هم از تہ دل دوستی دارند"۔ مندرجہ بالا اقتباس میں ہو کہ "اقرار اُستادی من بنفس لام دارند" مگر شیخ احمد حسین سحر لکھنوی نے جو اکثر ناسخ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے تذکرہ بہارِ بے خزاں میں صراحتاً لکھا ہے کہ "ناسخ تلمیذ مصحفی سحر بیان اُستاد نزاکت بندان زمان بود"، "میاں طالب علی عیشی میر انشا اللہ خاں اور مرزا قتیل کے فیضِ صحبت سے بہرہ اندوز ہوئے تھے لیکن انکی شاگردی

۱ ریاض الفصحا صفحہ ۳۲ - تذکرہ "اثر"

سے منکر تھے۔ مصحفی سے بہت اتحاد تھا وہ اکثر عیشی کے مکان پر جاتے تھے[1] عیشی کا دیوان اردو مولانا حسرت موہانی کے پاس موجود ہے اور اس میں مصحفی کو اُستاد لکھا ہے اگرچہ ریاض الفصحا میں مصحفی نے عیشی کو اپنا شاگرد نہیں بیان کیا۔

خواجہ حیدر علی آتش اس دور کے شاگردوں میں سب سے زیادہ نامور تھے۔ مشہور ہے کہ ایک مشاعرے میں طرح تھی "دہن بگڑا، کفن بگڑا" آتش نے غزل لکھ کر اُستاد کو سنائی اور جب یہ شعر پڑھا کہ:-

لگے منھ بھی چڑھانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجیے دہن بگڑا

نشہ کے سرور میں کہنے لگے کہ اس ردیف اور قافیہ میں کوئی یہ شعر نکالے تو کلیجہ نکل پڑتا ہے۔ انھوں نے ہنسکر کہا کہ "ہاں میاں سچ کہتے ہو" بعد اس کے شاگردوں میں سے ایک نو مشق لڑکے کی غزل میں یہ شعر بڑھا دیا کہ:-

نہ ہو محسوس جو شے کس طرح نقشے میں ٹھیک اُترے
شبیہ یار کھچوا کر کمر بگڑی دہن بگڑا

جس وقت لڑکے نے مشاعرے میں یہ شعر پڑھا۔ آتش مصحفی کے قریب آگئے اور اپنی غزل ہاتھ سے پھینک کر کہا کہ آپ ہمارے کلیجے پر چھریاں مارتے ہیں۔ اس لڑکے کا منھ ہے کہ ایسا شعر کہے۔ آتش کی بابت مصحفی کی پیشین گوئی تھی کہ "اگر اس کی عمر نے وفا کی اور چند سال اسی طرز پر رہا تو بے نظیران روزگار سے ہوگا" یہ بشارت پوری ہوئی اور اُستاد کی حیات ہی میں آتش کی شیریں بیانی کے جھنڈے گڑ گئے۔ یہی مبارک الفاظ اُستاد نے شیخ فضل حق عرف غلام مینا ساحر کاکوروی کے حق میں بھی ارشاد کئے تھے۔ وہ فارسی زبان میں شاعری کرتے تھے اور اپنے طرز میں یکتا ہوئے — میر مظفر حسین ضمیرؔ۔ فنِ مرثیہ گوئی میں میر خلیق کے مماثل و مقابل اسی دور کے شاگردانِ مصحفی میں داخل ہیں۔ جوان سخنی تھے۔ ۳۰ سال کی عمر تھی۔ شیخ محمد بخش واجد ساکن قریۂ ایٹھی کے ہمراہ خدمت میں حاضر ہوئے۔ شیرنی تقسیم کی اور حلقۂ شاگرداں میں شامل ہوئے۔ جب مشق ہو گئی تو سلام کہنے لگے اور اس میں نام پیدا کیا۔ لکھنؤ میں خلیق و ضمیر کی مدت تک دھوم رہی اور یہ دونوں بزرگ مصحفی کے شاگرد تھے۔ ان کے بعد خلیق کے بلند اقبال صاحبزادے میر انیس اور ضمیر کے باکمال شاگرد مرزا دبیر مرثیہ گوئی کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب کی طرح چمکے مگر سرچشمۂ نور وہی اُستاد الاساتذہ مصحفی کی ذات جامع الکمالات تھی۔ — شیخ پیر بخش مسرور ولد حکیم حیات اللہ متوطن قصبۂ کاکوری نو عمری سے شعر کہتے تھے۔ سنہ ۱۲۱۲ھ میں مصحفی کے شاگرد ہوئے اور بارہ برس کی مشق میں اس درجہ کو پہنچے کہ بقول مصحفی "ان کی شاعری مردوں کے دل زندہ کرتی اور عشقبازوں کے زخمِ جگر پر نمک چھڑکتی ہے،" انھوں نے شعرائے ہمعصر کا ایک تذکرہ "بیاض صبح ازل" نام لکھا ہے جس کی زیارت راقم الحروف کو ایک بار نصیب ہوئی تھی۔ ان کا دیوان مکمل مولانا حسرت موہانی کے کتب خانہ میں ہے منور خاں غافل ساکن فیض آباد کا نام اس فہرست سے حذف نہیں کیا جا سکتا۔ وہ روزانہ اُستاد کی خدمت میں حاضر ہوتے اور استفادہ کرتے تھے۔ مصحفی لکھتے ہیں کہ "سلاست کلامش مثل سلک گوہر است"۔ ان کی ایک غزل ہنوز زبانوں پر ہے:-

آکے سجادہ نشیں قیس ہوا میرے بعد
نہ رہی دشت میں خالی مری جا میرے بعد

---

[1] ریاض الفصحا صفحہ ۲۰۱ تذکرہ "گوہر"

گرم بازاریٔ اُلفت ہے مجھی سے ورنہ — کوئی لینے کا نہیں نامِ وفا میرے بعد
سُن کے مرنے کی خبر یار مرے گھر آیا — یعنی مقبول ہوئی میری دعا میرے بعد
ذبح کر کے مجھے نادم یہ ہوا وہ قاتل — ہاتھ میں پھر کبھی خنجر نہ لیا میرے بعد
شرطِ یاری یہی ہوتی ہے کہ تو نے غافل — بھول کر بھی نہ کبھی یاد کیا میرے بعد

دورِ سابق کے شاگردوں میں سے منتظر پہلے ہی راہیِ عدم ہو چکے تھے۔ گرم دکن میں بازارِ شاعری گرم کئے تھے۔ محمد عیسیٰ تنہا تھے وہ بھی ملک الموت کے شکار ہوئے۔

اب جی کے کیا کروں گا میں تنہا کہ مصحفی — تھا جن سے لطفِ زیست وہ سب یار مر گئے

شاگردانِ جدید کے لئے میدان صاف تھا۔ آتش، ضمیر، مسرور اور غافل درجۂ اُستادی کو پہونچے اور مصحفی کا نام روشن کیا۔

مشاہیر اس دور کے مشاہیر میں سے فخر الدین احمد خاں عرف مرزا جعفر کا تذکرہ بھی لازم ہے جو اکثر مصحفی کی مالی امداد کیا کرتے تھے۔ وہ زیورِ فضل و کمال سے آراستہ۔ علم ریاضی میں بے نظیر تھے۔ اُنکے صاحبزادے قمر الدین احمد خاں عرف مرزا حاجی (جن کا اسم گرامی رقعاتِ مرزا قتیل میں کئی جگہ آیا ہے) مجلس مشاعرہ منعقد کرتے تو وہ بھی شرکت فرماتے تھے اور اول سے آخر تک سب شعرا کا کلام سنتے تھے۔ سنہ ۱۲۳۰ھ میں راہیِ عدم ہوئے۔ مصحفی نے تاریخ کہی:

میرزا جعفر از جہانِ چو گزشت — عالمے سینہ را بہ حسرت کوفت
مصحفی بہت سالِ تاریخش — ہاتفے گفت کوس رحلت کوفت

مرزا حاجی۔ قتیل کے فارسی میں شاگرد تھے مگر اُردو میں مصحفی سے مشورہ کرتے تھے۔۔۔ مرزا سیف علی خاں بہادر شگفتہ خلف نواب شجاع الدولہ مرحوم جامع الکمالات تھے۔ فنِ موسیقی۔ تیراندازی۔ شناوری۔ تصویرکشی۔ خطِ نسخ وغیرہ میں اُستادِ وقت تھے۔ نوعمری سے غزلگوئی کا شوق تھا اور ایک دیوان ضخیم تیار کر لیا تھا۔ اتفاقات قضا و قدر سے محل میں آگ لگی اور سارا دیوان مع اثاث البیت کے جل گیا۔ افسردہ دل ہوئے اور کئی سال فکر شعر نہ کی۔ آخر اس ناسور کی شفائیاں ہوئی کہ ۶۰ سال کی عمر میں اسی ضخامت کا دوسرا دیوان تیار کر لیا۔ جس کے مشورے میں مصحفی اول سے آخر تک شریک تھے

باغباں جبکہ نظر پھولوں پہ کرتا گزرا — دل پہ بلبل کے سبھی طرح کا کھٹکا گزرا
بگولا خاک سے اُٹھا جو خاکسارِ وفا کی — وہی بلند ہوا گنبدِ مزار ہوا
دن کو تو خیر جا جہاں تم وہاں رہے — جب رات کو کہیں رہے پھر ہم کہاں رہے

ریاض الفصحا مصحفی نے ۴۸ سال کی عمر میں شعرائے اردو کا پہلا تذکرہ تمام کیا تھا۔ ۶۰ برس کے سن میں دوسرے تذکرے کا آغاز کیا۔ بارہ برس میں لکھنؤ کی مردم شماری اس قدر بڑھ گئی تھی کہ "آبادی شاہجہاں آباد اس کے پاسنگ پر بھی نہ تھی" اور یہاں کی خاکِ پاک نے سیکڑوں نئے شاعر بنا دئے تھے۔ مصحفی کے بعض تلامذہ درجۂ اُستادی کو پہونچے تھے

مگر تذکرۂ اول میں ان کا نام بھی نہ تھا۔ لالہ چینی لال حریف نے اصرار کیا کہ تذکرے کا دوسرا حصہ مرتب کیا جائے اور خود ہی اس کا تاریخی نام ریاض الفصحا تجویز کیا۔ مصحفی نے شاگرد کے اصرار سے سنہ ۱۲۲۱ھ میں الفاظ ذیل سے آغاز کیا تھا:۔ "اے قلم از کار رفتہ بیا در معرکۂ مردان کہ ایں رزم بزم آخر است"۔ اور جن شعراء عصر کا احوال تذکرۂ فارسی یا تذکرۂ ہندی گویاں میں نہ تھا اس مجموعے میں درج کیا۔ بعض کے احوال میں ضروری ترمیمات کیں۔ کتاب کی ترتیب آہستہ آہستہ پندرہ سال تک ہوتی رہی اور اس میعاد میں جو ہونہار شاگرد جدید اضافہ ہوئے انکے اسما بھی شامل ہوتے گئے۔ سنہ ۱۲۳۶ھ میں تذکرے کا اختتام ہوا اور اُس کے بعد کوئی اضافہ نہیں کیا گیا۔ مرزا رمضان بیگ طپاںؔ[1] نے جو سنہ ۱۲۲۸ھ میں شاگرد ہوئے تھے اور بقول مصحفی سات سال کی مشق کے بعد "ازہمہ سر برآوردہ" ہو گئے تھے اختتام تذکرہ کی تاریخ کہی:۔

طپاں چوں از پئے تاریخ ایں جلد — در معنی بسلکِ نظم سفتہ
نمودہ قطع پائے ہند ناگہ — طلسماتِ خیالِ ہند گفتہ

راقم آثم کو اسوقت خیال آیا کہ طپاں نے ہند کے پاؤں کا کمر یعنی "چار" کا تخرجہ کر کے اختتام تذکرہ کی تاریخ کہی۔ اگر "پاؤں" قطع نہ کئے جاتے تو شاید یہی اُستاد کی اختتام حیات کی تاریخ ہو جاتی۔

مرزا کلب علی خاں

یہ صحیح طور پر معلوم نہیں کہ طپاں سے آغاز تلمذ کے وقت مصحفی موتس کی سرکار میں ملازم تھے یا وہاں سے قطع تعلق کر چکے تھے۔ نواب سعادت علی خاں کا سنہ ۱۲۲۹ھ میں انتقال ہوا اور تذکرۂ ریاض الفصحا سے ثابت ہے کہ مصحفی نواب وزیر مرحوم کی حیات ہی میں نواب مہدی علی خاں کے ملازم ہو گئے تھے۔ اس کے بعد نواب کلب علی خاں کی سرکار سے وابستہ ہوئے اور بعد ازاں دوبارہ مہدی کی خدمت میں حاضر ہوئے بہر حال وہ سنہ ۱۲۳۳ھ میں مرزا کلب علی خاں[2] کے نمک خوار تھے۔ ان کی شان میں ایک بلیغ قصیدہ لکھا تھا اور انکی فرمائش سے حکیم شفائی خاں ارشد کے رحلت کی (جو دربار اودھ کے نامور طبیب تھے) حسب ذیل تاریخ نظم کی تھی:۔

اجل آئی جو یکبار شفائی خاں کو — علم میں تھا جو حکیمان جہاں پر فائق
حکم سے کلب علی خاں بہادر کے لکھی — اس کے مرنے کی میں تاریخ بہ وضع لائق
سو وہ اے مصحفی یہ مصرعہ ہے بے کم و بیش — حیف صد حیف موا آہ حکیم حاذق
۱۲۳۲

[1] طپاں قصبۂ آسیون کے رہنے والے قوم کے مغل تھے۔ ان کے اجداد سلاطین ماضیہ کے وقت میں قصبۂ مذکور کے چکلہ دار تھے۔ وہ اٹھارہ سال کی عمر میں تلاش معاش کے لئے لکھنؤ آئے اور مصحفی کے شاگرد ہوئے۔ مسرور کاکوروی سنہ ۱۲۳۹ھ میں لکھتے ہیں کہ "وہ اُستاد کے محبوب شاگردوں میں ہیں۔ جس مشاعرے میں جاتے ہیں دھوم مچ جاتی ہے"۔

یہ فیضِ مصحفی ہے انصاف کیجئے گر — اعزاز ہے طپاں کا جو مجلس سخن میں

[2] وہ نواب سعادت علی خاں کے فرزندوں میں سے تھے۔

مجلس مناثرہ

مصحفی کی کنارہ کشی کے بعد شیخ مغل فانی کا کلب علی خاں کی سرکار میں در خور ہوا۔ وہ شہر لکھنؤ میں مجلس مناثرہ کے بانی تھے ہندو اور مسلمان شرفا مجلس میں حاضر ہوتے تھے اور اُردو یا فارسی نثر کے تحریری مضامین سناتے تھے اتفاق سے ایک روز مصحفی کا بھی وہاں گزر ہوا۔ دوکان تنبولی کی تعریف میں ایک نثر ظہوری کے طرز پر لکھی تھی وہ ارباب محفل کو سنائی۔ رفتہ رفتہ یہ مناثرہ مشاعرہ ہوگیا مصحفی کے شاگردوں کا انبوہ وہاں جمع ہونے لگا۔ نثر نویسی بالائے طاق ہوئی اور غزل خوانی ہونے لگی چند سال کے بعد مصحفی نے اس مجلس میں جانا ترک کردیا مگر انکے شاگرد رشید منور خاں غافل اور بعض دیگر تلامذہ شریک محفل ہوتے رہے اور یہ صحبت کئی سال تک جاری رہی۔ اس زمانے میں بہت سے نئے شاگرد ہوگئے تھے جن میں سے شعور وظہور درجۂ اُستادی کو پہونچے۔

شعور وظہور

منشی ظہور محمد ظہور اور شیخ عبدالرؤف شعور ساکنان بلگرام۔ برادر عمزاد تھے۔ سنہ ۱۲۳۰ھ میں یکے بعد دیگر دونوں بھائی مصحفی کے شاگرد ہوئے۔ دونوں طبیعت میں روانی رکھتے تھے اور عاشقانہ کلام خوب ہوتا تھا شعور کی بابت مصحفی کا قول تھا کہ "اگر چندے مشق نمود دریں فن از بے نظیرانِ روزگار خواہد بود" انکے دو دیوان راقم کی نظر سے گزرے ہیں قصبۂ کاکوری میں محمد رضا صبر ان کے شاگرد رشید تھے جن کے متعدد تلامذہ صاحب دیوان ہوئے۔ شعور اور صبر کے مکمل دواوین کتب خانۂ انوری تکیہ شریف کاکوری میں موجود ہیں۔ خدا بخش خاں فرد غازی پور زمانیہ کے رہنے والے ۲۰ سال کی عمر میں مصحفی کی زیارت کے لئے غازیپور سے لکھنؤ آئے اور رنج غربت اُٹھا کر اس چشمۂ فیض سے سیراب ہوئے میر صدرالدین صدر آتش کے شاگرد تھے۔ اپنے مکان پر مشاعرے منعقد کرتے اور مصحفی کو میر مجلس بناتے تھے مگر چار جلسوں کی نوبت آئی تھی کہ صدر کو سفر پیش آیا اور یہ سلسلہ موقوف ہوگیا۔

مہدی

نواب جلال الدولہ مہدی علی خاں بہادر شجاعت جنگ مہدی تخلص نواب سعادت علی خاں کے صاحبزادے فنون دانشمندی میں بے نظیر، علم تیر اندازی میں اُستاد۔ اشہب خیال کو میدانِ فصاحت و بلاغت میں بھی جولان کرتے تھے اور اس فن کے صاحب کمال ان کی سرکار میں ملازم رہتے تھے۔ نواب وزیر مرحوم کی حیات میں وہ مصحفی کے شاگرد ہوئے تھے اور اسی وقت سے اُستاد کے خدمت گزار تھے۔ والد نامدار کی وفات کے بعد ان کی توجہ ارباب ترنم و رقص کی طرف زیادہ مایل ہوئی مجلس نشاط رشک گلستان ارم بنی۔ سادہ رویان گلعذار اور سرو قدان لالہ رخسار کے گلدستے حاضر رہتے تھے لیکن بہ مقتضائے موزونی طبع کبھی کبھی غزل گوئی کی بھی تکلیف فرماتے اور مصحفی سے اصلاح لیتے تھے۔ مندرجۂ ذیل اشعار اسی ۲۵ سالہ مستِ شباب کی یادگار ہیں:۔

کہتے ہو اس کو آنا ہم تک محال کیا ہے
دیکھو تو جا کے صاحب مہدی کا حال کیا ہے

عشق میں ہم نے یہ کمائی کی
دل دیا غم سے آشنائی کی

دلِ بیتاب ایسا دھڑکے ہے
جیسے بلبل قفس میں پھڑکے ہے

مصحفی اسی باغ و بہار سرکار سے تعلق رکھتے تھے کہ تذکرہ ریاض الفصحا انھوں نے ۱۲۳۶ھ میں تمام کیا۔ لکھتے ہیں کہ "میری عمر آج کے دن تک قریب اسّی کے پہونچی۔ اب دل دنیا سے اُٹھا لیا بجز یادِ الٰہی اور نماز و روزے میں مصروفیت کے کوئی تمنا نہیں ہے۔ خداوند تعالےٰ عاقبت بخیر کرے"۔ ممکن ہے کہ دل لہو و لعب سے سرد ہو گیا ہو لیکن شاعری ذریعۂ معاش تھی اس کو کیونکر چھوڑ سکتے تھے ـــ نواب مہدی علی خاں کی شان میں قصیدہ لکھا۔ شاگردوں کی غزلیات پر اصلاح دیتے تھے۔ فہرست تلامذہ میں اضافہ جاری تھا۔ میر مظفر علی اسیر جنکی شہرت کو امیر مینائی۔ ریاض خیرآبادی اور شوق قدوائی نے آسمان تک پہونچایا اس تذکرے کے اختتام کے بعد شاگرد ہوئے اور اُستاد کی وفات سے پچاس سال بعد ان کے بعض مسخ شدہ دیوانوں پر آبِ حیات کے قطرے چھڑکے ـــ تذکرۂ مسرور سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۳۹ھ تک شاعری اور شعر سے اسقدر دلچسپی باقی تھی کہ اس تذکرے کا صاف شدہ نسخہ خود ملاحظہ فرمایا۔ خاتمہ کی عبارت نقل کی جاتی ہے:-

"بر ضمیر آئینہ نظیر مبصران گوہر معنی مخفی نماند کہ مولف ایں "بیاضِ صبح ازل" شیخ پیر بخش ولد حکیم حیات اللہ متوطن کاکوری مضافات سرکار اودھ کہ بتخلص مسرور شہرت دارد از سبب نامساعدت روزگار کجا فرصت آں داشت کہ بہ تفحص و تجسس احوال شعرائے نامدار پردازد لیکن بہ رہبری علّامۂ دہر اُستادی غلام ہمدانی مصحفی مدظلہ العالی ایں بیاض را صاف کردہ بہ حضور آں علامہ پیش کردہ وصاف نمودہ درست ساختہ بطور بیاض تحریر یافتہ اما قاصر شکر ہستم گو ذکر عزیزم رمضان علی بیگ طپاں نہ کنم کہ بغیر امداد آں حضرت ایں کار دشوار بود۔

تاریخ

سالِ او چوں زخرد پرسیدم | یک ہزار و دو صد سی و نہ بنوشت

عبدہ الراجی پیر بخش مسرور کاکوروی - ۱۲ ربیع الاول ۱۲۳۹ھ یوم آدینہ

کاتب بندہ مرزا بہادر بیگ وفا[1] - ۲۱ ربیع الثانی ۱۲۳۹ھ ـــ مفتی گنج - لکھنؤ

"ایں تصنیف اُستاد زمانہ شیخ پیر بخش مسرور کاکوروی شاگرد خاقانی ہند شیخ غلام ہمدانی مصحفی۔ کتبہٗ لالہ گور بخش[2] ادیب با دوم شہر ربیع الاول ۱۲۴۹ھ - تمت الکتاب بعون الملک الوہاب[3]"

سالِ وفات نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے تذکرۂ گلشن بے خار ۱۲۴۸ھ اور ۱۲۵۰ھ کے درمیان لکھا۔ وہ مصحفی کی بابت تحریر فرماتے ہیں کہ "ان کی وفات کو آج دس سال گزرے"۔ تذکرۂ مسرور کاکوروی سے مصحفی کی حیات ۱۲ ربیع الاول ۱۲۳۹ھ تک ثابت ہے۔ لہٰذا مصحفی کی تاریخ وفات ربیع الثانی ۱۲۳۹ھ سے ذی الحجہ ۱۲۴۰ھ تک ہے

---

[1] یہ کاتب وفا تخلص مسرور کے شاگرد تھے۔ ریاض الفصحا میں مصحفی نے ان کا تذکرہ کیا ہے۔ دیکھو صفحہ ۳۶۲۔

[2] یہ لالہ صاحب غالباً وہی کہار شاگرد ہیں جن کی غزلوں پر اصلاح نمبر علیحدہ تنہا کی صلاح سے وقوت کی گئی تھی اور جو نواب غازی الدین حیدر کے عہد میں محرر خزانہ ہو گئے تھے۔ سنہ ۱۲۴۹ھ میں نصیر الدین حیدر بادشاہ تھے اور غازی الدین حیدر کا ۱۲۴۳ھ میں انتقال ہو چکا تھا۔

[3] تذکرۂ مسرور (مخطوط) مرتبہ محمد مشیر احمد علوی ناظر کاکوروی۔ امیر محل لائبریری کاکوری لکھنؤ

راقم الحروف نے نوعمری میں کسی بیاض پر ایک قطعہ تاریخ وفاتِ مصحفی کا دیکھا تھا مگر اب یاد نہیں آتا کہ وہ بیاض کس کی تھی اور کہاں دیکھی تھی۔ وہ قطعہ شاید اسیر یا شعور کا تھا اور سنہ وفات یقیناً ۱۲۴۰ھ تھا۔ زمانۂ حال کے قابل فخر محقق قاضی عبدالودود نے ایک مضمون[۱] میں لکھا ہے کہ "مصحفی کے شاگرد غلام اشرف افسر (اشرف تخلص کے دو قلمی دیوان کتب خانہ مشرقیہ بانکی پور میں موجود ہیں۔ ایک دیوان میں حسب ذیل قطعہ ہے جو بظاہر کسی دوسرے شخص کی تصنیف سے ہے:-

مصحفی چوں از جہاں رحلت نمود		بستہ نقشِ جلدِ ہفتم بر دہم[۲]
گفت صاحب رام تاریخِ وفات		مصحفِ معنی زدنیا گشت گم

دوسرے دیوان میں بھی ایک قطعہ موجود ہے جو خود مصنف دیوان کا لکھا ہوا ہے۔ اس کا آخری مصرعہ یہ ہے:-

مصحفی نے بسایا مقامِ بہشت
۱۲۴۰

مولوی برہان الدین نزہت متوطن دیوہ کے احوال میں مصحفی نے لکھا ہے کہ "وہ اتفاقات سے کلیتا ٹولہ میں متصل فقیر خانہ کے فروکش ہوئے" اس سے قیاس ہوتا ہے کہ اُستاد بھی "کلیتا ٹولہ" ہی میں رہتے تھے۔ یہ محلہ سُنا ہے کہ حضرت عباس کی درگاہ اور منصور نگر کے درمیان تھا مگر اب صحیح مقام کا پتہ نہیں چلتا۔ مصحفی کا مزار معلوم نہیں کہ اس محلہ کے قریب کسی قبرستان میں تھا یا کہیں دور گورِ غریباں میں۔ اس دور کے بعض نامور شعرا اپنے ہی مکانوں میں دفن کئے گئے تھے۔ شاید مصحفی کا مرقد بھی اُنھیں کا صحن خانہ ہو۔

مصحفی کا نہ نشاں پوچھ کہ مدت گذری		مٹتی گھس گئی تربت کا سرہانا نہ رہا

تصنیفات

مصحفی نعمتِ اولاد سے محروم تھے لیکن ان کے شاگردوں کی تعداد سَو سے متجاوز تھی اور فیضِ صحبت سے مستفید ہونے والوں کا کوئی شمار نہ تھا مگر افسوس ہے کہ ان کا کلیات مرتب نہیں کیا گیا۔ انھوں نے عربی میں متعدد غزلیں کہی تھیں اور چند قصیدے نعت میں لکھے تھے مگر آج انکا وجود نہیں۔ فارسی کے دو تین دیوان تھے مگر اب صرف ایک کا پتہ چلتا ہے۔ شعرا کے احوال میں تین تذکرے تھے وہ اب مدت کے بعد منظر عام پر آئے ہیں۔

علم عروض میں ان کی تالیف "خلاصۃ العروض" اور محاورات فارسی کی توضیح و تشریح میں "مفید الشعرا" کا صرف نام سنا جاتا ہے مسمّی کا نشان نہیں۔ البتہ اُردو کے چند دیوان مرحوم کی فاتحہ خوانی کے لئے باقی تھے مگر وہ بھی کاتبوں کی نالائقی سے ایسے غلط کہ مصحفی خود دیکھتے تو نئے سرے سے تصنیف کی ضرورت محسوس کرتے۔

کہا جاتا ہے کہ مصحفی کے آٹھ دیوان "ریختہ" تھے۔ مگر ان کی وفات سے پچاس سال بعد نواب رامپور کی ایما

---

[۱] رسالۂ معارف اعظم گڈھ۔ نمبر ۴۔ جلد ۳۸۔ صفحہ ۲۶۸ (اکتوبر ۱۹۳۶ء) "مصحفی کا سالِ وفات"۔ از قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر پٹنہ

[۲] یہ تلمیح سمجھ میں نہیں آئی۔ مگر مادۂ تاریخ لاجواب ہے۔ خیال ہوتا ہے کہ "دہم" غلطی کتابت ہے۔ "ششم" چاہئے۔ شاید مصحفی کی حیات میں چھ ہی دیوان مرتب ہوئے تھے اور ساتویں کی ترتیب بعد وفات ہوئی۔

ان کے دواوین کی جستجو شروع ہوئی تو بہ مشکل چار دیوان دستیاب ہوئے۔ ۱۲۰۷ھ تک مصحفی کے صرف تین دیوان ریختہ رائج تھے۔ قدرت اللہ خاں قاسم نے مجموعہ نغز میں تین ہی دیوانوں کا تذکرہ کیا ہے ۱۲۳۵ھ تک مصحفی چھ دیوانوں کے مصنف سمجھے جاتے تھے جیسا کہ شیفتہ کی تحریر سے واضح ہوتا ہے۔ ۱۲۶۱ھ میں منشی احمد علی سحر لکھنوی نے لکھا ہے کہ مصحفی کے سات دیوان تھے اور "دیوان ہفتم خلاصۂ فکر او ست" لیکن غدر کے بعد مصحفی کے آٹھ دیوان مشہور ہوئے۔ شمس العلماء تحریر فرماتے ہیں کہ "راقم کے پاس جو ان کے دیوان ہیں ان میں سے ایک پر دیوان ہفتم لکھا ہے اور ایک دیوان اور ہے۔ اسمیں سید انشا کے جھگڑے بھی ہیں۔ یہ آٹھواں دیوان ہوگا کہ سب سے اخیر ہے" آزاد کو غلط فہمی ہوئی۔ سید انشاء سے جھگڑے کے وقت مصحفی کی عمر ۵۰ سال سے زیادہ نہ تھی اور اس کے بعد وہ پچیس تیس سال تک زندہ رہے۔ جس دیوان کو آٹھواں سمجھتے ہیں وہ صرف چوتھا ہے۔ کہتے ہیں کہ کتب خانہ "مشرقیہ" پٹنہ میں مصحفی کے سب دیوان ہیں مگر وہاں تک فقیر امیر کی رسائی نہ ہوئی۔ اس گنجینۂ علوم کے خزینہ دار نے نامہ سیاہ کو جواب خط سے بھی شاد کام نہ فرمایا۔ کتب خانہ سرکاری ریاست رامپور میں مصحفی کے پانچ دیوان ہیں۔

کتب خانۂ رامپور دیوان اول ۱۲۱۱ھ کا لکھا ہوا ہے اور مرزا سلیمان شکوہ کے کتب خانہ کی مہر لگی ہے۔ صفحۂ اول پر لکھا ہے "گزرانیدۂ میاں مصحفی ملک الشعرا" مطلع اول ہے:۔

کیا دید[1] میں عالم کی کروں جلوہ گری کا یاں عمر کو وقفہ ہے چراغ سحری کا

خاتمہ پر تحریر ہے:۔ "تمام شد دفتر اول غزلیات من تصنیف میر مصحفی بتاریخ بست و نہم رجب المرجب بروز یکشنبہ بوقت چاشت ۱۲۱۱ھ"۔ دیوان دوم بھی ۱۲۱۱ھ کا لکھا ہوا ہے۔ مطلع اول ہے:۔

لگے گر ہاتھ میرے تار اس زلف معنبر کا تو ہووے باعث شیرازہ ان اجزائے ابتر کا

آخری غزل کا مقطع ہے:۔

اے مصحفی بوسہ کا سائل تو میں ہوں لیکن یہ ڈر ہے وہ گالی تو مجھ کو نہ سنا بیٹھے

خاتمہ پر ذیل کی عبارت ہے:۔ "تمام شد دفتر دویم از غزلیات میاں مصحفی صاحب سلمہ اللہ تعالےٰ۔ تاریخ نہم رجب المرجب ۱۲۱۱ھ بروز دوشنبہ بوقت چاشت تحریر یافت بہ دستخط ہیچمداں مرزا صدرالدین حسین قلمی گردید"۔ دیوان سوم کے آغاز میں ایک مثنوی "در بیان واقعۂ مودی خانہ حضور اقدس صاحب عالم مرزا سلیمان شکوہ بہادر" ہے جس کا پہلا شعر ہے:۔

یہ جو مودی خانہ ہے سرکار کا ہے نمونہ بیش و کم دربار کا

---

[1] اسیر و امیر نے مصحفی کے چار دیوان کا انتخاب ۱۲۹۶ھ میں رامپور سے شایع کیا تھا اس میں یہ مطلع اس طرح رقم ہے:۔

نظارہ کروں دہر کی کیا جلوہ گری کا یاں عمر کو وقفہ ہے چراغ سحری کا

"دید" کی جگہ "نظارہ" شاگردوں کی اصلاح ہے!! اس کا شمار اغلاط کتابت میں نہیں کیا جا سکتا۔

اس دیوان کا مطلع اول ہے :-

ترے کوچے اس بہانے ہمیں دن سے رات کرنا کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا

اور آخری غزل کا مقطع ہے :-

میاں عید کے دن تو بیجانہ تھا کچھ جو تم مصحفی سے گلے لگ کے ملتے

دیوان کے آخر میں قطعات و رباعیات بھی ہیں۔ آخری رباعی ہے :-

ہر چند کہ زندگی سے ہوئی ہے سیری فرقت میں ترے اجل نہ آوے میری
امید ہے کہ جب تو آوے مجھ پاس مرجاؤں میں بلائیں لے کے تیری

خاتمہ پر تحریر ہے :- "ہر کہ خواند دعائے طمع دارم ☆ زانکہ من بندۂ گنہگارم۔ تمام شد دفتر سویم میر مصحفی ۱۲۱۱ھ"

دیوانِ چہارم کے آغاز میں سات قصیدے ہیں۔ پہلا قصیدہ تہنیت نوروز میں درمدح مرزا سلیمان شکوہ ہے تشبیب کا پہلا شعر ہے :-

یہ جوشِ نامیہ ابکی ہوا ہے فصل بہار کہ دانہ ہووے ہرا مرغ کے تہ منقار

اس کے بعد تین قصیدے اور مرشد زادہ موصوف کی مدح میں ہیں۔

پانچواں قصیدہ نواب زادہ مرزا سیف علی کی مدح میں ہے۔ چھٹا قصیدہ "درمعذرت اتہام انشا بجناب فیضمآب مرشد زادہ مرزا سلیمان شکوہ بہادر" ہے۔ ساتواں قصیدہ بھی مرشد زادے کی مدح میں ہے۔

سلہ لطیفہ۔ مصحفی جب تک دلی میں تھے شیخ کہے جاتے تھے۔ نواب ذوالفقار الدولہ سے بیزار تھے اور مرزا مظہر جان جاناں کے معتقد۔ مولانا فخرالدین چشتی کی شان میں قصیدہ لکھا تھا۔ تصوف کا زور تھا

معشوق ہوں یا عاشق معشوق نما ہوں معلوم نہیں مجھ کو کہ میں کون ہوں کیا ہوں
ہوں شاہد تنزیہ کے رخسار کا پردہ یا خود ہی میں شاہد ہوں کہ پردے میں چھپا ہوں
اے مصحفی شائیں ہیں مری جلوہ گری میں، ہر رنگ میں میں مظہر انوار خدا ہوں

لکھنؤ آنے کے بعد پہلے کچھ دنوں "میاں مصحفی" مشہور ہوئے۔ منقبت کے اشعار غزلیات میں شامل ہونے لگے

سورج سے بھی نہ آنکھ دبے جس کی مصحفی ذرہ ہوں میں وہ خاکِ درِ بوتراب کا

مگر ۱۲۱۱ھ سے بے تکلف "میر مصحفی" کا خطاب مل گیا۔ دس بارہ قصیدے جناب امیر علیہ السلام کی منقبت میں تحریر ہوئے اور ایک مرثیہ بھی تصنیف کیا گیا۔ اگر سید انشا کے جھگڑے نے آشکارا نہ کیا ہوتا تو آج ثابت کرنا دشوار تھا کہ مصحفی صرف "ارزانی" کے سید تھے۔ محبت اہلبیتؑ میں غلو چشمہ تصوف کا تبرک تھا۔ اُس کا اعلان لکھنؤ کے عمائدین سے وسیلۂ تقرب یا تو چندیوں میں کربلا کی زیارت کا تصرف!! فرماتے ہیں :-

یہ ناز و ادا یہ حُسنِ صورت ہے کہاں، کیوں کہئے نہ لکھنؤ کو پھر جانِ جہاں
دلی میں نہ آگرے میں دیکھے ہم نے جو نور کے بقعے نظر آتے ہیں یہاں

"در شبِ عید کہ قطعہ مبارکباد بحضورِ پر نور خواندہ شد"۔ اور اسی قصیدے کے ختم پر کتب خانہ مرزا سلیمان شکوہ کی سرخ روشنائی سے مہر ہے جس میں ۱۲۱۲ھ لکھا ہے۔ ۶۲ صفحات پر یہ قصائد ہیں اور اس کے بعد غزلیات شروع ہوتی ہیں پہلی غزل کا مطلع یہ ہے:-

لیتے ہی بوسہ ہو گئے بیزار کس لئے		تم کو کیا تھا اور بھلا پیار کس لئے

صفحہ ۱۷۹ پر غزلیات کا اختتام ہے۔ آخری غزل کا مقطع ۱؎ یہ ہے

پھرتا ہے تو تو گلیوں کے اندر خراب خوار		اے مصحفی یہ کس کی تجھے بددعا لگی

غزلیات کے بعد یہ عبارت درج ہے "در بیان اتمام غزلیات و شروعات رباعیات من تصنیف میر مصحفی سلمہ اللہ تعالےٰ" اور پہلی رباعی یہ لکھی ہے:-

جو اشک ان آنکھوں سے جدا ہوتا ہے		مژگاں تلک آیا کہ فنا ہوتا ہے
نظروں سے گرے نہ کوئی یارب		نظروں سے گرا بہت برا ہوتا ہے

اس کے بعد سات رباعیاں اور ہیں اور بس۔ یہ مجلد جو دیوان چہارم کے نام سے موسوم ہے۔ یقیناً ناقص ہے کیونکہ "یا" سے پہلے کی کوئی ردیف نہیں ہے۔ دیوان ششم کی بھی ایک کاپی موجود ہے جس کا مطلع اول یہ ہے:-

تھا جوش طبیعت میں نہ دیوانِ ششم کا		خود وصل جدا ہو گیا خشتِ سرِ خم کا

اس میں رباعیات و قطعات ہیں اور ایک مرثیہ ہے جس کا آخری بند ۲؎ یہ ہے۔

رہتا ہے باز پرس قیامت کا اسکو ڈر		روزِ عمل ہے اس کا جو شب سے سیاہ تر
ہرگز نہ تم گناہوں پہ اسکی کرو نظر		بخشاؤ اس کو شافعِ محشر کے واسطے

اس دیوان کے آغاز میں وہ دیباچہ نہیں ہے جس کا اقتباس نذر ناظرین کیا جا چکا ہے۔ لہذا قیاس ہوتا ہے کہ یہ مجلد بھی نامکمل ہو۔

قصائد علاوہ ان پانچ دواوین کے ایک مجلد قصائد کا بھی ہے جس میں ۲۶ قصیدے ہیں۔ ابتدائی چار قصیدے حمد و نعت میں ہیں۔ دس قصیدے منقبت جناب امیر علیہ السلام میں ہیں۔ ایک قصیدہ فضائل حضرت امام حسین علیہ السلام میں ہے۔ ایک قصیدہ مولانا فخر الدین "مرشد میاں مصحفی" کی مدح میں ہے۔ ایک قصیدہ مرزا جواں بخت کی شان میں ہے ایک قصیدہ مرزا سلیماں شکوہ کی تعریف میں ہے۔ قصیدہ نمبر ۱۹ جو ۴۲ صفحات پر آیا ہے نواب آصف الدولہ بہادر کی شان میں ہے۔ اس کے بعد تین قصیدے عمایدین لکھنؤ کی مدح میں ہیں۔ قصیدہ نمبر ۲۳ نواب جلال الدولہ مہدی علیخاں بہادر

۱؎ اسیر و امیر نے اس مقطع کو یوں تحریر کیا ہے:-

گلیوں میں پھر رہا ہے جو تو آجتک خراب		اے مصحفی یہ کس کی تجھے بددعا لگی،

۲؎ اسوقت تک مرثیے چار مصرعوں کے ہوتے تھے۔ ٹیپ کا قاعدہ بعد کو جاری ہوا۔ سودا کے مرثیے بھی اسی طرح کے ہیں۔

کے گھوڑوں اور اسطبل کی تعریف میں ہے۔ قصیدہ نمبر ۲۴ جشن جلوس نواب سعادت علی خاں بہادر کی تہنیت میں ہے قصیدہ نمبر ۲۵ ممتاز الدولہ آفرین علی خاں کی شان میں اور آخری قصیدہ مرزا کلب علی خاں بہادر کی مدح میں ہے۔ دواوین کی بابت اظہار خیالات سے پہلے مناسب ہے کہ قصائد کا قصہ ختم کر دیا جائے۔ مولانا آزاد کی رائے ان قصیدوں کی بابت بالکل صحیح ہے اور اُسی پر اکتفا کیجاتی ہے:۔

"قصیدے خوب ہیں اور اکثر نہایت مشکل زمینوں میں ہیں۔ ان میں بڑے بڑے الفاظ۔ بلند مضمون۔ فارسی کی عمدہ ترکیبیں۔ ان کی درست نشستیں۔ جو جو اُس کے لوازم ہیں سب موجود ہیں۔ البتہ بندشوں کی چستی اور جوش و خروش کی تاثیر کم ہے۔ شاید کثرت کلام نے اس کو دھیما کر دیا کیونکہ دریا کا پانی دو پہاڑوں کے بیچ میں گھٹ کر بہتا ہے تو بڑے زور و شور سے بہتا ہے۔ جہاں پھیلکر بہتا ہے وہاں زور کچھ نہیں رہتا۔ یا شاید ضروری فرمائشیں اتنی مہلت نہ دیتی ہوں گی کہ طبیعت کو روک روک کر غور سے کام سرانجام کریں"

دواوین کی بے ترتیبی

دواوین کی ترتیب ناقص ہے۔ غزلیات میں خلط ملط ہو گیا ہے اور کاتبوں نے دفتروں پر نمبر اندازی بھی غلط کر دی ہے۔ مثلاً (۱) کتب خانۂ رامپور کے "دیوانِ اول" کا مطلع ہے۔

کیا دید میں عالم کی کروں جلوہ گری کا یاں عمر کو وقفہ ہے چراغِ سحری کا

لیکن تذکرۂ ہندی گویان میں مصحفی نے خود لکھا ہے کہ یہ غزل دیوان[1] سوم کی ہے۔

مولانا حسرت موہانی کے بیش بہا ذخیرۂ مخطوطات میں ایک نادر نسخہ "دیوان سوم" کا ہے اور اس کے پہلے صفحہ پر کرامت علی خاں شہیدی کے دستِ خاص سے لکھی ہوئی خطِ شکست میں ایک نثر فارسی اپنے اُستاد کی تعریف میں ہے اور اس میں بھی مطلع اول یہی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کتب خانۂ رامپوری کا نسخہ غلط ہے مگر مشکل یہ ہے کہ اس پر "گزرانیدۂ میاں مصحفی" لکھا ہے۔

(۲) مخطوطات حسرت کے دیوان سوم متذکرۂ بالا کا آخری مقطع ہے

اے مصحفی بوسہ کا سائل تو میں ہوں لیکن یہ ڈر ہے وہ گالی تو مجھ کو نہ سنا بیٹھے

لیکن کتب خانۂ رامپور کے دیوان دوم کا یہی آخری مقطع قرار دیا گیا ہے۔

(۳) کتب خانۂ رامپور کے "دیوان دوم" کا مطلع اول ہے

لگے گر ہاتھ میرے تار اس زلفِ معنبر کا، تو ہووے باعثِ شیرازہ ان اجزائے ابتر کا

مگر مخطوطات حسرت کے دیوان اول میں یہی پہلا مطلع ہے اور دیوان دوم کا مطلع یہ ہے:۔

چتون کی دکھا شوخی سرمے کو لگا رکھا خورشید کو سائے میں زلفوں کے چھپا رکھا

---

[1] تذکرۂ ہندی گویان۔ صفحہ ۲۵۲

اس کے بعد مصحفی کی وہ مشہور غزل ہے جس کا مطلع ہے :-

مرضِ عشق سے گر ابکی سنبھل جاؤں گا — تو میں دو چار برس کو کہیں ٹل جاؤں گا

اور جس کی بابت خود مصحفی نے تذکرۂ ہندی گویان میں لکھا ہے کہ یہ غزل دیوان دوم کی ہے۔ مزید شہادت یہ ہے کہ اسی دیوان میں ایک شعر ہے

مدت ہوئی کہ ایک تو دیوان میں کہہ چکا — اے مصحفی ہوا ہے یہ دیوان دوسرا

ثابت ہوا کہ مخطوطاتِ حسرت میں جس مجلد کو "دیوان دوم" قرار دیا ہے وہ واقعی دوسرا دیوان ہے اور رامپور کا یہ نسخہ بھی غلط ہے۔ (۴) کتب خانۂ رامپور کے دیوان چہارم کا آخری مقطع ہے :-

پھرتا ہے تو تو گلیوں کے اندر خراب و خوار — اے مصحفی یہ کس کی تجھے بد دعا لگی

لیکن مخطوطاتِ حسرت میں دیوان اول کا یہ آخری شعر قرار دیا گیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ وغیرہ

غرض دواوین کی موجودہ ترتیب قابلِ اعتبار نہیں۔ ضرورت ہے کہ ادب کا کوئی خدمتگزار لکھنؤ۔ بنارس، پٹنہ، رامپور وغیرہ کے کتب خانوں سے دواوین مصحفی کا انتخاب اس طرح تیار کرے کہ ہر دیوان کے اشعار جدا جدا لکھے جائیں تا کہ شاعر کے ترقی کلام کی رفتار ظاہر ہو سکے۔ اغلاطِ کتابت کی صحت کی جائے مگر زبان میں ترمیم ہرگز نہ ہونا چاہئے۔

مثنویات مصحفی کی چھوٹی بڑی بیس مثنویاں ہیں جن میں سے بحر المحبت کو جو میر تقی کی دریائے عشق کے جواب میں ہے مولوی عبد الماجد دریابادی نے تصحیح و تحشیہ کے بعد شایع کر دیا ہے۔ مثنوی شعلۂ عشق حسرت موہانی کے انتخاب دواوین مصحفی کے ساتھ چھپی ہے۔ گلزار شہادت بھی کسی رسالے میں شایع ہوئی تھی۔ بقیہ مثنویاں دواوین کی مجلدات میں بند ہیں۔ ان کی ترتیب بھی کاتبوں نے غلط کر دی ہے مثلاً مثنوی "در صفت طفل حجام" جو دہلی میں ابتدائی زمانے کی تصنیف ہے اور جس کا اقتباس میر حسن مرحوم نے اپنے تذکرے میں درج کیا تھا مخطوطاتِ حسرت کے دیوان دوم میں شامل کی گئی ہے۔ مثنوی "مودی خانہ" جو رامپور کے دیوان چہارم میں ہے مخطوطاتِ حسرت کے دیوان سوم کا جزو ہے۔ رامپور کے نسخے میں "مودی خانۂ صاحب عالم مرزا سلیمان شکوہ" لکھا ہے مگر حسرت کے دیوان میں "مودی خانۂ شاہ عالم" بنا دیا ہے۔ اگر یہ اصلاح صحیح ہے تو اس مثنوی کو بھی ابتدائی دور کا کلام سمجھنا چاہئے۔ مخطوطاتِ حسرت میں ایک مثنوی "نانخواہ" ہے مگر وہ کسی دوسری جگہ راقم کی نظر سے نہیں گزری۔

بعض غیر مطبوعہ مثنویاں شاہ عالم اور مرزا سلیمان شکوہ کے دور میں شرفا کی معاشرت کا فوٹو ہیں۔ اگر یہ سب بعد تصحیح شایع کر دی جائیں تو محققین کی واقفیت میں اضافہ کا باعث ہوں۔ لیکن ان میں سے کوئی مثنوی دریائے عشق کا کیا ذکر ہوس کی لیلیٰ مجنوں کو بھی نہیں پہونچتی۔

تذکرۂ شعرا مصحفی کے تینوں تذکرے انجمن ترقی اردو کی عنایت سے شایع ہو چکے ہیں اور ان کی بابت گزشتہ اوراق

میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ افسوس ہے کہ یہ مبسّط بہادر فیضہ صاحب آبحیات کی نظر سے نہ گزرا ورنہ آج اردو انشاپردازی کے ستون یادگار کا پایۂ اعتبار بھی استوار ہوتا۔ اور زبان ریختہ کے مورخ کو افسانہ نگار کا طعنہ نہ دیا جاتا

مصحفی کی شاعری

اُستادالاساتذہ کے ابتدائی کلام پر میر حسن مرحوم کی جو رائے تھی اس سے ناظرین آشنا ہو چکے ہیں۔ مرزا علی لطف کے خیال سے بھی آگاہی ہو چکی ہے۔ حکیم قدرت اللہ خاں قاسم دہلوی نے سنہ ۱۲۲۱ھ میں مجموعۂ نغز مرتب کیا۔ اسوقت تک مصحفی کے تین دیوان شایع ہو گئے تھے۔ وہ لکھتے ہیں[1] کہ "کتب متداولہ نظم ونثر پر خوب نظر ہے دونوں زبانوں میں سخن سازی کرتے ہیں۔۔۔۔۔ ایام ملازمت سرکار دولتمدار شاہزادۂ مرزا سلیماں شکوہ بہادر میں چند قصیدے اس والاتبار کی مدح میں لکھے اور داد سخنوری دی"

گلشن بیخار

مصحفی کی وفات کے بعد ان کی شاعری پر پہلا تبصرہ نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کا ہے وہ تحریر فرماتے ہیں کہ "بلاد مشرق میں ان کی قوت مشق مسلم اور اُستادی علم ہے۔ اُن شہروں کے اکثر سخنوروں نے مصحفی سے اکتساب فن کیا ہے۔ ہر چند بہ سبب بسیار گوئی کے انکا اکثر کلام کم پایہ اور لطائف سے خالی ہے مگر منتخب اشعار نہایت بلند اور والامرتبت ہیں"۔ تیرھویں صدی کے وسط میں لکھنؤ نے علم بغاوت بلند کیا۔ شعر و شاعری کا جداگانہ اسکول قایم ہوا۔ دہلی سے رقابت ہوئی اور باہم نوک جھونک ہونے لگی۔ لکھنؤ کے بیشتر صاحبان کمال مصحفی کے براہ راست یا بالواسطہ شاگرد تھے۔ اس لئے اُستاد کے کلام پر دلی والے نکتہ چینی کرنے لگے اور بعض انکے کمال کے منکر ہوئے۔ منشی کریم الدین دہلوی نے سنہ ۱۲۶۱ھ میں شعرائے اُردو کا ایک بسیط تذکرہ لکھا اور انصاف کا حق ادا کیا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:-

"غلام ہمدانی مصحفی اصل اسکی قصبہ امروہہ مضافات مراد آباد ہے بعنفوان شباب میں درمیان شاہ جہان آباد کے آیا اسی جائے مقیم ہوکر یہاں کے لوگوں سے ملاقات پیدا کی۔ مشاعرہ بھی درمیان شاہجہاں آباد کے کرتا تھا۔ آخر الامر

[1] مصحفی تخلص میاں غلام ہمدانی است سلمہ ربہ۔ وے از مردم بیرونجات است اما بتقریب روزگار با کلانہائے خود در بدو شعور وارد حضرت دہلی شدہ نشو و نما یافتہ۔ عزیزے نیک سیرت مسکیں نہاد۔ خوشخو۔ خوبی نژاد۔ متواضع۔ باادب۔ مرتبہ شناس۔ مہذب خلیق و شگفتہ پیشانی بانمکین و پاکیزہ زندگانی واقع شدہ بر کتب متداولہ نظم ونثر نظرے خوب دارد بہ ہر دو زبان سخن سازی برروئے کار می آرد دیوانے مردف فارسی و سہ دیوان ریختہ مشحون اقسام سخن تا الیوم سرانجام دادہ و بیرون ازیں دو تذکرۂ فارسی و ریختہ ہم نگاشتہ۔ مدتے است کہ بہ بلدۂ لکھنؤ اقامت افگندہ علم استادی بداں نواح برافراشتہ و تلامذہ بسیار فراہم آوردہ در ایام ملازمی سرکار دولت مدار شاہزادہ شوکت پژوہ مرزا سلیمان شکوہ بہادر قصائد چند در مدح آں والاتبار انشا کردہ و داد سخنوری دادہ در زمانے کہ وارد حضرت دہلی بود یک چند طرح راختہ بخانۂ خود انداختہ با قاسم ہیچمدان سراپا نقصان کہ اکثر بمشاعرۂ اش معرفت بسیار بہ اہلیت و آدمیت پیش می آمد۔ خدایش خوش و سلامت دارد" مجموعۂ نغز۔ جلد دوم۔

لکھنؤ میں گیا وہاں جاکر رہنے لگا۔ درمیان سنہ ۱۲۲۰ھ کے اس جائے فوت ہوا۔ اس کی ابتدا آخر دورۂ میر و مرزا کے تھی جراُت اور انشا سے مباحثہ بہت کرتا تھا۔ چھ دیوان ریختہ اور دو تذکرہ اس کی تصنیف سے ہیں اور ایک تذکرہ فارسی کا اور ایک دیوان فارسی کا اس کی تصنیف سے ہے۔ بلاد شرقیہ میں اکثر لوگوں نے اس سے اصلاح لی ہے اور وہ واقع میں مسلّم استاد ہے۔ گرچہ اس کے دیوان میں بُرے بھلے سبھی طرح کے شعر ہیں اور یہ حال سبھی شعرا کا ہوتا ہے کچھ اس کی خصوصیت نہیں ہے۔ حاصل یہ ہے کہ شعر اس کا بہت اچھا ہوتا ہے۔ چنانچہ چند شعر اسکے لکھتا ہوں گرچہ بعضے لوگوں کو اس سے حسد ہوا اور اس کی اُستادی کے منکر ہوں۔ میرے نزدیک بڑا اُستاد اور شاعر اور اکثروں کے نزدیک بہت اچھا کہنے والا ہے۔ ایسے کم ہوتے ہیں"۔

بہارِ بے خزاں

اسی سال سنہ ۱۲۶۱ھ میں لکھنؤ کے منشی احمد حسین سحر شاگرد شیخ غلام مینا ساحر نے تذکرۂ بہارِ بے خزاں تمام کیا اور مصحفی کا مرتبہ میر و سودا سے بھی بڑھا دیا۔ لکھتے ہیں:۔

"مصحفی تخلص غلام ہمدانی نام اصلش از امروہہ بود نشو و نما بلکھنؤ یافتہ جرأت و انشا۔ میر تقی و سودا کہ ہمعصرے بودند پیش بلندی رتبہ شاعریش اوج فلک بہ منزلہ پستی زمین است و سلک نظم گہر بارش روکش عقد ثریا و خوشۂ پروین۔ حکیم طور سینائی سخندانی و ہنگامہ گرم کن دوبان معانی بودہ پرتو استفادہ کمال او ہمچو خورشید سراپا ضیا بر ہمہ کس تافتہ و چاشنی کلام شکر ریزش بمذاق تلخکامان قند مکرر ساختہ فی زماننا اُستادان بدولت تلمذش سر بہ فلک برافراشتہ اند ہفت دیوان ریختہ و دو تذکرہ و دیوان فارسی تمام کردہ قوت فکر عالی او ازینجا می تواں دانست اکثر با شعرائے عصر خویش مناظرات و مطارحات کردہ فقیر چند اشعارش از دیوان ہفتم کہ خلاصۂ فکر اوست نقل برداشتہ صفحۂ کتاب را مرقع تصاویر معنی می سازد"

سخن شعرا

مولوی عبدالغفور خاں نساخ مشرقی نے سنہ ۱۲۷۶ھ میں "قطعۂ منتخب" اور سنہ ۱۲۸۱ھ میں "سخن شعرا" دو تذکرے شایع کئے اور اُن میں مصحفی کو حسب ذیل الفاظ سے یاد کیا:۔

"مصحفی تخلص، غلام ہمدانی نام باشندۂ قصبۂ امروہہ ضلع مراد آباد ولد ولی محمد شاگرد اماتی شروع جوانی میں دہلی گئے تھے آخر الامر لکھنؤ میں جاکر اپنی زندگی بسر کی۔ کچھ روزوں مرزا سلیماں شکوہ بہادر کی رفاقت میں تھے۔ جمیع اصناف سخن پر قادر تھے اور پرگو ایسے کہ آج تک شعرائے اُردو میں دوسرا نظر نہ آیا۔ چنانچہ آٹھ دیوان اور دو تذکرے اُردو میں اور ایک دیوان فارسی بجواب نظیری نیشاپوری اور ایک تذکرہ فارسی میں لکھے ہیں۔ اشعار ان کے نہایت آبدار و عاشقانہ مطبوع طبائع طباعان زمانہ ہیں کئی دیوان و تذکرے ان کے نظر سے گزرے"۔

تذکرۂ طورِ کلیم

سنہ ۱۲۹۸ھ میں بھوپال سے دو تذکرے شایع ہوئے۔ سید نور الحسن خاں کلیم کا "طورِ کلیم" اور سید علی حسن خاں کا "بزم سخن"۔ مصحفی کی بابت یہ بزرگ لکھتے ہیں:۔

"غلام ہمدانی از اہالی امروہہ منمضافات مراد آباد در آغاز شباب بہ جہاں آباد بسر می برد۔ عاقبت در لکھنؤ رفت

وہمانجا بحق پیوست روزے چند بہ رفاقت مرزا سلیمان شکوہ گزرانیدہ بود۔ ابتدائیش انتہائے دورۂ سودا است باجرات وانشا در یک ردیف وقافیہ جادۂ سخن می پیمود در ریختہ ہشت دیوان و دو تذکرہ دارد۔ در پارسی دیوان بجواب نظیری و تذکرہ اور است در بلاد مشرق مسلم الثبوت بود۔ در استادی وے سخن نیست۔ بر جمیع اصناف سخن قدرت داشت۔ تمام دگزیدہ اشعارش نتواں گفت کہ جہاں شور انگیز است۔"

بزم سخن

"مصحفی غلام ہمدانی خلف ولی محمد قدیم باشندۂ امروہہ ضلع مرادآباد بودہ است۔ زمانہا در شاہجہاں آباد بسر بردہ در اواخر بہ لکھنؤ توطن گزید وتادم واپسیں دوری آن بلدہ نہ گزید۔ عالمے ازوے استفادہ ہا برد وجہانے مستفیض او بود۔ استاد مشہور ست بر ہمہ اصناف وانواع سخن ید طولے داشت در ریختہ فکر بلیغ نصیب او بود وہم در پارسی فکری فرمود۔ ہشت دیوان و دو تذکرہ ریختہ از نتائج افکار اوست و دیوانے وتذکرہ بپارسی یادگار او"

شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد نے انشا کو مصحفی پر ترجیح دینے کی بہت کوشش کی اور آبحیات میں زہر کے بوند ملائے کئی بے بنیاد افسانے تذکرے میں شامل کئے مگر مصحفی کی اُستادی تسلیم کرنے پر مجبور تھے۔ فرماتے ہیں:۔

"دیوان ان کی اُستادی کو مسلم الثبوت کرتے ہیں۔ انواع واقسام کی صدہا غزلیں ہیں۔ جو غزلیں نہایت سنگلاخ زمینوں میں لکھی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ شدت مشق سے کلام پر قدرت کامل پائی ہے۔ الفاظ کو پس وپیش اور مضمون کو کم وبیش کر کے اس دروبست کے ساتھ شعر میں کھپایا ہے کہ جو حق اُستادی کا ہے ادا ہوگیا ہے۔ ساتھ اس کے اصل محاورے کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ ایسے موقع پر کچھ نہ کچھ سودا کا سایہ پڑتا ہے۔ جہاں سادگی ہے وہاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میر سوز کے انداز پر چلتے ہیں۔ اسی کوچے میں اکثر شعر میر صاحب کی جھلک دکھاتے ہیں مگر جو ان کے جوہر ہیں وہ انھیں کے ساتھ ہیں۔ یہ اس ڈھنگ میں کہتے ہیں تو بھینڈے ہو جاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ طبیعت رواں تھی۔ پرگوئی کے سبب سے وہ لطف کلام پیدا نہ ہوا۔ غزلوں میں سب رنگ کے شعر ہوتے تھے۔ کسی طرز خاص کی خصوصیت نہیں۔ بعض تو صفائی اور برجستگی میں لاجواب ہیں بعض میں یہی معمولی باتیں ہیں جنھیں ڈھیلی ڈھیلی بندشوں میں باندھ کر بھُسپھُس برابر کہتے چلے گئے ہیں۔ اس کا سبب یا تو پُرگوئی ہے جس کی تفصیل آگے آتی ہے یا دلی اور امروہے کا فرق ہے۔

غرض شعر کی ہر شاخ کو لیا ہے اور جو قواعد وضوابط اس کے پُرانے اُستادوں نے باندھے ہیں ان کا حق حرف بہ حرف بلکہ لفظ بہ لفظ پورا ادا کیا ہے۔ ہاں اپنے ہمعصروں کی طرح طبیعت میں چلبلاہٹ اور بات میں شوخی نہیں پائی جاتی کہ کچھ اختیاری نہیں۔ خداداد بات ہے۔ سید انشا ہمیشہ قواعد کے رستے سے ترچھے ہو کر چلتے ہیں مگر وہ ان کا ترچھاپن بھی عجب بانکپن دکھاتا ہے۔ یہ بھی مطلب کو بہت خوبی اور خوش اسلوبی سے ادا کرتے ہیں مگر کیا کریں کہ وہ امروہہ پن نہیں جاتا۔ ذرا اکڑ کر چلتے ہیں تو ان کی شوخی بڑھاپے کا ناز بے نمک معلوم ہوتا ہے۔ سید انشا سیدھی سادھی باتیں بھی کہتے ہیں تو اس انداز سے ادا کرتے ہیں کہ کہتا اور سنتا گھڑیوں رقص کرتا ہے اور چٹخارے بھرتا ہے۔ ان کا یہ حال ہے کہ اُصول سے ناپ کر اور قواعد سے تول کر بات کہتے

ہیں پھر بھی دیکھو تو کہیں پھیکے ہیں اور کہیں میٹھے ہیں۔"

یہ سب کچھ صحیح مگر جس شخص کا قلم آٹھ دیوان لکھکر ڈالدے، اُسکی اُستادی میں کلام کرنا انصاف کی جان پر ستم کرنا ہے۔

اُردوئے معلیٰ مولانا حسرت موہانی جن کا سا صحیح نقادِ سخن دوبارہ پیدا ہونا دشوار ہے سنہ ۱۹۰۶ء میں تحریر فرماتے ہیں[1]:۔

"مصحفی کی ہمہ گیر وہمہ رنگ طبیعت نے کسی خاص رنگِ سخن پر قناعت نکرکے مشاہیر شعرائے متقدمین و متاخرین میں سے تقریباً ہر ایک کے اندازِ سخن کا پسندیدہ نمونہ پیش کیا ہے۔ وہ میر تقی کے رنگ میں میر حسن کے ہم پلہ سودا کے انداز میں انشا کے ہم پایہ اور جعفر علی حسرت کے طرز میں جرأت کے ہمنوا ہیں لیکن بہ حیثیت مجموعی اپنے ان سب ہمعصروں سے بہ اعتبار کمال سخندانی و مشاقی برتر ہیں اور یہی سبب ہے کہ راقم کی نگاہ میں میر و مرزا کے بعد کوئی اُستاد ان کے مقابلے میں نہیں جنچتا۔ معلوم نہیں کہ صاحب آبحیات نے کس بنا پر سید انشا کو مصحفی پر ترجیح دینے کی جابجا کوشش کی ہے۔ سید انشا کی طباعی اور قابلیت میں کس کو شبہ ہو سکتا ہے لیکن دربار لکھنؤ کی مجبوریوں نے ان کی ظرافت کو دائرۂ اعتدال سے خارج کرکے اُن کے کلام کو بقول شیفتہ ساقط الاعتبار بنادیا تھا۔ چنانچہ بنظر بحالات موجودہ اُنھیں مصحفی کے مقابل لانا مصحفی کی کمال توہین کرنا ہے۔"

گل رعنا حکیم عبدالحی مرحوم نے سنہ ۱۳۴۰ھ میں تذکرۂ گل رعنا لکھا۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"ان کی ہمہ گیر طبیعت نے کسی خاص رنگ پر قناعت نہیں کی انکے کلام میں کہیں میر کا درد ہے۔ کہیں سودا کا انداز۔ کہیں سوز کی سادگی اور جہاں کہیں ان کی کہنہ مشقی اور اُستادی اپنے پیشرو اساتذہ کی خوبیوں کو یکجا کردیتی ہے تو وہ اُردو شاعری کے بہترین نمونے قرار دئے جاسکتے ہیں۔ اس مجموعی حیثیت سے بقول حسرت موہانی میر و مرزا کے بعد کوئی اُستاد ان کے مقابلے میں نہیں جنچتا اور یہ اپنے ہمعصروں میں سب سے برتر اور سب سے فائق نظر آتے ہیں۔"

اس سے بڑھکر ثبوت مصحفی کے کمال فن کا کیا ہوسکتا ہے کہ جتنے اُستاد ان کے شاگردوں اور عقیدتمندوں میں سے نکلے اتنے آج تک کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوئے اور سچ پوچھو تو شعرائے لکھنؤ کے جتنے بھی سلسلے ہیں وہ سب مصحفی کے منت پذیر ہیں۔ شیخ امام بخش ناسخ کو گو انکار ہو مگر اس میں شک نہیں کہ وہ بھی بواسطہ یا بلا واسطہ انھیں کے مائدۂ سخن کے ریزہ چیں تھے۔ خواجہ حیدر علی آتش۔ میر مستحسن خلیق۔ میر مظفر حسین ضمیر۔ میر مظفر علی اسیر وغیرہ اس پائے کے لوگ ہیں جن کے دامنِ تربیت میں پرورش پاکر سیکڑوں اُستاد بن گئے۔ سب کو جانے دو میر خلیق کے فرزند میر ببر علی انیس اور میر ضمیر کے شاگرد مرزا سلامت علی دبیر کو لو جنھوں نے ہندوستان میں سخنوری کے ڈنکے بجائے ہیں اور اُردو شاعری کو معراج کمال تک پہونچا دیا ہے۔

دوسرا ثبوت انکی مشاقی اور اُستادی کا خود انکا کلام ہے جو آٹھ دیوان میں مشکل سے سما سکا ہے۔ اگر یہ سچ ہے کہ مصحفی اپنی غزلیں بیچا کرتے تھے تو جتنا موجود ہے اس کا سوایا اور رہا ہوگا۔ پھر اگر ان کے سارے دیوانوں میں صرف وہی اشعار چھانٹے جائیں جو ہر طرح سے بلند رتبہ ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ انشا کے مجموعۂ ہزل و غزل کے برابر ایک مجموعہ ان کے

[1] اُردوئے معلیٰ بابت جون سنہ ۱۹۰۶ء (جلد ۶ نمبر ۶)

منتخب اشعار کا تیار ہو سکتا ہے۔

شعر الہند مولانا عبدالسلام ندوی نے "شعر الہند" میں آبحیات کی تقلید کی ہے لیکن ان کو بھی اعتراف کرنا پڑا کہ مصحفی کا مرتبہ اپنے سب ہمعصروں سے بالاتر ہے۔

مصحفی کی شان انشا سے بالاتر ہے۔ ایک طرف تو اس دور سے پہلے کے تمام مشاہیر شعرا کی جھلک ان میں موجود ہے دوسری طرف اُنھوں نے اپنے دور کی روش کو بھی قایم رکھا ہے اس لئے جرأت کے طرز کے اشعار بھی ان کے یہاں بکثرت موجود ہیں اس کے ساتھ وہ ایک خاص بات میں تمام اساتذہ سے بڑھے ہوئے ہیں یعنی جو صفائی اور روانی ان کے کلام میں پائی جاتی ہے وہ میر، سودا اور جرأت و انشا کسی میں نہیں پائی جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں بھی جب اس خاندان کے لوگوں کو اسیر اور امیر کے دامن میں پناہ نہیں ملتی تو زبان کے لحاظ سے اپنے ابوالآبا مصحفی ہی کا سہارا ڈھونڈھتے ہیں۔ چنانچہ حافظ جلیل حسن جلیل فرماتے ہیں :-

اس سخن کا جلیل کیا کہنا　　مصحفی کی زبان ہے گویا

قدما کے کلام میں جو شتر گربگی۔ ناہمواری اور فحاشی پائی جاتی ہے باوجود اس پر گوئی کے اس سے بھی مصحفی کا کلام خالی ہے لیکن وہ کسی خاص رنگ کے پابند نہیں ہیں۔ چنانچہ مولوی محمد حسین آزاد لکھتے ہیں :-

"غزلوں میں سب رنگ کے شعر ہوتے تھے کسی خاص طرز کی خصوصیت نہیں"

اس لئے ان کے یہاں تغزل۔ معاملہ بندی۔ تصوف۔ اخلاق۔ فلسفہ۔ سب کچھ موجود ہے اور طرز ادا کی خوبی نے ہر رنگ کے اشعار کو دلآویز کر دیا ہے۔

رام بابو سکسینہ ان جوہر شناس نکتہ سنجوں کا تبصرہ ملاحظہ فرمانے کے بعد ایک بانگِ بے ہنگام سنئے۔ رام بابو صاحب سکسینہ مولف "تاریخ ادب اُردو" کہتے ہیں :-

"زیادہ تر غزلیں معمولی ہیں اور کسی خاص رنگ کی نہیں ہیں۔ بعض غزلوں کی زمینیں سودا کے تتبع میں نہایت سخت اور ردیف و قافیہ مشکل رکھے گئے ہیں اور گو کہ ان میں شاعری کا کمال دکھایا ہے مگر پھر بھی سودا کا سا زور، اور اُستادی نہیں پائی جاتی۔ اگرچہ میر تقی اور میر سوز کے تتبع میں بہت سے اشعار سادہ۔ فصیح اور دردناک لہجے میں کہے ہیں مگر پھر بھی مذکورہ بالا اُستادوں کی وہ بات کہاں مختصر یہ ہے کہ غزل میں ان کا کوئی خاص رنگ نہیں اور بعض اشعار کی عمدگی کو من اول الے آخرہ نباہ نہیں سکتے۔ یہی حال ان کے قصیدے کا بھی ہے جن میں قواعد کی پابندی اور الفاظ و معانی کی بلندی تو ضرور ہے مگر متقدمین کا زور اور شان و شکوہ پیدا نہیں ہو سکا۔ مختصر یہ کہ مصحفی کے کلام میں کوئی خاص بات نہیں"

فقیر کی صدا اس جدت پسندی کی طرف زیادہ توجہ کی ضرورت نہیں کیونکہ بابو صاحب نے مصحفی کے دواوین دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی۔ صرف آبحیات سے معائب نقل کر دئے ہیں اور محاسن کو فراموش کیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ مصحفی۔ میر و سودا۔ جرأت و انشا۔ نصیر و ذوق کے کمالات کے جامع تھے۔ لیکن یہ غلط ہے کہ ان کا کوئی خاص رنگ نہ تھا۔ خود ارشاد فرماتے ہیں :۔

مصحفی نظمِ غزل کے گرچہ عالم ہیں کئی دل مرا مائل ہے لیکن یاس و حرماں کی طرف

وہ عشق آباد کی سرکار میں حسرت و یاس کے مصور تھے۔ زمانے کی قدر ناشناسی کا دل پر داغ تھا۔ افلاس و تنگدستی کے ہمیشہ شکار رہتے تھے۔ خانگی زندگی بھی آلام و مصائب۔ ترددات و تفکرات میں بسر ہوئی تھی۔ لہٰذا جذبات درد و غم کے اظہار میں وہ صادق البیان تھے اور اس طرز کی شاعری میں میر تقی کے سوا کوئی ان کا مماثل و مقابل نہیں ہے۔ وہ ظرافت نگاری میں سودا اور انشا سے کم رتبہ ہیں لیکن تمسخر و استہزا کے سوا ہر رنگ میں وہ سودا سے بھی برتر ہیں۔

روندا تمام اس کو مرے رخشِ کلک نے سودا سے بچ رہا تھا جو میدانِ شاعری

اصلاح زبان کے اعتبار سے مصحفی وہ رشتۂ تسبیح ہیں جس نے شاہ حاتم اور مرزا مظہر جان جاناں کو ناسخ و آتش سے ملایا۔ ان کے کلام کو اسیر و امیر نے ترمیم کر کے شایع کیا لیکن قلمی دواوین سے ثابت ہے کہ وہ زبان قدیم کے شیدائی تھے۔ آخری وقت ناسخ کے ڈھنگ پر وہ بڑے بڑے خوبصورت الفاظ استعمال کرنے لگے تھے لیکن ان کا بیشتر کلام اگلے وقتوں کے محاوروں سے مملو ہے اور اس قدیم بول چال کو ایسی صفائی سے نظم کرتے ہیں، جو شیرینی ان کے بیان میں ہے وہ سودا و سوز۔ انشا و جرأت کے یہاں پائی نہیں جاتی

بن دیکھے جس کے پل میں آنکھیں بھر آئیاں ہوں کیا قہر ہے جو اس سے برسوں جدائیاں ہوں

پہلا دیوان دلی میں مرتب ہوا اور اس میں قدما کے بیشتر معائب موجود ہے۔ اس کو دیکھ کر میر حسن کے سے سخن سنج نے فتویٰ دیا کہ "مصحفی اپنے فن میں بے نظیر ہیں"۔ اگر دیوان سوم و چہارم ان کی نظر سے گزرتے تو وہ اس محضر پر صداقت کی مُہر کرتے کہ مصحفی کا سا جامع الکمالات نظمِ اُردو نے دوسرا نہیں دیکھا۔ روشن آرا کے مشاعروں تک ان کے کلام میں سادگی تھی مگر اس کے بعد معنی آفرینی کی کوشش نے اس لطف میں تخفیف کی اور مصوری جذبات کی جگہ صحت زبان و محاورات پر زیادہ توجہ مبذول ہونے لگی۔ اسوقت لکھنؤ سے دلی تک اسی سکہ کا چلن تھا اور سب شعرا معاصرین اسی کھوٹے درم کو "زرِ مغربی" بتاتے تھے۔ مگر مصحفی نے ستم یہ کیا کہ سست و بست اشعار کا انبار بھی غزلیات میں شامل رہنے دیا اور انتخاب کی زحمت گوارا نہ فرمائی۔ آبحیات کی روایت ہے کہ پانی پت کے ایک شخص لکھنؤ میں ملازم تھے۔ ان کے ہاں شیخ مصحفی بھی آیا کرتے تھے۔ ایک دن کاغذ کا جزو ہاتھ میں لئے آئے اور الگ بیٹھکر کچھ کہنے لگے۔ سامنے ایک ورق رکھا تھا اُسے دیکھ دیکھ کر اس طرح لکھتے جاتے تھے جیسے کوئی نقل کرتا ہے۔ ایک شخص نے پوچھا کہ حضرت یہ کیا ہے جس کی آپ نقل کر رہے ہیں لایئے میں لکھدوں۔ انھوں نے کہا کہ ایک شخص نے کچھ مضمون مثنوی میں لکھوانے کی فرمایش کی تھی۔ اس کا تقاضا مدت سے تھا۔ کچھ تو مجھے یاد نہ رہتا تھا کچھ فرصت نہ ہوتی تھی۔ آج اس نے بہت شکایت کی اور مطلب لکھ کر دیدیا۔

وہ نظم کررہا ہوں" یہ حکایت روانی طبع اور پرگوئی کا ثبوت ضرور ہے مگر جو نظم اس روا روی میں تیار کیجائے وہ درد و تاثیر سے لبریز کیونکر ہو سکتی تھی۔ بایں ہمہ جو شعر دل سے نکلتا وہ سننے والوں کے کلیجے برما دیتا اور ایسے اشعار کی تعداد کلیات مصحفی میں میر و سودا کے نشتر و خنجر سے زیادہ ہے۔

جب مصحفی جوان تھے اور ان کے دیوان اول و دوم چارسو شایع ہوتے تھے تو فخریہ کہا تھا کہ:-

جیتے ہی لکھے جاتے ہیں دیوان ہمارے
اور اس سے سوا مصحفی کیا ہو دیگی شہرت

بڑھاپے کے وقت تک کلام کی وہ عزت تھی کہ افلاس و تنگدستی کی حالت میں زبان پر آیا تھا۔

گو موے پر مرا دیوان مطلّا ہوئے
مصحفی میں تو تہیدست رہا دنیا میں

مگر چند ہی سال کے بعد ہوا پلٹ گئی۔ ناسخ و آتش نے مصحفی کی بنیاد پر بلند عمارتیں کھڑی کیں۔ غالب نے فلسفۂ محبت کے بیان میں۔ مومن نے واردات عشق کی داستان میں اس زمین کو آسمان بنایا۔ امیر و داغ اور انکے ہمعصروں نے بندش کی صفائی سے غزل میں نثر موزوں کا لطف پیدا کیا۔ مصحفی کے یہاں نہ متاخرین کا سا جوش و خروش تھا اور نہ وہ برجستگی و بے ساختگی۔ لیجے پر بھی قدامت کا اثر۔ آصف الدولہ کے خزانے میں ملکہ وکٹوریہ کا روپیہ کیونکر پایا جاتا۔ زبان کے چٹخارے نے عوام کو شعرائے جدید کا گرویدہ بنا دیا اور استاد الاساتذہ کا بیشتر کلام نایاب ہوگیا۔

ان کی قادر الکلامی صرف واقفان فن کی محفل میں تحسین و ستایش کی سزاوار رہگئی۔ البتہ یہ فضیلت کوئی مٹا نہیں سکتا کہ لکھنؤ اسکول کی کل شاعری انھیں کے خرمن کمال کی مرہون منت ہے۔ وزیر۔ رشک۔ و امانت کی الفاظ پرستی اور ان کے مقلدین کی یاوہ گوئی نے لکھنؤ کو بدنام کیا لیکن رند و صبا۔ نسیم و شوق۔ امیر و ریاض اور سب سے بڑھکر انیس و دبیر جنھوں نے اُردو کو علمی زبان بنایا اور نظم ریختہ کی شہرت بام فلک تک پہونچائی اسی گلزار مصحفی کے نہال سرسبز تھے اور ان سب نے مصحفی ہی کی آغوش تربیت میں پروردہ شاگردوں سے فیض پایا تھا۔

وہ اپنا مجھے مقتدا جانتا ہے
جو ہے مصحفی سالکِ راہِ معنی

امیر احمد علوی (بی۔ اے)

اُردو غزل گوئی میں مصحفی کا مرتبہ

اور

اس کا انفرادی رنگ

میرے ایک نوجوان دوست ہیں جنھوں نے اُردو کی ایک کتاب بھی نہیں پڑھی لیکن انگریزی کے ایم۔ اے ہیں اور ہندی لٹریچر کے ماہر۔ باتوں باتوں میں ان سے ذکر آیا کہ مصحفی پر کچھ لکھنے کی فکر میں ہوں تو انھوں نے کہا کیا "مصحفی اور مصحفن والے مصحفی ؟" یہ سُنکر مجھے خیال آیا کہ محمد حسین آزاد نے آب حیات لکھکر کم از کم اتنا تو کیا کہ اُردو شاعروں کے قصے کہانیاں بُھلائے جانے سے بچالئے۔ سچ پوچھئے تو "مصحفی اور مصحفن" کے فقرے میں اُس موڑ کا بھید چھپا ہوا ہے جہاں سے دلی کی غزل گوئی لکھنؤ کی غزل گوئی کی طرف پھر جاتی ہے۔ یہ فقرہ دلی اور لکھنؤ اسکول کے سنگم کو ظاہر کرتا ہے۔

دلی اسکول میں قریب قریب تمامتر ذکر عاشقی کا ہوتا ہے اور لکھنؤ اسکول میں معشوق کا۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ دلی والے داخلی شاعری پر جان دیتے تھے اور لکھنؤ والے خارجی شاعری پر مٹے ہوئے تھے۔ مصحفی اور مصحفن کو یکجا کر دینا دونوں اسکولوں کے میل کا شگون ہے انشا کی جس پھبتی کو نقل کر کے آزاد نے زندۂ جاوید کر دیا ہے اس میں معاملہ بندی اور خارجی شاعری کی وہ شان چھپی ہوئی ہے جو دلی کی شاعری کو لکھنؤ کی شاعری کی طرف لے جا رہی ہے۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ دلی اسکول میں خارجیت بالکل نہیں ہے لیکن یہ ایک داخلی قسم کی خارجیت ہے جیسی لکھنؤ اسکول میں یہ ایک خارجی داخلیت پائی جاتی ہے۔ میر کے یہ اشعار لیجئے جن میں خالص داخلیت پائی جاتی ہے:۔

نامُرادانہ زیست کرتا تھا
میر کا طور یاد ہے مجھکو

وصل اس کا خدا نصیب کرے
میر دل چاہتا ہے کیا کیا کچھ

لیکن ذیل کے اشعار داخلی خارجیت کی مثال میں پیش کئے جا سکتے ہیں:۔

کُھلا جو نشہ میں پگڑی کا پیچ اسکے میر
سمند ناز پر اک اور تازیانہ ہوا

کیونکہ نقاش ازل نے نقش ابرو کا کیا
کام تھا اک مُنھ پہ تیرے کھینچنا شمشیر کا

دلّی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی،

دوسرے شعر میں پُر تصنع خیال کے ساتھ زبان کی رنگینی کو دیکھئے۔ لیکن دلّی اسکول کا وہ شاعر جس کے یہاں داخلیت کے ساتھ خارجیت بھی کافی نمایاں ہے وہ سودا ہے —— کہا جا سکتا ہے کہ داخلی شاعری دل کی شاعری ہے اور خارجی شاعری دماغ کی۔ اگر یہ تقسیم صحیح ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ دل کی شاعری میر کا خاص حصہ ہے جس میں اس کا دماغ بھی حل ہو کر گھُل مل گیا ہے۔ لیکن ہاں اس عہد کے صف دوم کے شعرا (جیسے یقین، اثر، قایم وغیرہ) ضرور صرف دل کے شاعر ہیں اور اسی لئے میر سے ملتی جلتی ہوئی باتیں کہتے ہوئے بھی میر کی گہرائی اپنے نغموں میں پیدا نہ کر سکے۔ سوز البتہ اپنے خالص فطری احساس کی وجہ سے یقین، اثر اور قایم سے بڑھ جاتے ہیں اور درد نے چونکہ روحانیت کا سہارا لیا اسلئے ایک نمایاں شستگی و سنجیدگی ان کے لہجہ میں آگئی ہے۔

ہاں تو ایک سودا کو چھوڑ کر اُس زمانے کے دہلوی شعرا تمام تر داخلی رنگ میں غرق تھے۔ سوز و گداز، درد و غم، پسردگی و خستگی ان کی شاعری کی تنہا خصوصیت تھی اور ان کے تغزل پر کوئی خیالی تصویر آنکھوں کے سامنے نہ آسکتی تھی لیکن میر البتہ اتنا ہمہ گیر تخیل رکھتا تھا کہ اس نے خارجی شاعری کو بھی زیر نگیں کر لیا اور غالباً اُردو کے کسی غزل گو شاعر کے یہاں تصویر کھینچنے کے قابل اتنے اشعار نہ ملیں گے جتنے میر کے یہاں اور باوجود اس کے کہ داخلی شاعری میں عاشق زیادہ تر پیش نظر ہوتا ہے لیکن پھر بھی معشوق کی جتنی ادائیں، اس کے جتنے جلوے اس کی جتنی تصویریں کلیات میر میں ملتی ہیں اتنی سودا کے یہاں نہیں ملتیں۔

سودا کے کلام میں داخلیت کی چاشنی ہوتے ہوئے بھی خارجیت نمایاں ہے۔ لیکن اس کے یہاں داخلیت نے سوز و ساز اور درد و غم کا رنگ اختیار کرنے کے بجائے شگفتگی، البیلاپن، سرمستی، نشاط اور رنگینی اختیار کر لی ہے، کیونکہ جب داخلیت بجائے غم کے نشاط کی طرف متوجہ ہوتی ہے تو نشاط کی فطری وسعت شاعر کے دل کو دنیا کی رنگا رنگ بزم آرائیوں کی طرف لیجاتی ہے اور صحیح معنی میں خارجی شاعری کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔ پھر یہ نشو و نما محض خیال و مضمون تک پہونچکر نہیں رک جاتا بلکہ زبان و بیان پر بھی نمایاں اثر ڈالتا ہے۔

بے اعتدالی، تصنع یا کمزوری، داخلی اور خارجی شاعری دونوں میں پائی جا سکتی ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ داخلی شاعری میں یہ خرابی ایک گھنونے قسم کا مرثیہ پن پیدا کر دیتی ہے اور خارجی شاعری تو بگڑ کر نہ جانے کتنی شکلیں اختیار کر لیتی ہے، چنانچہ انشا، ناسخ، امانت، اور شاہ نصیر ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتے ہوئے بھی اسی بگڑی ہوئی خارجی شاعری کی روشن مثالیں ہیں۔ داخلی شاعری ہو یا خارجی شاعری شاعرانہ خلوص بڑی مشکل چیز ہے۔ شاعرانہ خلوص، شاعرانہ اصلیت میں جس نازک توازن اور جس رکھ رکھاؤ کی ضرورت ہے ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔

مصحفی سے پہلے دلّی کے مشہور شعرا کا نام لیا جا چکا ہے۔ اسی زمانہ میں مصحفی نے اپنے وطن امروہہ ضلع مراد آباد

کو خیر باد کہہ کر دلی میں غزل سرائی شروع کی اور اسی رنگ میں جو اسوقت وہاں مقبول تھا۔ مصحفی کے یہاں بہت کم ایسے اشعار ملیں گے جن میں داخلیت نہ ہو لیکن سوز و گداز کی تاثیر کم ہے۔ یعنی جو رنگ طبیعت سودا کا تھا وہ مصحفی کے یہاں زیادہ اُبھر آیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مصحفی کو تقلید (Imitation) اور انتخابیت (Eclecticism) کا حیرت انگیز ملکہ حاصل تھا لیکن میر کا سوز و گداز یا تو مصحفی نے پیدا کرنا نہیں چاہا یا اُن سے پیدا نہ ہو سکا، اب رہ گئے میر سے کمتر درجہ کے شعراء سو اُن کی کونسی بات مصحفی کے یہاں نہیں پائی جاتی۔ وہی زبان و بیان کی نرمی اور وہی خاموش سپردگی بلکہ اسی کے ساتھ ایک خاص قسم کی لطافت جو خالص داخلی رنگ کے شعراء کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔

اس معتدل، متوازن اور ہموار انداز میں مصحفی کی یہ غزل ملاحظہ ہو:-

دیکھ اس کو اک آہ ہم نے کر لی — حسرت سے نگاہ ہم نے کر لی
کیا جانے کوئی کہ گھر میں بیٹھے — اس شوخ سے راہ ہم نے کر لی
جب اس نے چلائی تیغ ہم پر — ہاتھوں کی پناہ ہم نے کر لی
نخوت سے جو کوئی پیش آیا — کج اپنی کلاہ ہم نے کر لی
دی ضبط میں جبکہ مصحفی جان — شرم اس کی گواہ ہم نے کر لی

اگر ان اشعار کے صوتی اثرات اور وجدانی کیفیات کا صحیح احساس ہم کر سکیں تو پتہ چلیگا کہ مصحفی کی شاعری محض انتخابیت، تقلید اور تتبع کا معجزہ نہیں ہے۔ بظاہر اس غزل میں میر کی تقلید معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقتاً اسمیں میر کی دل شکستگی، درد کی کم سخن سنجیدگی اور سوز کی سادگی سب شامل ہیں۔ مصحفی نے میر کی پیروی کی ہے لیکن ہمیشہ ذرا کترا کے کی ہے۔ میر کہتا ہے:-

ہوگا کسو دیوار کے سایہ میں پڑا میر — کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو
ہنستا تھا کسی سے کچھ تکتا تھا کسی کا منھ — کل میر کھڑا تھا یاں سچ ہے کہ دوانہ تھا

مصحفی کہتا ہے:-

کبھو تک کے در کو کھڑے رہے کبھی آہ بھر کے چلے گئے — ترے کوچہ میں جو ہم آئے بھی تو ٹھہر ٹھہر کے چلے گئے

میر کا پہلا شعر شدت احساس کا معجزہ ہے۔ لیکن مصحفی کے شعر میں جو فطری واقعیت اور محاکاتی خصوصیت پائی جاتی ہے وہ مصحفی کو میر سے الگ کر رہی ہے، مصحفی کے اور اشعار سنئے:-

ہم تو اس کوچہ میں گھبرا کے چلے آتے ہیں — دو قدم جاتے ہیں پھر جا کے چلے آتے ہیں
وہ جو ملتا نہیں ہم اسکی گلی میں دل کو — در و دیوار سے بہلا کے چلے آتے ہیں

گلی سے اسکی جاتا ہو تو کیا اک چشم حسرت سے
دلِ مسکیں بسوئے رخنۂ در دیکھ لیتا ہے

جذبات کی میانہ روی تخئیل و وجدان کو قدم بہ قدم اس خارجیت کی طرف بڑھائے چلی ہے جہاں سے ہم مصحفی کو دلی اور لکھنؤ اسکول کے دوراہے پر کھڑے یا آگے بڑھتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اسی داخلی خارجیت سے اس معاملہ بندی کا شگون بھی ہوتا ہے جو لکھنؤ میں جرأت کے ہاتھوں کہاں سے کہاں پہونچ گئی اور انشا اور رنگین کے ہاتھوں کہاں سے کہاں بہک گئی۔ مصحفی کی ایک مشہور غزل ہے:۔

کھینچ کر تیغ یار آیا ہے
اس گھڑی سر جھکا دئے ہی بنے

یار کا صبح پر ہے وعدۂ وصل
ایک شب اور بھی جئے ہی بنے

اب تو اس درد دل کی تاب نہیں
مصحفی کچھ دوا کئے ہی بنے

مصحفی کا پہلا شعر میر کے اس شعر سے ملا کر دیکھئے:۔

ابھی ہوں منتظر جاتی ہے چشم شوق ہر جانب
بلند اس تیغ کو ہونے تو دو سر بھی جھکا دوں گا

میر و مصحفی میں وہی فرق ہے جو دوپہر اور غروب آفتاب کے وقت میں پایا جاتا ہے اور جس طرح شام کو آفتاب میں ساتوں رنگ جھلکنے لگتے ہیں اسی طرح رنگین فضا میں وہ خارجیت نکھرتی اور سنورتی ہے جس کی جھلک مصحفی کی شاعری میں ملتی ہے۔ اگر ہم سنگیت کے استعارہ کو کام میں لائیں تو کہہ سکتے ہیں کہ مصحفی کے نغموں میں وہی دلفریب کیفیت پیدا ہو گئی ہے جو آواز میں تپی لگ جانے سے پیدا ہوتی ہے۔

اب مصحفی کے چند ایسے اشعار سنئے جن پر میر یا میر کی تقلید کا دھوکا ہو سکتا ہے لیکن دونوں کے وجدان و لہجہ کے لطیف و نازک فرق کو نظر انداز نہ کرنا چاہئے۔ ان اشعار میں میر کا سوز نہیں ہے لیکن مصحفی کا ساز ضرور ہے۔ شدت تاثیر نہیں ہے لیکن ایک نرم کیفیت ضرور ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ میر کی ماورائی سادگی (Transcendent Simplicity) اور معصومیت نے ایک نیا رنگ اختیار کر لیا ہے اور جذبات کی پاکیزگی و دوشیزگی میں کچھ شباب کے کیفیات بھی پائے جاتے ہیں۔

خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا
ہجر تھا یا وصال تھا کیا تھا

جس کو ہم روزِ ہجر سمجھے تھے
ماہ تھا یا وہ سال تھا کیا تھا

مصحفی شب جو چپ تو بیٹھا تھا
کیا تجھے کچھ ملال تھا کیا تھا،

یادِ ایام بے قراریٔ دل
وہ بھی یارب عجب زمانہ تھا

ہم سمجھے تھے جس کو مصحفی یار
وہ خانہ خراب کچھ نہ نکلا

پیار تو آیا تھا میرے جی میں رات
پر میں تیری وضع سے ڈر کر گیا

ایسا ہی گیا جلد کہ پھر منہ نہ دکھایا ۔۔۔ وہ سروِ رواں اپنی مگر عمرِ رواں تھا
ہم سے خبرِ مصحفیِ خستہ نہ پوچھو ۔۔۔ تم آپ ہی سوچو نہ میاں دل میں کہاں تھا

کل قافلۂ نکہتِ گل ہوگا روانہ ۔۔۔ مت چھوڑیو تو ساتھ نسیم سحری کا
چلی بھی جا جرسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم ۔۔۔ کہیں تو قافلۂ نوبہار ٹھہرے گا[1]

حادثے ہوتے ہیں زمانے میں ۔۔۔ اس قدر انقلاب کس دن تھا[2]
مصحفی آج تو قیامت ہے ۔۔۔ دل کو یہ اضطراب کس دن تھا

بھٹکا پھرے ہے تیرے دل اک ادا کا مارا ۔۔۔ کہ کس طرف کو جائے اب یہ خدا کا مارا
زلفوں سے اسکی اے دل ہے مجھکو کیا سروکار ۔۔۔ پھرتا ہوں میں تو اپنے آپ ہی بلا کا مارا
وہ صیدِ خوں گرفتہ جیتا بچا نہ ہرگز ۔۔۔ جو صید گہ میں تیری آیا قضا کا مارا

داغ دیکھے تھا کھڑا لالۂ صحرائی کا ۔۔۔ زورِ عالم نظر آیا ترے سودائی کا

افشائے عشق بعد خدا جانے کیا بنے ۔۔۔ جب تک حجاب تھا یہی امید و بیم تھا

جنبشِ لب نے تری میری زباں کردی بند ۔۔۔ تو نے کچھ پڑھ کے عجب مجھ پہ یہ منتر مارا
بھڑک اٹھا میں نسیم سحری، تو نے تو ۔۔۔ دامن ایسا ہی مرے آتشِ دل پر مارا
مصحفی عشق کی وادی میں سمجھ کر جانا ۔۔۔ آدمی جائے ہے اس راہ میں اکثر مارا

کیا یار کے دامن کی خبر پوچھو ہو ہم سے ۔۔۔ یاں ہاتھ سے اپنا ہی گریبان گیا تھا

مصحفی کہتے ہیں راہ عشق میں مارا پڑا ۔۔۔ کون جانے کیا ہوئی اس بیوطن کی سرگزشت

شمعِ شبِ فراق بنے ہم تو مصحفی ۔۔۔ ہم دل جلوں کو عیش کی محفل سے کیا خبر

اے مصحفی بتا تو کیا کچھ خوشی ہوئی ہے ۔۔۔ ہے ان دنوں جو تیرا چہرہ بحالیوں پر

بیگانگی ہے اس کی ملاقات میں ہنوز ۔۔۔ واحسرتا کہ فرق ہے دن رات میں ہنوز

وہی ٹھوکر ہے اور وہی انداز ۔۔۔ اپنی چالوں سے تو نہ آیا باز

ہم پہ وہ مایہ کہاں لیک زروئے تقریب ۔۔۔ جا کھڑے رہتے ہیں ہم اسکے خریدار کے پاس

---

[1] بے ساختہ میر کا یہ شعر یاد آگیا:-

رنگِ گل و بوئے گل ہوتے ہیں ہوا دونوں ۔۔۔ کیا قافلہ جاتا ہے تو بھی جو چلا چاہے

لیکن مصحفی کی انفرادیت علٰحدہ نمایاں ہے۔ [2] میر کہتا ہے:- "مصائب اور تھے پر دل کا جانا ؛ عجب اک سانحہ سا ہوگیا ہے" میر کے یہاں بے پناہ سوز ہے لیکن مصحفی کے یہاں وہی سوز کم ہو کر اک نرم ساز ہوگیا ہے۔

یار کرتا نہیں نگاہ افسوس،
چشم پوشی ہے اس کی آہ افسوس

مصحفی کر نہ عبث شکوۂ ایام فراق
اگلی نسبت تو بہت ہے ترے حالات میں فرق

گرچہ ہیں قہر سادی آنکھیں بھی
پر غضب ہے خمار کا عالم

تھے جو جنوں زدہ گئے زنجیر کی طرف
ہم کو قضا جولائی تو شمشیر کی طرف

اور سب تم سے ورے بیٹھے ہیں
ایک ہم ہیں کہ پرے بیٹھے ہیں

پھٹ چکا جب سے گریباں تب سے
ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں

شیشۂ مے کی طرح اے ساقی
چھیڑ مت ہم کو بھرے بیٹھے ہیں

قتل کا کس کے ارادہ ہے جو آپ
ہاتھ قبضہ پہ دھرے بیٹھے ہیں

مصحفی یار کے گھر کے آگے
ہم سے کتنے نکھرے بیٹھے ہیں

ہوئی نہ ساز مری اُسکی صحبت شب ہائے
ادھر سے عجز اُدھر سے رکھائیاں ہی رہیں

جس بیابان خطرناک میں اپنا ہے گزر
مصحفی قافلے اس راہ میں کم نکلے ہیں

بن دیکھے جس کو پل میں آنکھیں بھر آئیاں ہوں
کیا قہر ہو جو اس سے برسوں جدائیاں ہوں

ٹک رحم کر و چاک گریباں پہ میرے
یارو کوئی اس شوخ کے داماں کو نہ چھیڑو

ہماری بزم سے اے مصحفی سحر ہوکے
گیا ہے ہوکے وہ بیزار دیکھئے کیا ہو

ایک دن روکے نکالی تھی ہیں واں کلفت دل
آجتک دامن صحرا ہے غبار آلودہ

میں ترے واسطے سر ٹیکوں ہوں دیواروں سے
چین کس طرح تجھے خانہ خراب آتا ہے

دامن کی اک جھپک نے مدہوش کر دیا ہے
مثل چراغ ہم کو خاموش کر دیا ہے

تم رات وعدہ کرکے جو ہم سے بچلے گئے
پھر تب سے خواب میں بھی نہ آئے بھلے گئے

پکارتا ہے تجھے مصحفی جواب تو دے
کھڑا رہے یہ ترے آستاں پہ یا پھر جائے

حیران ہے کس کا جو سمندر
مدت سے رکا ہوا کھڑا ہے

تو دیکھتے ہی اس کو جو دیوانہ ہو گیا
سچ کہیو مصحفی ترے کیا جی میں آگئی

کبھی روئے کبھی پیٹے شب تنہائی میں
ہم کو ساتھ اپنے عجب طرح کی صحبت گزری

ملو ہو غیروں سے اور ہم سے بیوفائی ہے
یہ کون شیوہ ہے کیا رسم آشنائی ہے

ازبس کہ مرے دیدۂ حیران میں کچھ ہے
اک ان میں دل کچھ ہے تو اک آن میں کچھ ہے

جادو تو میں کہتا نہیں پر سمجھوں ہوں اتنا
واللہ تری نرگس فتان میں کچھ ہے

خالی ہی چلے آتے ہیں ہم سیرِ چمن سے — داماں میں کچھ ہے نہ گریباں میں کچھ ہے
اُٹھنے لگے جو وہ مری بالیں سے وقتِ نزع — نکلا یہی زبان سے آہستہ کیا چلے
کوئی اُس کوچہ میں اک آہ تو بھر جاتا ہے — نہیں معلوم کہ کیا نام ہے اس کا لیکن
یوں تو محمل کئی یاں گردِ سفر سے نکلے — حیف ہے محمل لیلیٰ نہ نمودار ہوا

مندرجۂ بالا اشعار کا اندازِ بیان بالکل میر کا سا ہے لیکن چشمِ حقیقت بین سمجھ سکتی ہے کہ بجائے میر کے ان میں سودا کا رنگ زیادہ جھلکتا ہے۔ شعرائے دلی میں اگر کوئی شخص سودا کے انداز پر لیا یا تھا تو وہ ذوق تھے، ورنہ دلی اسکول کی تمام تر روایت وہی رہی ہے جو میر کے رنگ سے وابستہ ہے۔ لیکن سودا کے رنگ کو اگر کسی نے واقعی فروغ دیا تو وہ شخص مصحفی ہے۔

اس مضمون کے دوران میں یکایک خیال آیا کہ اگر مصحفی کا تمام تر کلام میر، سودا، انشا اور جرأت ہی کے رنگ و انداز میں ہے یعنی اگر مصحفی کی اُستادی تمام تر تقلید ہے تو مصحفی کا اپنا کیا ہے؟ اُس شاعر کا کلام قدرِ اول کی چیز نہیں ہو سکتا جو صاحبِ طرز نہیں جس میں انفرادی خلاقی نہ ہو جو ایک الگ شاعرانہ شخصیت نہ رکھتا ہو۔ حقیقی شاعر ایک نئے ذوق کی داغ بیل ڈالتا ہے ہمارے قدیم احساسات کو نئے طریقوں سے چونکاتا ہے۔

ایک زمانہ ہوا جب میں نے مولوی اسمٰعیل کی مرتب کردہ "تزکِ اُردو" میں، جو میرے نصاب میں شامل تھی غالباً پہلے پہل مصحفی کا نام دیکھا اور سُنا۔ اب میرے جذبات کا حال سنئے۔ سب سے قابلِ توجہ بات تو یہ تھی کہ مصحفی کا تخلص وہ لفظ تھا جس کی صورت و آواز نے فوراً مجھ پر اپنی دلکش انفرادیت کا اثر ڈالا۔ اس کے بعد مولوی اسمٰعیل کا یہ مختصر نوٹ پڑھ کر مجھے غصے کا احساس ہوا کہ "مصحفی ہیں تو مشہور لیکن ان کے کلام میں کوئی انفرادیت نہیں، کہیں میر کی سادگی ہے کہیں سودا کی شان و شکوہ"۔ میں نے اسوقت تک مصحفی کا کلام نہیں دیکھا تھا لیکن نہ جانے کیوں کچھ ایسا نیم شعوری احساس ہوا کہ مولوی اسمٰعیل یا تو دھوکا کھا رہے ہیں یا دھوکا دے رہے ہیں جس شخص کا تخلص اتنا حسین ہو وہ نقال نہیں ہو سکتا اسکے بعد سے ابتک میں مصحفی سے آہستہ آہستہ متاثر ہوتا رہا اور مصحفی کی انفرادیت میرے وجدان پر اپنا کام کرتی رہی۔ غصہ تنقید میں کار آمد ضرور ہے لیکن اس سے پوری مدد نہیں ملتی اور مجھے بسا اوقات یہ فکر رہی کہ مصحفی کے خاص رنگ کو کس طرح اُجاگر کیا جائے۔ یہ مسئلہ جو میرے لئے ایک دلکشی بھی رکھتا تھا اور جس سے میں ڈرتا بھی تھا آج پھر سامنے آگیا۔

غور کرنے سے میر و سودا کے مخصوص رنگوں میں جو امکانات چھپے ہوئے ہیں وہ ذہن میں آنے لگے۔ اس سلسلہ میں ایک ایسا اہم اُصول دھیان میں آیا جس پر جہاں تک مجھے معلوم ہے کسی نے روشنی نہیں ڈالی۔ وہ اصول یہ ہے کہ غم آمیز وجدان میں تنوع کے اتنے امکانات نہیں ہوتے جتنے نشاط آمیز وجدان میں ہوتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ

مصحفی کے یہاں بہ نسبت میر کے تنوع زیادہ پایا جاتا ہے۔ مصحفی کے وہ اشعار جو میر کی یاد دلاتے ہیں کافی تعداد میں اس مضمون میں دئے جا چکے ہیں۔ ان میں سے قریب قریب ہر شعر میر کے اشعار کے مقابلہ میں ہلکا ہے، لیکن ان دونوں میں وہی فرق ہے جو تیز درد اور میٹھے میٹھے درد میں پایا جاتا ہے یہی فرق سودا اور میر کے درمیان پایا جاتا ہے اور یہیں سے سودا کی وہ نمایاں خصوصیت شروع ہو جاتی ہے جو اُسے میر۔ درد۔ سوز اور ان کے ہمنوا شعراء سے الگ کرتی ہے اور جس سے مصحفی کی طبیعت کو بھی خاص ربط اور خاص مناسبت ہے۔ لیکن ان دونوں کے نشاط آمیز وجدان میں بھی فرق پایا جاتا ہے۔ اور اسی لئے جب میں یہ کہتا ہوں کہ مصحفی سودا کا ہمنوا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ سودا کی آواز بازگشت ہے۔

آزاد نے لکھا ہے کہ ایک مشاعرے میں جب مصحفی نے یہ شعر پڑھا:۔

دے پیچ اُدھر زلف اُڑا لے گئی دل کو — باتوں میں اِدھر لعل فسوں گر نے لگایا

تو میر کو اس شعر نے چونکا دیا اور مصحفی سے میر نے اسے دوبارہ پڑھنے کی فرمائش کی۔ جب میں نے آبِ حیات میں اپنے لڑکپن میں یہ روایت پڑھی تو مجھے کچھ حیرت ہوئی۔ حیرت اس وجہ سے تھی کہ مصحفی کا یہ شعر میر کے رنگ میں نہیں ہے۔ پھر بھی میر کو اس شعر نے متوجہ کر لیا۔ اب معلوم ہوا کہ یہ شعر خارجی اور داخلی دونوں طرح اتنا مکمل ہے کہ میر سے بھی نہ رہا گیا۔ اب میں وہ اشعار مصحفی کے پیش کرتا ہوں جن سے مصحفی و سودا کا فرق نمایاں ہوتا ہے:۔

وصل میں ایسے سے ڈھونڈھے کوئی کیونکر وا شُد — جن نے سو ناز سے اک بندِ قبا باز کیا

ملزم تری باتوں سے ہمیں آپ ہی ہونا — اور تجھکو کسی بات میں الزام نہ دینا

جس کے نہ لگا زخم تری کج نظری کا — کیا ہوئے الم اس کو خراش جگری کا

اے مصحفی افسوس کہاں تھا تو دوانے — کل اسکے تئیں ہم نے عجب آن میں دیکھا

جب کوہ و بیاں میں جا ہمنے قدم مارا — فرہاد نہ کچھ بولا مجنوں نے نہ دم مارا

اس دل میں تیرے ملنے کا ارمان رہ گیا — یہ دل تڑپ تڑپ کے مری جان رہ گیا

کل اسے میں لے چلا تھا سیر گلشن کی طرف — کچھ سمجھ کر ساتھ سے میرے وہ ٹل کر رہ گیا

تجھے اے مصحفی کب ہے خبر درد محبت سے — نہ لے تو آگے میرے نام لے بیدرد درماں کا

خورشید کو سائے میں زلفوں کے چھپا رکھا — چتون کی دکھا شوخی سرمے کو لگا رکھا

جسدم کہ وہ کمر میں رکھ کر کٹار نکلا — جس رہ گزر سے نکلا عالم کو مار نکلا

کیا نظر آیا مجھے اس میں کہ میں نے روزِ وصل — لب تلک لے جا کے جامِ آبِ حیواں رکھ دیا

یہ ادا دیکھ کہ کتنوں کا ہوا کام تمام — نیمچہ کل جو ٹک اس عربدہ جو کا نکلا

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم　　ترے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

مہر و مہ اس کے تئیں دیکھ کے حیران رہے　　جب ورق یار کی تصویر دو رو کا نکلا

تو گیا پیارے سفر کو چھوڑ کر میرے تئیں　　رفتہ رفتہ میں ترے جی سے بسر کر رہ گیا

دامن ترا بنے گا گریبانِ عاشقاں　　گر یوں ہی ٹھوکریں دم رفتار کھائیگا

شب ہجراں تھی میں تھا اور تنہائی کا عالم تھا　　غرض اس شب عجب اک بے سروپائی کا عالم تھا

حسن اس کا اب سماں کچھ اور دکھلانے لگا　　چاند سا پردے سے وہ مکھڑا نظر آنے لگا

یا وہ عالم تھا کہ کوئی اس سے واقف بھی نہ تھا　　یا یہ عالم ہے کہ عالم اس پہ مر جانے لگا

رونے سے کام بسکہ شب اے ہمنشیں رہا　　آنکھوں پہ کھینچتا میں سر آستیں رہا

ٹوٹے تھے اسکے تیر جو سینے میں اب تلک　　پیکاں کے بعد نکلے ہے پیکان دوسرا

سلسلہ اک نظر پڑا موج ہوا کے پاؤں میں　　پیچ جو کھل گیا کبھی سنبل تاجدار کا

لا، ہوا بروئے خاک رنگ شفق بر آسماں　　خون کہاں کہاں گرا زخم دلِ فگار کا

خونِ بسمل سے ہے اس ساعد نازک پہ بہار　　تم نے گو پھینک دیا ہاتھ سے خنجر اپنا

مصحفی گرچہ خفا ہم سے وہ رہتا ہی وے　　ذکر آجائے ہے اس بزم میں اکثر اپنا

عشوہ و ناز و ادا اس کے یہی کہتے ہیں　　لے سکے نام تو یاں کوئی شکیبائی کا

سرعت کم نہیں کچھ وہ تیغ تیز جس نے　　لاکھوں کا کر دیا ہے دم میں چراغ ٹھنڈا

کبھی یوں ہی بھی ملو تم تو مہربانی ہے　　غرض وہ وصل کا وعدہ تو در کنار رہا

ترے ہی غم کی لگے ہم خوشامدیں کرنے　　جہاں میں جب کوئی اپنا نہ غم گسار رہا

ملنے نہ آئے کبھی مصحفی سے تم افسوس　　امیدوار تمہارا امیدوار رہا

جو بھرا کے اس نے منہ کو بقفا نقاب الٹا　　ادھر آسمان الٹا ادھر آفتاب الٹا

رنگ، روپ، صورت و شکل، سجاوٹ اور نکھار کا آئینہ دار جتنا مصحفی کا کلام ہے اتنا اردو کے کسی اور غزل گو کا کلام نہیں۔ یہ بات جتنے مختلف عنوانوں سے جتنی واقعیت اور اصلیت لئے ہوئے مصحفی کے یہاں ہے وہ میر۔ سودا جرأت۔ انشا۔ غالب۔ ذوق۔ ظفر۔ مومن۔ داغ اور امیر کسی کے یہاں بھی نہیں پائی جاتی۔ اس کا کلام ایک تصویر خانہ (Picture Gallery) ہے۔ لکھتا ہے:-

بھیگے سے ترا رنگ حنا اور بھی چمکا　　پانی میں نگاریں کفِ پا اور بھی چمکا

جوں جوں کہ پڑیں منہ پہ ترے مینھ کی بوندیں　　جوں لالۂ تر حسن ترا اور بھی چمکا

پیرہن سے ہے جھلکتا بدنِ سُرخ ترا — زیرِ شبنم نہیں چھپتا چمن سُرخ ترا

شب اک جھلک دکھا کر وہ مہ چلا گیا تھا — ابتک وہی سماں ہے غرفے کی جالیوں پر

اک قرصِ ماہ کے نظر آتے ہیں سو ہلال، — عارض پہ اسکے طرۂ پرخم کی سیر کر

دل لے گیا ہے میرا وہ سیم تن چرا کر — شرما کے جو چلے ہے سارا بدن چرا کر

ہونے دے خوش کسی کو پیچ کہہ تو کیا کریگا — موجِ تبسم اپنی اے خوش دہن چرا کر

چہرے پہ نازکی سے ہے جوشِ شکستِ رنگ — یہ تازہ گل ہے لالہ فروشِ شکستِ رنگ

یوں ہے ڈلک بدن کی اس پیرہن کی تہ میں — سرخی بدن کی چھلکے جیسے بدن کی تہ میں

آستیں اُسنے جو کہنی تک چڑھائی وقتِ صبح — آ رہی سارے بدن کی بے حجابی ہاتھ میں

جہاں تک صورت و رنگ (Form & Colour) یا خالص احساس رنگ (Colour Sense) کا تعلق ہے مصحفی کی اس خصوصیت کا مجمل احساس مجھے پہلے سے تھا لیکن کچھ دن ہوئے ہمایوں میں کسی کا مضمون مصحفی کی "تشکیل بیان" پر شایع ہوا تھا، اس کے مطالعہ نے مصحفی کی اس انفرادی صفت کو مجھ پر زیادہ واضح کر دیا۔ آج تک اُردو کے کسی غزل گو کے کلام میں رنگ کا لفظ اتنی بار نہیں آیا ہے جتنی بار مصحفی کے یہاں آیا ہے اور مصحفی کو اس لحاظ سے ہم اگر حواسِ خمسہ کا شاعر کہیں تو بجا ہوگا۔ کچھ اشعار اور سنئے :-

مجھے رحم آئے ہے حسرت پہ آہ اس مُرغِ بے پر کے — کہ اُڑ سکتا نہ ہو اور ہو بزیرِ آشیاں بیٹھا

حسرت پر اس مسافرِ بیکس کے رویئے — جو تھک کے بیٹھ جاتا ہو منزل کے سامنے

ان اشعار سے مصحفی کی ایک اور خصوصیت نمایاں ہوتی ہے اور وہ خصوصیت "ترسنے" کی ہے۔ یونان کی میتھالوجی میں ٹنٹالس (Tantalus) نامی ایک نوجوان کو ایک کنوئیں میں اُلٹا لٹکا دیا جاتا ہے اس کنوئیں میں پانی بھی ہو اور سیب سے لدے ہوئے درخت بھی، لیکن پانی تک اس کے ہونٹ اور پھلوں تک اس کے ہاتھ پہونچ پہونچ کر رہجاتے ہیں۔ اس کشمکش کو (Tantalizing) کہتے ہیں اور انگریزی لفظ (Tantalize) اسی سے نکلا ہے اور اس رنگ میں مصحفی کا کوئی حریف نہیں۔ یہ احساس محض مصحفی کے مضمون اور مفہوم سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس کے لہجہ اور اس کے اشعار کے صوتی اثر اور وجدانی فضا سے پیدا ہو جاتا ہے۔ جرأت کی معاملہ بندی میں اس قسم کی مثالیں ملتی ہیں، لیکن جس طرح میر و سودا کے رنگ کو ایک نرم کسک اور ایک معتدل انداز دیکر مصحفی نے اپنی انفرادیت نمایاں کی ہے اسی طرح وہ جرأت کی معاملہ بندی کو بھی اپنے خاص انداز میں بدل دیتا ہے۔ اب میں ان اشعار کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے جو معاملہ بندی کے مضامین سے عموماً الگ ہیں پھر آگے بڑھتا ہوں۔ سودا کے انداز میں سودا سے الگ مصحفی کی آواز پھر سنئے :-

نہ تنہا مصحفی ہی اسکے ہاتھوں سے ہے آوارہ
کوئی بھی چین سے یارو نہ زیرِ آسماں بیٹھا

تجھے کس نے روک رکھا ترے جی میں کیا یہ آئی
کہ گیا تو بھول ظالم اِدھر التفات کرنا

بارے اب تم بھی لگے خونِ غریباں کرنے
ہاتھ میں تم نے بھی تلوار سنبھالی کیا خوب

جبکہ تو اس میں سے جھانکے ہے ستاروں کی طرح
جگمگاتی ہے ترے غرفے کی جالی کیا خوب

اس گل کی باغ میں جو صبا نے چلائی بات
غنچے نے مسکرا کے کہا میں نے پائی بات

اے زبانِ تیشہ کہہ کچھ کوہکن کی سرگزشت
یعنی آخر کیا ہوئی اس بیوطن کی سرگزشت

نالہ جاتا ہے تا بہ عرشِ بریں
ہے شبِ ہجر کی یہی معراج

ہے دوا اس مریض کی تجھ پاس،
جس کا عیسیٰ بھی کر سکے نہ علاج

کب کا اک عمر سے جھگڑا ہے دل و جاں کے بیچ
کام دونوں کا کیا یار نے اک آن کے بیچ

چمکے ہے کچھ وہ ابروئے خمدار بے طرح
چلتی ہے آپ ہی آپ یہ تلوار بے طرح

ہمسائگی پہ یار کے کیا دل کو خوش کروں
مجھ سے تو ہے کھنچا وہ حیادار بے طرح

سحر ہے رخ پہ ترے زلفوں کے بل کھانے کی طرح
سیکھے کوئی تجھسے پیارے دل کے لیجانے کی طرح

کل جو وہ رستہ میں ناگہ مل گیا۔ تھی دیدنی
میرے رہجانے کی وضع اور اسکے رک جانے کی طرح

کہاں تلک پھریں اُڑتے اِدھر اُدھر صیاد
ترے ہی نذر ہیں اب لے یہ مشتِ پر صیاد

وہ خوں گرفتہ ہوا کون قابلِ فتراک
جو آج دامنِ زیں ہے بہار پر صیاد

خدا کے واسطے چوبِ قفس کو سرخ نہ کر
ہمارے قتل پہ باندھے ہے کیوں کمر صیاد

بھلا تمیز تو کر بوئے مشک و گیسو میں،
رہی ہے بادِ صبا تو بھی تو ختن میں دیر

اس تیغ زن کو یارو مرے دل سے کیا خبر
قاتل کو بے قراریٔ بسمل سے کیا خبر

منھ اُٹھ گیا جدھر کو ادھر ہی چلے گئے
آوارگانِ شوق کو منزل سے کیا خبر

شمعِ شبِ فراق سے بنے ہم تو مصحفی
ہم دل جلوں کو عیش کی محفل سے کیا خبر

یوں ہے نقاب اس بتِ بےپیر کے منھ پر
جیسے ورقِ سادہ ہو تصویر کے منھ پر

کیا جانئے کسے ذبح کئے آئی ہے کافر
ہے آج تو سرخی تری شمشیر کے منھ پر

گو غیر کی خواہش ہے ترے دل میں تو ہوئے
یہ بات نہ رکھ عاشقِ دلگیر کے منھ پر

عزت نہیں اس صید کی کچھ صیدِ حرم میں
جو صید کہ آیا نہ ترے تیر کے منھ پر

تھا سرخ پوش وہ گل شاید چمن کے اندر
شعلہ سا شب پھرے تھا سرو و سمن کے اندر

جو ہاتھ دلبروں کے دامن کو کھینچتے تھے — وہ کھنچ کے رہ گئے ہیں کیسے کفن کے اندر
گورے بدن کا عالم اُسکے میں رات دیکھا — اک نور کا جھمکڑا تھا پیرہن کے اندر
شکوہ کا نامہ اُس نے وہ خوں چکاں لکھا تھا — چھریاں دھری تھیں جیسی ہر اک شکن کے اندر
آسودگان خاک کے عالم کی سیر کر — کیا چپ پڑے ہیں محفلِ ماتم کی سیر کر
اے مصحفی بہار کے دن ہیں یہ بے نصیب — چل تو بھی باغ میں گل و شبنم کی سیر کر

مصحفی کی اس خصوصیت کو تو سبھی نے مانا ہے کہ وہ سنگلاخ سی سنگلاخ زمین کو پانی کر دیتا ہے۔ اسی مضمون میں کتنے شعرا ایسے ملیں گے کہ روہیں آپ پڑھ جاویں گے اور اس طرف مطلق دھیان نہ جائے گا کہ زمین کتنی سنگلاخ تھی آپ انشا اور مصحفی کے معرکوں کے سلسلہ کی وہ غزلیں پڑھئے جس کے قافیہ اور ردیف ہیں "مغرور کی گردن"، "لنگور کی گردن" آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ مصحفی انشا سے کتنا بڑھ گیا ہے۔ اخیر کے چند اشعار یہاں نقل کرتا ہوں جن سے مصحفی کی انفرادیت پوری طرح ظاہر ہوتی ہے:۔

انصاف کیا اس کا میں اب شہ کے حوالے — جھکتی ہے جہاں مار کی اور مور کی گردن
جس سر پہ ٹک اپنا وہ رکھے دستِ نوازش — اس سر کا بنے تکیہ سرِ حور کی گردن
اس در کا جو سجدہ اسے منظور نہ ہوتا — ملتی نہ فرشتوں کو کبھی نور کی گردن
اے مصحفی خامش یہ سخن طول نہ کھنچ جائے — یاں کوتہ ہی بہتر سرِ پرشور کی گردن،

جس آسانی سے انشا کی غزل کے اُلجھاؤ کو اس غزل میں مصحفی نے سلجھایا ہے اور جس نرم دھارسے انشائے غلط اشعار کو مصحفی نے کاٹا ہے وہ نظر انداز کرنے کی چیز نہیں۔ سودا کی ہجو اور مصحفی کے ان اشعار میں بھی اب آپ کو ایک فرق نظر آگیا ہوگا یعنی یہاں بھی مصحفی نے اُسی نرم سلاست اور اسی اعتدال و توازن کا ثبوت دیا ہے جو اس کا حصہ ہے۔ مصحفی کا وہ معذرت نامہ جس کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:۔

قسم بذاتِ خدائے کہ ہے سمیع و بصیر — کہ مجھ سے حضرت شہ میں ہوئی نہیں تقصیر

مجھے کیا سب کو غالب کے اس قطعہ کی یاد دلاتا ہوگا جو یوں شروع ہوتا ہے:۔

منظور ہے گزارش احوال واقعی، — اپنا بیان حسنِ طبیعت نہیں مجھے

لیکن غالب کی شوخ طبیعت کی جی کھول کر داد دیتے ہوئے بھی میں یہی سمجھتا ہوں کہ اپنی معصومیت کے یقین دلانیکا نرم و شیریں لب و لہجہ جو مصحفی کے معذرت نامہ کا ہے وہ غالب کے قطعہ کا نہیں ہے۔ آئیے مصحفی کی غزلوں کی بھی سیر کریں

دل لے گئے آنکھوں میں بہ تدبیر لگا کر — آئے تھے جو کل سرمۂ تسخیر لگا کر
شاید ہوئی نہیں مری حالت روا ہنوز — سوئے فلک دراز ہیں دستِ دعا ہنوز

دیکھا تھا ایک دن کہیں اُس گل کو باغ میں
آوارۂ چمن ہے نسیم و صبا ہنوز

ہاتھوں سے اسکے رنگ حنا اُڑ گیا وَلے
تڑپے ہیں خوں میں کشتۂ رنگ حنا ہنوز

فندق ان اُنگلیوں پہ نہیں ہے تو کیا ہوا
رنگینیاں وہی ہیں اشارات میں ہنوز

پہنا جو میں نے جامۂ دیوانگی تو عشق
بولا کہ یہ بدن پہ ترے سج گیا لباس

از بسکہ چشم تر نے بہاریں نکالیاں
مژگاں ہے اشک سرخ سے پھولوں کی ڈالیاں

کل کر رہا تھا غیر سے نظروں میں گفتگو
پر دیکھتے ہی کچھ مرے نظریں چرالیاں

اے مصحفی تو ان سے محبت نہ کیجیو
ظالم غضب کی ہوتی ہیں یہ دلی والیاں

مصحفی کیونکہ نہ بھڑکوں میں کہ تحریکِ نسیم
آتش دل پہ مرے کرتی ہے کارِ دامن

مصحفی کے تئیں دیکھیں ہیں جو وہ کشتہ تڑا
پاس جاتے نہیں شرما کے چلے آتے ہیں

نے اُس کے خواہاں ہیں نے پیار کے بھوکے ہیں
ہم لوگ ہیں بازاری دیدار کے بھوکے ہیں

آستیں اُس نے جو کہنی تک چڑھائی وقت صبح
آرہی سارے بدن کی بے حجابی ہاتھ میں

جی میں آتا ہے کہ بوسہ کفِ پا کا لے لوں
رنگ ہونٹوں پہ ترے تازہ حنا کا لے لوں

سرمہ دینے میں اُس کی آنکھوں میں
کیا کہوں آبداریاں کیا تھیں

زلفیں تری زاہد سے اُلجھتی ہیں تو آنکھیں
کہتی ہیں کہ اس مرد مسلماں کو نہ چھیڑو

کیا نظر پڑ گئی وہ چشم خمار آلودہ
شفق صبح تو ہے زور بہار آلودہ

میری نظر مجھی کو لگے دور چشم بد
اس دم تو بن رہے ہو پری پھر کے دیکھ لو

اُٹھنے سے ترے شور قیامت بھی گیا بیٹھ
اے فتنۂ برخاستہ از بہر خدا بیٹھ

پروا نہ رکھا اس روئے دل افروز کے آگے
یوں چاہے ہے تو سب اپنا بدن مجھسے چھپا بیٹھ

کیا ہم نہیں پہچانتے یہ ساختہ صورت
غصہ سے تنک اک اور بھی تو منھ کو بنا بیٹھ

انداز کے صدقے ہیں نہ ہم ناز کے صدقے
گر ہیں بھی تو اس گرمی آواز کے صدقے

مت دیکھ تو اوروں کی طرف میری طرف دیکھ
کافر ہیں تری چشم فسوں ساز کے صدقے

جس وقت کہ کوٹھے پہ وہ ماہ تمام آوے
کیا دور ہے گر اسکو سورج کا سلام آوے

پاؤں کو لگا مہندی دل خون کیا میرا
کیا جانئے کیا آفت تا وقت خرام آوے

اک شاخ گل پہ صبح مری جا پڑی تھی آنکھ
قامت کو کھینچ مجھ کو قیامت دکھا گئی

افغاں کہ سرسری سی کسی کی نگاہ لطف
بیٹھے بٹھائے اک ہمیں تہمت لگا گئی

جنھیں تیری ٹھوکر کا دل میں تھا کھٹکا
لحد میں بھی آرام سے وے نہ سوئے

اُڑائے ہیں لختِ جگر آہ نے جب
ہوا میں بھی گلزار پیدا ہوا ہے

میں ساعدِ نازک کے ترے صدقے ہوں تجھسے
کیونکر قفسِ مرغ گرفتار اُٹھا ہے

اے مصحفی دل جس نے اُٹھایا ہے جہاں سے
اُٹھتے ہوئے وہ یاں سے سبکسار اُٹھا ہے

کون آیا ہے نہانے لطف بدن نے کس کے
لہروں سے سارا دریا آغوش کر دیا ہے

نوبت سخن کی ہم تک جب آئی ہے۔ ادب نے
خاموش کہہ کے سب کو خاموش کر دیا ہے

مجلس میں مصحفی کے آیا ہے جو بدعولے
میں اک قدح میں اس کو مدہوش کر دیا ہے

منظور اگر تمھیں بھی تماشائے خلق ہے
وابستہ اک نظر کی تمنائے خلق ہے

کس طرح کوئی چین سے بیٹھے کہ رات دن
دورِ سپہر درپے ایذائے خلق ہے

میرا گناہ کیا ہے جو مجھ بے گناہ پر
عالم سمٹ کے آیا ہے دعوائے خلق ہے

شاید کہ آج مصحفی مارا گیا کہیں
اس کی گلی میں کہتے ہیں غوغائے خلق ہے

معنی طلب کی صورتِ خالق پہ ہے نظر
صورت پرست محو تماشائے خلق ہے

انداز و ناز میں تجھے اُستاد کر گئے
اہلِ زمانہ ہم پہ یہ بیداد کر گئے

کرتے نہیں جو یاد تو بیداد کیجئے
یعنی کسی طرح تو ہمیں یاد کیجئے

ترے چہرے کے ہنگام تماشا دل دھڑکتا ہے
نگاہیں سخت ہیں بیباک اور رخسار نازک ہے

نزاکت عاشق و معشوق کی یکساں نہیں ہوتی
مری گفتار نازک ہے تری رفتار نازک ہے

ہم اُٹھ کر خواب سے تیری گلی کا قصد کرتے ہیں
گدا کو صبحدم جوں بارگاہ شاہ یاد آوے

برقِ رخسارِ یار پھر چمکی،
اس چمن کی بہار پھر چمکی،

میرے گریہ سے آب و تاب آیا
صورتِ روزگار پھر چمکی،

دیکھو پاؤں رکھدیا کس نے
آج کیوں نوکِ خار پھر چمکی،

اُس کی رفتار کا مذکور جب آجاتا ہے
جی کی ہوتی ہے یہ حالت کہ رندھا جاتا ہو

کون اس باغ میں اے بادِ صبا جاتا ہے
رنگ رُخسار سے پھولوں کے اُڑا جاتا ہے

دل کے دھڑکوں کا یہ عالم ہو کہ بے منتِ دست
پرزے ہو ہو کے گریبان اُڑا جاتا ہے

کیا ستم ہے کہ تو غرفے میں پھرے بال کھلے
اور نظارہ ترا دیدہ روزن مارے

دشمن و دوست کو اُلفت نے تری ایک کیا
ہاتھ پر ہاتھ نہ کیوں شیخ و برہمن مارے

اے خوشا حال انھوں کا جو ترے کوچے میں   خاک پنڈے سے ملے بیٹھے ہیں آسن مارے
مصحفی کام مرا ضبط سے اب درگزرا   کب تلک غم میں کسی کے کوئی تن من مارے
میں وہ نہیں ہوں کہ اس بت سے دل مرا پھر جائے   پھروں اگر میں اس سے تو مجھ سے مرا خدا پھر جائے
بکھیر دے جو وہ زلفوں کو اپنے مکھڑے پر   تو ابر شرم کے آئی ہوئی گھٹا پھر جائے
تو در کو شوق سے رکھ بند پر نہ اتنا بھی   کہ آوے جو کوئی وہ ہو کے بدگماں پھر جائے
اسی سبب تو پریشاں رہا میں دنیا میں   کہ سالہا تری زلفوں کی ابتری دیکھی

حسرت موہانی کے اس مصرع کا سلسلہ کہاں پہونچتا ہے؟

وہ ابتری جو تری زلف پر شکن میں رہے

جس دم وہ میری خاک کو ٹھوکر لگا چلے   پھر کے کہی کہ وہاں سے نہ دامن اٹھا چلے
بلبل کے مشت پر بھی اڑا دو تو سیر ہے   غنچوں کو چٹکیوں میں تو آخر اڑا چلے
لیلیٰ بھی سیر باغ کو ہوتی نہیں سوار   ناقہ کے آگے آگے نہ جب تک صبا چلے
نالے تو ہم نے وادیِ غربت میں سر کئے   پر خفتگان خاک کو ناحق جگا چلے
میں دوڑ کے لگ جاؤں ہوں ظالم کے گلے سے   جب تک کہ نزاکت سے وہ تلوار سنبھالے
کھولدیتا ہے تو جب جائے چمن میں زلفیں   پا بزنجیر نسیم سحری نکلے ہے
مصحفی کس کے کھلے بال تو دیکھ آیا ہے   کہ تری وضع سے شوریدہ سری نکلے ہے
زلف رخسار پہ کھولی تھی سرِ شام اُسنے   کہ سیاہی شبِ ہجراں کی تھی آغاز ہوئی
جو ہے سو تمہارا ہی طرفدار ہے صاحب   ہندو ہیں ہمارے نہ مسلمان ہمارے

میں اتنے اشعار نقل کرکے اس مضمون کو اس قدر طول نہ دیتا لیکن مصحفی کا کلام چونکہ عام طور پر دستیاب نہیں ہوتا اس لئے اسے ضروری سمجھا گیا۔ بہرحال آپ یہ مضمون یہاں تک (روا روی میں نہیں بلکہ اطمینان سے) دیکھکر میری اس بات کی صداقت کا احساس غالباً کر چکے ہوں گے کہ اگرچہ میر کا سوز و ساز ایک نرم اور معتدل شکل میں مصحفی کے یہاں موجود ہے اور یہ نرمی و اعتدال ایک نفوی صفت (Negative quality) نہیں ہے بلکہ ایک اثباتی صفت (Positive quality) ہے پھر بھی دلی میں مصحفی تنہا وہ شخص تھا جسکی طبیعت کو سودا کے رنگ طبیعت سے خاص مناسبت تھی۔ وہ شگفتگی و رنگینی وہ البیلاپن اور رسیلاپن وہ سج دھج وہ نشاط و سرمستی جو سودا کی خصوصیتیں تھیں یہی صفات بیک وقت کچھ نرم ہو کر نکھر کر اور پھیل کر مصحفی کی رچی ہوئی اور سنواری ہوئی شاعری میں جلوہ گر ہیں۔ اگر ہم اس مرکزی و مستقل خصوصیت (Central & Constant quality

کو بیان کرنا چاہیں جو میرؔ و سوداؔ کے مختلف اندازوں کو اُڑاتے ہوئے بھی مصحفیؔ کے وجدان و کلام میں جاری و ساری ہے تو اس کو ہم ایک رچا ہوا اعتدال (Cultured moderation) کہہ سکتے ہیں۔ اگر میرؔ کے یہاں آفتاب نصف النہار کی پگھلا دینے والی گرمی ہے تو سوداؔ کے یہاں اس کی عالمگیر روشنی ہے۔ لیکن آفتاب ڈھل جانے پر سہ پہر کو گرمی اور روشنی میں جو اعتدال پیدا ہو جاتا ہے اور اس گرمی اور روشنی کے ایک نئے امتزاج سے جو معتدل کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ مصحفیؔ کے کلام کی خصوصیت ہے۔ مجھے اسوقت دو شاعروں کے نام یاد آگئے ایک حالیؔ جو میرؔ کے رنگ میں اُسی اعتدال کا ثبوت دیتے ہیں جو مصحفیؔ کی مرکزی اور مستقل خصوصیت ہے اور حالیؔ کے بعد حسرتؔ موہانی جو مصحفیؔ کی رنگینی کی تقلید کرتے ہوئے مصحفیؔ کے اعتدال کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

گھر ہے وحشت خیز اور بستی اُجاڑ — ہوگئی اک اک گھڑی تجھ بن پہاڑ

بیقراری تھی سب امید ملاقات کے ساتھ — اب وہ اگلی سی درازی شب ہجراں میں نہیں

اب بھاگتے ہیں سایۂ عشق بتاں سے ہم — کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

کر دیا خوگر جفا تو نے — خوب ڈالی تھی ابتدا تو نے — حالیؔ

رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرحداری کا — طرفہ عالم ہے ترے حُسن کی بیداری کا

دل کو خیال یار نے مخمور کر دیا — ساغر کو رنگ بادہ نے پُر نور کر دیا

برق کو ابر کے دامن میں چھپا دیکھا ہے — ہم نے اس شوخ کو مجبور حیا دیکھا ہے

آنکھوں کے تبسم نے سب کھول دیا پردہ — ہم پر نہ چلا جادو اے جبین جبیں تیرا — حسرتؔ موہانی

جہاں تک خیال و بیان میں اعتدال و میانہ روی کا تعلق ہے نہ حالیؔ کے یہ اشعار میرؔ کی تقلید ہیں نہ حسرتؔ کے اشعار سوداؔ کی تقلید۔ دونوں کے یہاں مصحفیؔ کا رنگ آگیا ہے۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ شعر میں جب داخلیت اور خارجیت کا امتزاج ہوتا ہے تو زبان و بیان کی طرف بھی شاعر کی توجہ خاص طور پر ہونے لگتی ہے اور یہی وہ خصوصیت تھی جس نے سوداؔ کو قادر الکلام بنایا۔ زباندانی میں میرؔ، سوداؔ سے کم نہ تھے لیکن چونکہ سوداؔ کی طبیعت میں شگفتگی زیادہ تھی اس لئے اس کی زبان بہت نکھر گئی تھی کیونکہ مصحفیؔ کی طبیعت میں ہر چند وہ تلاطم، وہ طوفان وہ جوش و خروش نہیں ہے جو سوداؔ کی طبیعت میں تھا، پھر بھی اس رنگینی و خارجیت نے جو مصحفیؔ کے وجدان میں تھی اُس کی زبان میں ایک خاص نکھار پیدا کر دیا ہے اور اس کو اتنا ہموار و سبک، بنا دیا ہے کہ مشکل زمینوں کو شگفتہ کر دکھانے میں وہ سوداؔ سے بہت آگے نکل گیا ہے۔ اُردو کا شاعر یا میری ہوتا ہے یا سودائی۔ سودائی ہونے کی پھبتی ذوقؔ پر تو غالبؔ نے کامیابی سے کس دی لیکن مصحفیؔ پر نہیں پھبتی۔

خود مصحفیؔ کا بیان سنئے:-

سودا کا سرد ہو چکا ہے بازار
اب بزم سخن ہے میرے دم سے گلزار
ہے شان تری جلوہ گری میں ہر وقت
سچ ہے کہ تجلی کو نہیں ہے تکرار

چوتھے مصرع میں اپنی انفرادیت کا نکتہ مصحفی نے صاف صاف بیان کر دیا ہے - ایک اور رباعی ملاحظہ ہو:-

اس کلبۂ احتیاں کو وطن تونے کیا
اس تودۂ خاک کو چمن تونے کیا
القصہ کہ مصحفی کو اپنے یارب
دستاں زن گلزار سخن تونے کیا

جب اُجڑی دلی چھوڑ کر مصحفی لکھنؤ پہونچے تو یہاں جرأت و انشا کا طوطی بول رہا تھا - جرأت کی معاملہ بندی بہ حیثیت مجموعی، اردو غزل میں ایک نئی چیز تھی - آنے کو تو دلی سے یہاں میر - سوز اور سودا بھی آچکے تھے لیکن ان تینوں میں سے کسی پر جرأت کی پرچھائیں بھی نہیں پڑی اور خاص لکھنؤ کا بھی کوئی شاعر بڑا یا چھوٹا جرأت کا انداز نہ اُڑا سکا لیکن مصحفی نے جرأت کے رنگ کو اختیار کیا اور ایسے حسن کے ساتھ کہ وہ مخصوص انھیں کی چیز نظر آنے لگا جرأت کا مخصوص رنگ اس کے ان اشعار میں جھلک رہا ہے:-

دیکھا تو یوں وہ کہہ کے لگے منھ کو ڈھانپنے
کمبخت پھر لگا مجھے نظروں میں بھانپنے
جب یہ سنتے ہیں وہ ہمسایہ میں ہیں آئے ہوئے
کیا در و بام پہ ہم پھرتے ہیں گھبرائے ہوئے
اس ڈھب سے کیا کیجے ملاقات کہیں اور
دن کو تو ملو ہم سے - رہو رات کہیں اور
اک واقف کار اپنے سے کہتا تھا وہ یہ بات
جرأت کے جو گھر رات کو مہمان گئے ہم
کیا جانئے کمبخت نے کیا ہم پہ کیا سحر
جو بات نہ تھی ماننے کی مان گئے ہم

ان حدود سے بڑھ جاتا ہے تو جرأت یہاں تک بھی کہہ جاتا ہے کہ:-

بال ہیں بکھرے بند ہیں ٹوٹے، کان میں ٹیڑھا بالا
جرأت ہم پہچان گئے کچھ دال میں کالا کالا

آخری شعر جرأت کے رنگ کی بہترین مثال نہیں کہی جا سکتی - اس شعر میں انھیں انشا اور رنگین کی ہوا لگ گئی ہے

جرأت کے عاشقانہ اشعار میں ہر جگہ معاملہ بندی نہیں ہوتی - لیکن واقعیت اور اصلیت ہمیشہ ہوتی ہے - معاملہ بندی کے اشعار میں معشوق کی کردار نگاری خاص چیز ہوتی ہے لیکن عاشق کی تصویریں کھینچنے میں بھی جرأت نے اسی محاکاتی انداز کا ثبوت دیا ہے جس کا ثبوت اس نے معاملہ بندی میں دیا ہے -

وہ گیا اُٹھ کر جدھر کو میں اُدھر حیران سا
اس کے جانے پر بھی کتنی دیر تک دیکھا کیا
جب تلک کرتے رہے مذکور اسکا مجھ سے لوگ
جی میں کچھ سوچا کیا میں اور دل دھڑکا کیا

یہی وہ واقعیت اور اصلیت ہے جو آپ مصحفی کے قریب قریب ان سب اشعار میں پائیں گے جنھیں میں نے نقل کیا ہے - اب جرأت کے انداز میں مصحفی کے اشعار سنئے:-

میں اس انداز کے صدقے کہ جو کی مجھ پہ نظر
دیکھتے ہی مجھے اُن نے نظر انداز کیا

تمھارے وعدوں پہ ہم کو تو اب نہیں ٹھہراؤ
مگر نیا کوئی امیدوار ٹھہیرے گا

آساں نہیں ہے تنہا در اس کا باز کرنا
لازم ہے پاسباں سے اب ہمکو ساز کرنا

سویا تھا لپٹ کر میں اس ساتھ ولے اسنے
پہلو سے مرے پہلو تا صبح جدا رکھا

کسی کو گرمی تقریر سے اپنے لگا رکھا
کسی کو منھ چھپا کر نرمی آواز سے مارا

دل سے خبر نہیں ہے مجھے اسکے مصحفی
آنکھوں میں تو اشارہ کئی بار ہو گیا

عشق سے میرے جو گھبرایا تو پھر ناچار ہو،
آ کے گھر میرے وہ مجھ کو آپ سمجھانے لگا

پاس میرے وہ ترا پیار سے آنا نہ رہا
وہ محبت نہ رہی اور وہ زمانا نہ رہا

ہوش کا اس کے میں کشتہ ہوں کہ وہ مایۂ ناز
شب رہا گھر مرے اور غیر نے جانا نہ رہا

کب شب وصل وہ آیا کہ مرے اور اسکے
درمیاں میں شب ہجراں کا فسانا نہ رہا

ہو کے ناچار کہا میں نہیں جاتا۔ اُس کو
پاس سے میرے جب اُٹھنے کا بہانا نہ رہا

انگڑائی لے کر اپنا مجھ پر خمار ڈالا
کافر کی اس ادا نے بس مجھ کو مار ڈالا

تیرے کوچے کی طرف سینے سے اُٹھ دوڑے ہے دل
اس کو یاد آوے ہے جب آنکھ لڑانا تیرا

ہو گیا کیا یہ بگاڑ آہ کہ مطلق نہ رہا
روٹھنا تجھ سے مرا اور منانا تیرا

اب میں اس دن کو بھی روتا ہوں کہ بے لطف نہ تھا
ہاتھ گہ گہ کے وہ در پر سے اُٹھانا تیرا

ساتھ سونا اس کا یاد آیا جو مجھ کو مصحفی
رات میں بستر پہ کیسا تلملا کر رہ گیا

"رہ گیا" اور "رہ گئے" کی ردیفوں کو مصحفی کے مزاج سے خاص مناسبت ہے۔ اس نے متعدد غزلوں میں ان ردیفوں کو لیا ہے۔ ہوتے ہوتے کسی بات کا "نہ ہونا" اس کا ہوتے ہوتے "رہ جانا" یہی وہ (Tantalizing) باتیں اور موقعے ہیں جن کی مصوری اور ترجمانی اس وقت تک تنہا مصحفی نے کی اور ان کے سو برس بعد کچھ مولانا حسرت موہانی نے کی، بلکہ مصحفی کے طرز میں بالارادہ غزل لکھتے وقت حسرت نے "شرما کے رہ گئے" اور "قسم کھا کے رہ گئے" والی زمین منتخب کی۔ مصحفی کے اب اور چند شعر سنئے:۔

یہ ہے ترا سر جھکا کے چلنا
پھر شرم سے مسکرا کے چلنا

آنا گھر میں تو کھل کھلانا
اور راہ میں منھ بنا کے چلنا

غیروں سے میاں تیری ملاقات نہیں خوب
کچھ عقل کے نزدیک تو یہ بات نہیں خوب

یوں آنکھیں ملا جس سے کہ چاہے تو و لیکن
آگے مرے ہر اک سے اشارات نہیں خوب

کیا جانئے کیا سمجھے کوئی ملنے کو صاحب اتنی بھی تو بندے پہ عنایات نہیں خوب
کیا خوار پھرا کرتے ہو تم اُس کی گلی میں میاں مصحفی جانے دو یہ اوقات نہیں خوب
واں کیونکہ اشاروں میں کہوں حال دل اپنا جس جا کہ نہ ہو دو سے اک بات کی تقریب
سن سن کے مرے ذکر کو کہتا ہے وہ کافر ہر ایک کرے ہے اسی بد ذات کی تقریب
اے مصحفی سو آنکھیں لگیں دیکھنے اُس سے نکلی جو کبھی حرف و حکایات کی تقریب
ہمسایگی پہ یار کی کیا دل کو خوش کروں مجھ سے تو ہے کھنچا وہ حیا دار بے طرح
سحر ہے رخ پر ترے زلفوں کے بل کھانے کی طرح سیکھے کوئی تجھ سے پیارے دل کے لیجانے کی طرح
کل جو وہ رستہ میں ناگہ مل گیا تھی دیدنی میرے رہ جانے کی وضع اور اسکے رکجانے کی طرح
شب ہم سے وہ روٹھے تو ہمیں چھوڑ کے باہر جا گھر میں الگ سو رہے زنجیر لگا کر
دیکھا تھا بات کرتے اسے ساتھ غیر کے سو اپنا جی کھپے ہے اسی بات میں ہنوز
ہوئے نہ وصل کی دولت سے ہم کبھی محظوظ جو رفتہ رفتہ ہوا بھی تو مدعی محظوظ،
کام کر جاتی ہیں تری آنکھیں چپکے چپکے ہزار آنکھوں میں
تمہاری اور مری کج ادائیاں ہی رہیں رہے جو پاس تو باہم لڑائیاں ہی رہیں
جمنا میں کل نہا کر جب اسنے بال باندھے ہم نے بھی اپنے دل میں کیا کیا خیال باندھے
ہنستے ہو تو اچھی ہی طرح مجھ کو ہنسو نہ یوں منھ میں میاں کا ہے کو رومال دیا ہے
تو در کو شوق سے رکھ بند پر نہ اتنا بھی کہ آوے جو کوئی وہ ہو کے بد گماں پھر جائے
اُلجھا ہے تو کس سے کہ ترے جامہ کے پیارے نے چین ٹھکانے ہے نہ دامان ٹھکانے
ایسا نہ ہو پھر، ہم بھی کریں اور سے یاری اس حسن پہ کچھ آپ ہیں مغرور بہت سے
کہتا تھا وہ شب ڈال کے باہوں کو گلے میں گردن پہ ترے ہیں کئی احسان ہمارے

آپ نے دیکھا کہ جرأت کے رنگ کو اگر کسی نے نباہا تو وہ مصحفی ہے لیکن "چوما چاٹی" اور "دھول دھپا" سے مصحفی صاف بچ گیا ہے۔ معاملہ بندی اور محاکاتی انداز میں وہ جرأت سے کچھ کم ضرور ہے لیکن مصحفی کے اعتدال اور ایک لطیف حسرتناک لہجہ نے عجیب لطف پیدا کر دیا ہے۔

مصحفی کو شاعری میں اگر واقعی مصیبت پیش آئی تو اس بد مذاقی میں شریک ہونے کے وقت آئی جس نے انشا کو اور جس کو انشا نے اُچھال رکھا تھا۔ کاش انشا نے اپنے خاص رنگ کو سلیقے اور قرینے سے نباہا ہوتا اور نئی راہ نکال کے اتنا نہ بہکتے تو آج وہ زبردست صاحب طرز ہوتے کیونکہ انشا کے مخصوص رنگ میں اگر اسے مستقل

طور پر سلیقے سے برتا جائے تو ایک نئی قسم کی غزل گوئی کا امکان ہے، چنانچہ اسی سے عام خیال ہے کہ اگر انشا کو اہل دہلی یا سنجیدہ لوگوں کی صحبت نصیب ہوئی ہوتی تو وہ بڑا زبردست شاعر ہوتا۔ میں کہتا ہوں کہ انشا کو خود اپنی صحبت اگر نصیب ہوئی ہوتی تو وہ غضب کا شاعر ہوتا۔ افسوس کہ خود اپنی صحبت انشا کو اس وقت نصیب ہوئی جب وہ ختم ہو چکے تھے۔ انشا کا فطری میلان اہل دلی یا سنجیدہ لوگوں کے مزاج سے میل نہیں کھاتا تھا۔ وہ میر، سودا اور مصحفی کے زمرے میں شریک ہونے کے لئے نہیں بنا تھا۔ البتہ قصیدوں اور ہجوؤں کا سودا ضرور انشا سے ہم آہنگ ہے لیکن سودا کی ہجوؤں کو غزل کے سانچے میں ڈھالنے کی جو حیرت انگیز صلاحیت انشا میں تھی وہ نہایت عجیب و غریب تھی جرأت اور انشا مسلسل غزلوں کے لئے بھی خاص طور پر مناسب طبیعتیں لے کر آئے تھے۔ انشا کے چند وہ شعر سنئے جن کی زمینوں میں مصحفی کو بھی طبع آزمائی کرنی پڑی:۔

سج گرم جبیں گرم نگہ گرم ادا گرم
وہ سر سے ہے تا ناخنِ پا نامِ خدا گرم

پرتو سے چاندنی کے ہے صحنِ باغ ٹھنڈا
پھولوں کی سیج پر آ کر دے چراغ ٹھنڈا

لے کے میں اوڑھوں بچھاؤں یا لپیٹوں۔ کیا کروں
روکھی پھیکی سوکھی ساکھی مہربانی آپ کی

جھڑکی سہی ادا سہی چینِ جبیں سہی
یہ سب سہی پر ایک نہیں کی نہیں سہی

گر نازنیں کہے کا بُرا مانتے ہیں آپ
میری طرف تو دیکھئے میں نازنیں سہی

منظور دوستی جو تمہیں ہے ہر ایک سے
اچھا تو کیا مضایقہ انشا سے کیں سہی

یا انشا کی "آفتاب اُلٹا"، "نقاب اُلٹا" والی غزل۔ یہ رنگ انشا سے پہلے اُردو غزل میں تھا ہی نہیں اور غزل کے سوز و ساز وغیرہ کے متعلق ہمارے جو کچھ بھی اُصول ہوں اور یہ اُصول انشا کے اس انداز سے چاہے کتنے ہی مجروح ہوتے ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسے اشعار سن کر ایک بار زاہد خشک کے منہ سے بھی واہ نکل ہی جائے گی۔ کاشکے اس رنگ میں انشا ہم کو زیادہ نہیں صرف سو شعر دے جاتا۔

انشا نے اس شوخ رنگ کو بگاڑا کیونکر۔ بات یہ ہے کہ میر کا رنگ ہو یا کسی اور شاعر کا۔ جب وہ جزئیات کا شکار ہو جائے گا تو ضرور بگڑ جائے گا۔ انشا نے اپنے ساتھ اور اپنے رنگ کے ساتھ بے اعتدالی یہ برتی کہ خارجی چیزوں کو مثلاً "چولی" "دوپٹا" "ازاربند" "چوڑیوں" اور "جوتیوں" کو لے لیا اور اپنے طربیہ وجدان (Comic Spirit) کو نقالی (Farce) بنا دیا۔

بعض زمینوں میں انشا اور مصحفی دونوں کی غزلیں ہیں۔ مگر انشا کی شوخی اور گرماگرمی اتنی بے پناہ چیز ہے کہ مصحفی دب جاتا ہے۔ لیکن یہ رنگ مصحفی کے شایانِ شان بھی نہ تھا اور اس لئے وہ انشا کی طرح کھل کھیلنے سے معذور تھا۔ غالب اور انیس معمولی لوگ نہیں تھے لیکن انیس غالب کے انداز میں ایک غزل بھی نہیں کہہ سکتے تھے

اور نہ غالب انیس کے انداز میں مرثیہ کہہ سکتے تھے۔ ان میں سے کوئی اگر دوسرے کا رنگ اُڑانا چاہتا تو منھ کی کھاتا غزل ہی کو لے لیجئے غالب ظرافت شوخی اور طنز کا بادشاہ ہے لیکن داغ کے چنچل رنگ میں غالب سے بھی غزل نہ ہوتی اور داغ سے غالب کی شوخی نہ نبھتی۔ اس لئے اگر مصحفی وہ شوخی و طراری نہ دکھا سکے جو انشا کے لئے مخصوص تھی تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ مصحفی اُستاد تو تھے مگر انشا سے کم تھے یہ بات یاد رہے کہ بڑے سے بڑا شاعر صرف اس لئے بڑا نہیں ہے کہ وہ اپنے رنگ میں لاثانی ہے یا نہایت کامیاب ہے۔ بلکہ اس لئے بھی بڑا ہے کہ دوسرے کے رنگ میں کہنے سے وہ معذور ہے۔ حقیقی شاعری میں کچھ معذوریاں بھی شامل ہوتی ہیں۔ شاعر بہروپیا نہیں ہوتا۔ مصحفی اور انشا کی جو ہم طرح غزلیں ملتی ہیں اور جن میں انشا اور مصحفی نے اپنے اپنے رنگ کو کامیابی سے نباہا ہے انھیں دیکھکر یہ کہنا پڑتا ہے کہ انشا کی غزلیں اپنی جگہ ہیں، اور مصحفی کی غزلیں اپنی جگہ۔ ہر چند مصحفی کے کلام میں ترنم، سلاست اور رنگینی سب کچھ ہے اور زبان و بیان کے معاملہ میں بھی اس کو انشا پر تفوق حاصل ہے اور معنویت میں تو وہ انشا سے کوسوں آگے ہے۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ سطحی بلکہ بازاری جذبات بھی زور بیان اور جوش بیان سے نکھر آتے ہیں اور یہی ایک آنچ کی کسر مصحفی کے معانی و بیان کو پوری طور پر نکھرنے نہیں دیتی۔ یوں تو ادب اور شعر کا نسبتی اور متقابلانہ (Comparative) مطالعہ پُرلطف اور کار آمد بلکہ ضروری چیز ہے لیکن ایسے مطالعے میں گمراہ ہو جانے کا احتمال رہتا ہے اور خاصکر دو مختلف المزاق شاعروں کا مطالعہ۔ بات یہ ہے کہ مصحفی اور انشا کی ان غزلوں کا ساتھ ساتھ فیصلہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے قدرتی پھولوں اور آتش بازی کے پھولوں کا مقابلہ کرنا انشا کی شاعری ہمارے وجدان کی ظاہری سطح کو لے اُڑتی ہے اور ہم میں متکیف یا متاثر ہونے کی صلاحیت ہی نہیں رہ جاتی۔ لیکن اس اثر سے بچ کر اگر ہم اپنے دل کی دھڑکنوں کو انشا اور مصحفی کی ہم طرح غزلوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کریں تو انشا ساز بے آہنگ ہو کر رہ جائے گا اور مصحفی ساز با آہنگ ثابت ہوگا۔ انشا ہمارے تخئیلی سماعت (Imaginative ear) کو مجروح کرتا ہے اور مصحفی ہماری سامع نوازی کرتا ہے۔ بہر حال اس سلسلہ میں جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ مصحفی اور انشا کی ہم طرح غزلوں پر بحیثیت مجموعی اظہار رائے کیا ہے ورنہ متفرق اشعار اور خاص قافیوں میں کبھی مصحفی زیادہ کامیاب ہیں کبھی انشا اور کبھی دونوں برابر رہتے ہیں مثلاً مصحفی کا مطلع ہے:۔

جو پھر اکے اُس نے منھ کو بقصد نقاب اُلٹا ادھر آسمان اُلٹا اُدھر آفتاب اُلٹا

اور انشا کا مطلع ہے:۔

مجھے کیوں نہ آوے ساقی نظر آفتاب اُلٹا کہ پڑا ہے آج خم میں قدحِ شراب اُلٹا

لیکن جواب کا قافیہ اگرچہ مصحفی نے دو اسلوب سے باندھا ہے:۔

بسوالِ بوسہ اُس نے مجھے رک کے دی جو گالی — میں ادب کے مارے اُس کو نہ دیا جواب اُلٹا
میں لکھا ہی خط تو قاصد پہ یہ ہوگا مجھ پہ احساں — انھیں پاؤں پھر کے آ تو جو ملے جواب اُلٹا

پھر بھی انشا نے بہت برجستہ کہا ہے :-

عجب اُلٹے ملک کے ہیں اجی آپ بھی کہ تم سے — کبھی بات کی جو سیدھی تو ملا جواب اُلٹا

مصحفی کا شعر ہے :-

کسی مست کی لگی ہو مگر اُس کے سر کو ٹھوکر — جو پڑا ہے میکدہ میں یہ خمِ شراب اُلٹا

لیکن اس قافیہ کو انشا نے نہایت مستانہ انداز سے باندھا ہے :-

ابھی جھڑ لگا دے بارش کوئی مست بھر کے نعرہ — جو زمیں پہ پھینک مارے قدحِ شراب اُلٹا

ایک دوسری غزل میں دونوں کے اشعار یہ ہیں :-

انشا

پرتو سے چاندنی کے ہے صحنِ باغ ٹھنڈا
پھولوں کی سیج پر آ کر دے چراغ ٹھنڈا
مے کی صراحی ایسی لا برف میں لگا کر
جسکے دھوئیں سے ہووے ساقی دماغ ٹھنڈا
ہیں ایک شخص لاتے خس کی شراب انشا
دھو دھا گلاب سے تو کر رکھ ایاغ ٹھنڈا

مصحفی

پیری سے ہو گیا یوں اس دل کا داغ ٹھنڈا
جس طرح صبح ہوتے کر دیں چراغ ٹھنڈا
سرگرم سیرِ گلشن کیا خاک ہوں کہ اپنا
نزلہ سے ہو رہا ہے آپی دماغ ٹھنڈا
گرمی کی رت ہے ساقی اور اشک بلبلوں نے
چھڑکاؤ سے کیا ہے سب صحنِ باغ ٹھنڈا
ایسے میں اک صراحی شورے لگی منگا کر
لبریز کر کے بھر دے مجھ کو ایاغ ٹھنڈا

مصحفی کا یہ رنگ لکھنؤ کی خارجیت کا فیضان ہے جو سودا کی خارجیت سے بالکل علحدہ چیز ہے۔ ہم کو مصحفی کے یہاں اس طرح کے اشعار بھی ملتے ہیں جو انشا کے کچھ کم بگڑے ہوئے اور کبھی بہت زیادہ بگڑے ہوئے رنگ میں ہیں مثلاً :-

یہ طرفہ اختلاط نکالا ہے تم نے واہ — آتے ہی پاس چٹ سے وہیں مار بیٹھنا
رات پردے سے ذرا منھ جو کسو کا نکلا — شعلہ سمجھا تھا اُسے میں وہ بھبھوکا نکلا
پانی بھرے ہے یار دیاں قرمزی دوشالہ — لنگی کی سج دکھا کر سقنی نے مار ڈالا
گیند بازی سے اذیت نہ کہیں پہونچے تجھیں — کہ پلٹتی ہے بری طرح سے سرکار کی گیند
میری طرح سے یار نے میلا کیا لباس — پر کیا کہوں پھبا اُسے کیا مانگیا لباس

ہمتو کبھی کہیں نہ کہ کپڑے اُتار دیئے پہنا کریں گر آپ اسی وضع کا لباس

اب لگے ہاتھوں اس رنگ میں انشاؔ کے بھی کچھ اشعار سُن لیجئے :۔

جوگی جی صاحب آپ کی بھی واہ دھرم مورت عجب کڈھنگی ہے
چشم بد دور شیخ جی صاحب کیا انداز آپ کی اُٹھنگی ہے
لیا گر عقل نے تنہ میں دلِ بیتاب کا گٹکا تو جوگی جی دھرا رہ جائیگا سیماب کا گٹکا
ہیں زورِ حسن سے وہ نہایت گھمنڈ پر نام خدا نگاہ پڑے کیوں نہ ڈنڈ پر

دونوں کا فرق ظاہر ہے اور یقیناً اس رنگ میں مصحفی انشاؔ کو نہیں پہونچتا۔

اب سوال یہ ہے کہ مصحفی کو ہم دلّی کا شاعر سمجھیں یا لکھنؤ کا۔ خود تو وہ کہتا ہے :۔

اے مصحفی شاعر نہیں پورب میں ہوا میں دلّی میں بھی چوری مرا دیوان گیا تھا

میں تو کہوں گا کہ جس طرح وہ عمر بھر بے وطن تھا اسی طرح اس کی غزلیں بھی دلّی اور لکھنؤ کے دوراہے پر آوازِ بازگشت کی طرح گونج رہی ہیں۔ مصحفی کے اشعار سنئیے :۔

اے مصحفی تو واں سے کیوں روٹھ کر آیا تھا دیوانے تری خاطر کڑھتا ہے وطن سارا
روئے وطن نہ دیکھا تو نے جو مصحفی پھر شاید کہ پھنکتے تو اپنے وطن سے نکلا
ہیں اک فقیر غریب الوطن مسافر نام رہے ہے آٹھ پہر جس کو قوت کی تدبیر
مرے حواس پریشاں ہیں یہ پریشانی ہو جیسے لشکر شکستہ کی خراب بھیر
جو کچھ ہوا سو ہوا مصحفی بس اب چپ رہ زیادہ کر نہ صداقت کا ماجرا تحریر
خدا کو چھوڑ دے اس بات کو وہ مالک ہے کرے جو چاہے جو چاہا کیا بحکم قدیر

ایک رباعی میں کہتا ہے :۔

یارب شہر اپنا یوں چھڑایا تو نے ویرانے میں مجھ کو لا بٹھایا تو نے
میں اور کہاں یہ لکھنؤ کی خلقت اے وائے یہ کیا کیا خدایا تو نے

رہا مصحفی کا محض مقلد اور انتخابی شاعر ہونا سو یہ محض نیم صداقت ہے اور میں نے ابتک جو کچھ اس باب میں لکھا ہے اس سے مصحفی کی انفرادی حیثیت واضح ہو گئی ہوگی۔ اس کا اپنا بھی ایک رنگِ طبیعت ہے جس کا وہ تنہا مالک ہو اور جو کسی اور شاعر کا نہیں۔ مصحفی کا کلام جتنا پڑھے جانے کا مستحق ہے اور اُسے جس طرح پڑھنا چاہئے اتنا اور اس طرح وہ غالباً نہیں پڑھا جاتا۔ اس مضمون کے لئے جب تک میں نے خود اپنے تاثرات پر غور نہیں کیا مصحفی کی شاعری اور اس کے مزاج کی خصوصیتیں خود مجھ پر نمایاں نہیں ہوئی تھیں۔

آپ مصحفی اور خاندانِ مصحفی کے شعراء سے قطع نظر کر کے تمام مشہور غزل گویوں کا تصور کیجئے۔ میر۔ سودا۔ سوز۔ درد۔ غالب۔ مومن۔ ذوق۔ داغ۔ جرأت۔ انشاء۔ ناسخ وغیرہ وغیرہ۔ اس کے بعد یہ اشعار سنئے:۔

چال ہے مجھ ناتواں کی مرغِ بسمل کی تڑپ	ہر قدم پر خوف ہے یاں رہ گیا واں رہ گیا	آتش
نہ پوچھ حال مرا چوبِ خشکِ صحرا ہوں	لگا کے آگ مجھے قافلہ روانہ ہوا	〃
دہن پر ہیں ان کے گماں کیسے کیسے	سخن آتے ہیں درمیاں کیسے کیسے	〃
نبض بیمار کی اے رشکِ مسیحا دیکھی	آج کیا آپ نے جاتی ہوئی دنیا دیکھی	اسیر
خدا جانے یہ دنیا جلوہ گاہِ ناز ہے کس کی،	ہزاروں اُٹھ گئے رونق وہی باقی ہے محفل کی	〃
خنجر نے ترے دیا نہ پانی،	ترسا ترسا کے مار ڈالا،	امیر
سرد آہیں جب کسی نے کیں وطن یاد آگیا	چار جھونکے جب چلے ٹھنڈے چمن یاد آگیا	〃
جس جگہ دو گز زمیں پائی کھدی سمجھا میں گور	جب نئی دو چادریں دیکھیں کفن یاد آگیا	〃
تن سے باہر آکے دھیان آیا عدم کا روح کو	قید سے چھوٹا مسافر کو وطن یاد آگیا	〃
نزع میں سنگیں دلی کا حال شیریں پر کھلا	موت کی سختی اُٹھائی کوہکن یاد آگیا	〃
گور میں بھی ہم نہ بھولے صحبتِ احباب کو	گوشۂ خلوت میں لطفِ انجمن یاد آگیا	〃
جامۂ صد پارۂ گل جب نظر آیا مجھے	سو جگہ سے چاک اپنا پیرہن یاد آگیا	〃
رہ گیا اپنے گلے میں ڈال کر باہیں غریب	عید کے دن جس کو غربت میں وطن یاد آگیا	〃
جھومتی آج جو متوالی گھٹا آئی ہے	یاد کیا کیا تری مستانہ ادا آئی ہے،	جلیل
پھونکے دیتی ہے مجھے یاد مرے ساقی کی	آگ برساتی دھواں دھار گھٹا آئی ہے	〃
ہم کو کیا بلبل و گل میں ہے کوئی بات اگر	وہ صبا تھی جو زمانے میں اُڑا آئی ہے	〃
باغباں بلبلِ کشتہ کو کفن کیا دیتا	پیرہن گل کا نہ اُترا کبھی میلا ہو کر	صبا
حسن کی جنس خریدار لئے پھرتی ہے	ساتھ بازار کا بازار لئے پھرتی ہے	- اثر عظیم آبادی
دربدر حسرتِ دیدار لئے پھرتی ہے	سر ہر کوچہ و بازار لئے پھرتی ہے	〃
دیکھ اے جانِ جہاں شمس و قمر کو دن رات	آج تک حسرتِ دیدار لئے پھرتی ہے	〃
رات کیا کیا نہ بڑھا دردِ جگر مت پوچھو	کس خرابی سے کٹے چار پہر مت پوچھو	〃
ہمدمو کہہ تو چکے حالِ دلِ خوں گشتہ	اب ہمیں تاب نہیں بارِ دگر مت پوچھو	〃
کچھ خدا جانتا ہے جیسے بسر ہوتی ہے	زندگی ہے کہ مصیبت ہے اثر مت پوچھو	〃

یہ نمونہ ہے اُن شعراء کے کلام کا جو مصحفی کے خاندان سے ہیں اور جن کو بالواسطہ یا بلاواسطہ مصحفی کا فیض پہونچا ہے۔
پروفیسر سید اعجاز حسین نے اپنی مختصر تاریخ ادب اُردو میں اس مسلمہ حقیقت کو دہرایا ہے کہ :-

”مصحفی کے صاحب کمال ہونے کا ثبوت یہی کیا کم ہے کہ جس پایہ کے شاگرد ان کو ملے وہ خود اپنے وقت کے مستند اُستاد تھے مثلاً آتش، خلیق، ضمیر، اسیر“

اور ان کے شاگردوں کے شاگرد جس طرح پھلے پھولے اس طرح کسی اور اُستاد کو نصیب نہ ہوئے۔ اچھا اب مندرجۂ بالا اشعار کو دیکھ کر بتایئے کہ ان اشعار کو نقل کرنے سے قبل میں نے جن صاحبِ طرز اُستادوں کا نام لکھدیا ہے وہ یا ان میں سے کوئی بھی ان اشعار کو دیکھ کر یاد آتا ہے۔ کیا یہ تمام اشعار ناگزیر طور پر ہمیں مصحفی اور تنہا مصحفی کی یاد نہیں دلاتے۔ وہی نرمی، وہی ہمواری، وہی حلاوت، وہی اعتدال و رنگینی، وہی تناسب وہی توازن وہی صوتی اور معنوی اثرات، وہی میٹھا میٹھا درد وہی بندش میں چستی و نرمی کا امتزاج، وہی نرم کشاکش جو کلام مصحفی میں پائی جاتی ہے یہاں بھی موجود ہیں۔ اس سلسلہ میں اسیر لکھنوی شاگرد مصحفی کے بھی دو شعر میں نے دے دئے ہیں۔ ذرا غور کیجئے لکھنؤ اسکول کی غزل گوئی غریب بہت بدنام ہے۔ لیکن ”آج کیا آپ نے جاتی ہوئی دنیا دیکھی“ یہ مصرع کیا سوائے لکھنؤ کے کہیں اور کسی شاعر کے لئے ممکن تھا۔ اکثر کہہ دیا جاتا ہے غالباً غالب ہی نے کہا تھا کہ دلی مضمون کے لئے مشہور ہے اور لکھنؤ زبان کے لئے۔ یہ بات سچ بھی ہے اور غلط بھی۔ کیونکہ دہلی کے شعراء کے یہاں بھی زبان کی بہت سی خوبیاں ملتی ہیں اور روزمرہ اور محاورہ کی چاشنی سے اہلِ دلی کا کلام خالی نہیں ہے لیکن میرے نزدیک دلی اور لکھنؤ کی خاص زبان کی شاعری میں بھی ایک اہم فرق ہے۔ وہ یہ کہ دلی والے زبان میں بھی جو اشعار کہتے ہیں اُن میں معنویت بیان پر حاوی رہتی ہے۔ اس کے برعکس لکھنؤ والے جب زبان میں شعر کہتے ہیں تو قریب قریب تمام تر توجہ زبان اور محاورہ کے حسن کی طرف مبذول ہوجاتی ہے۔ اب اسیر کا دوسرا شعر لیجئے۔ مضمون کے لحاظ سے تو یہ شعر لکھنؤ اسکول کا معلوم ہی نہیں ہوتا اور بادی النظر میں غالب کا انداز اس شعر میں معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ”ہزاروں اُٹھ گئے“ وہ ٹکڑا ہے جو غالب کی زبان نہیں بلکہ لکھنؤ کی زبان ہے اور یہی وہ سجاوٹ ہے یہی وہ رچا ہوا انداز بیان ہے یہی وہ رنگین بول چال ہے جس کی طرف مصحفی اُردو غزل کو لے گیا اور جو لکھنؤ کی خاص چیز ہوگئی۔ یہی چیزیں تو انیس کے مرثیوں میں قیامت ڈھاتی ہیں۔ ”تلوار پہ تلوار چمکتی نظر آئے“ یا ”ہر آنکھ کو پریوں کا اکھاڑا نظر آئے“ ان مصرعوں کا صوتی اثر وہی ہوتا ہے جو طبلہ پر آہستہ آہستہ تھاپ پڑنے کا کہ صوتی اثر کے ساتھ ساتھ جذبات میں بھی تموج پیدا ہوتا جاتا ہے۔ ایک بار میرے دوست مجنوں نے خاندان مصحفی کے کئی شعراء کے اشعار مجھے سنائے، میں متحیر تھا کہ یہ سلاست یہ گھلا ملا ہوا انداز بیان نہ غالب کے یہاں نہ میر کے یہاں، نہ یہ آتش کے دہکتے ہوئے انگارے ہیں نہ امیر کے تکلف کے نمونے، پھر ان اشعار کا سلسلہ کہاں پہونچتا ہے۔ ہم دونوں نے اسوقت تو یہی فیصلہ کیا کہ شاگردان آتش نے زبان کی

صفائی میں بڑا حصہ لیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ لکھنؤ اسکول میں زبان کی وہ خوبی جو تکلف و تصنع یا ضلع جگت اور ایہام سے پاک ہے۔ اس کی داغ بیل مصحفی نے ڈالی تھی اور اسی راہ پر چل کر شاگردان آتش اور خود آتش نے لکھنؤ کی زبان کو پروان چڑھایا۔ ہاں لکھنؤ کی زبان میں جہاں جہاں اوچھاپن ہے اُس کے لئے انشا۔ ناسخ۔ امانت یا جس کا بھی ہم چاہیں شکریہ ادا کریں۔ آتش اور ناسخ کا نام اس سلسلہ میں کئی بار آچکا ہے، لیکن ان دونوں کی شخصیتوں میں وہ زور ہے کہ وہ کسی کے شاگرد ہوتے ہوئے بھی صرف اتباع و تقلید کے ہو رہیں ناممکن تھا، آتش نے صرف مصحفی کے باغ کی آبیاری ہی نہیں کی بلکہ اس نے اپنا آتش کدہ الگ تعمیر کیا۔ ناسخ کو جہاں تک شاگردی کا تعلق ہے مصحفی سے کوئی نسبت تھی یا نہیں یہ امر صیغۂ راز میں ہے اور غالباً ہمیشہ رہیگا۔ صرف مصحفی کے تذکرے سے کچھ پتہ چلتا ہے کہ شاید کبھی کبھی شروع میں ناسخ نے بھی مصحفی سے مشورہ کیا تھا۔ بہر حال شاگردی برطرف لیکن کیا مصحفی کا اثر براہ راست صرف اس کے شاگردوں تک محدود تھا؟ ناسخ کے یہ اشعار لیجئے:۔

سب ہمارے لئے زنجیر لئے پھرتے ہیں — ہم سرِ زلف گرہ گیر لئے پھرتے ہیں
تیری صورت سے کسی کی نہیں صورت ملتی — ہم جہاں میں تری تصویر لئے پھرتے ہیں

یہ اشعار میر کے رنگ میں ہیں یا سودا کے یا غالب کے یا خود ناسخ کے؟ کہا جاتا ہے کہ ایسے اشعار میں ناسخ پر آتش کا اثر پڑا ہے۔ لیکن خود آتش کے یہاں یہ کسی نے نہیں سوچا کہ دو طرح کے اشعار ہیں ایک وہ جن میں آتش کی انفرادی گرماگرمی اور کڑک ہے دوسرے وہ جن میں آتش نے مصحفی ہی کے رنگ کو چمکایا اور جن کے لہجے اور انداز میں مصحفی ہی کا اعتدال اور مصحفی ہی کی نرمی پائی جاتی ہے۔ خاندان ناسخ ہی کے خاندان میں جلال لکھنوی گزرے ہیں۔ ان کی یہ غزل لیجئے:۔

وہ دل نصیب ہوا جس کو داغ بھی نہ ملا — ملا وہ غمکدہ جس میں چراغ بھی نہ ملا
گئی تھی کہ کے میں لاتی ہوں زلف یار کی بو — پھری تو بادِ صبا کا دماغ بھی نہ ملا
اسیر کرکے ہمیں کیوں رہا کیا صیاد — وہ ہم صفیر بھی چھوٹے وہ باغ بھی نہ ملا
بتوں کے عشق میں کیا ہوتی ہم سے یادِ خدا — کہ دل بھی تھا نہ ٹھکانے فراغ بھی نہ ملا
خبر کی یار کو بھیجا تھا گم ہوئے ایسے — حواس رفتہ کا ابتک سراغ بھی نہ ملا
دکھائیں یار کو کیا جسم داغدار کی سیر — نظر فریب ہمیں ایک داغ بھی نہ ملا
بھر آئے محفل ساقی میں کیوں نہ آنکھ اپنی — وہ بے نصیب ہیں خالی ایاغ بھی نہ ملا
چراغ لیکے ارادہ تھا بخت کو ڈھونڈھیں — شب فراق تھی کوئی چراغ بھی نہ ملا
جلال باغ جہاں میں وہ عندلیب ہیں ہم — چمن کو پھول ملے ہم کو داغ بھی نہ ملا

آپ نے دیکھا؟ اس پوری غزل کے بارے میں اگر مقطع سے قطع نظر کرکے آپ سے کہا جائے کہ یہ سوا سو برس پہلے

کی غزل ہے یا کچھ اس سے بھی پہلے کی اور پھر پوچھا جائے کہ یہ غزل کس کی ہے تو غور کرنے پر میر، سودا یا ان کے ہمعصر شعرا میں آپ کسی کا نام نہ لیں گے اور نہ غالب، مومن اور ذوق کا نہ انشا، اور جرأت کا نہ ناسخ اور آتش کا نہ رشک کا نہ بحر کا نہ کسی اور کا۔ صرف مصحفی کا نام زبان پر آئے گا۔ جلال خاندان ناسخ کے شاعر تھے لیکن جو اشعار اور جو غزلیں آج ان کے نام کو مٹنے سے بچائے ہوئے ہیں وہ ناسخ اور خاندان ناسخ کے رنگ میں نہیں ہیں بلکہ مصحفی کے رنگ میں ہیں مثلاً:۔

داغ پر میرے پڑی مرغان گلشن کی جو آنکھ ۔۔۔ سب نے منقاروں میں لیکر گل تر رکھدیا

نگہ مست سے تیری وہ ٹپکتی ہے شراب ۔۔۔ جو سبو میں نہیں، خم میں نہیں، ساغر میں نہیں

جس زمانے میں امیر و داغ کے بعد ہی جلال کا نام مشہور معاصرین میں لیا جاتا تھا اسی زمانہ میں کسی نے ایک شعر میں تینوں کی خصوصیتوں کو بیان کیا تھا:۔

انصاف کا ہے قول کہ ہے داغ کی زبان ۔۔۔ مضمون ہے امیر کا بندش جلال کی

مگر جلال سے پہلے یہ بندش کس کے یہاں تھی۔ سوائے مصحفی کے اور ہم کسی کے یہاں نہیں پاتے۔ غالب کے یہاں بہت ترنم ہے لیکن وہ بہت تیز قسم کا ترنم ہے مصحفی کا ترنم مدہم سُر میں ہے۔ اس کا ٹھہراؤ، بہاؤ اور اس کی نکھری غالب کے ترنم سے مختلف ہے۔ غالب کے یہاں نغمہ ہے تو مصحفی کے یہاں ایک چیز ہو جسے تحت النغمہ ([illegible]) کہہ سکتے ہیں اور یہی نغمہ جلال کے رنگ تغزل میں پایا جاتا ہے۔

مصحفی ہی سے لکھنؤ اسکول کے اس سلسلہ کا بھی آغاز ہوتا ہے جسے ہم "قافیہ اور ردیف کو مختلف پہلوؤں سے باندھنا" کہتے ہیں اور اس طرح ردیف و قافیہ کے تمام امکانات ظاہر ہو جاتے ہیں۔ دلی کا لب و لہجہ چھوڑے بغیر مصحفی نے اسی ترکیب سے لکھنؤ اسکول کے لب و لہجہ میں تنوع پیدا کیا اور اسی چیز کو لیکر آتش و جرأت اور آگے بڑھے۔ چنانچہ اسی لئے کبھی کبھی مصحفی، جرأت اور آتش بیک وقت دلی اور لکھنؤ دونوں جگہ کے شاعر کہہ دئے جاتے ہیں۔ بہر حال لکھنؤ کی زبان وضع کرنے میں مصحفی کا خاص حصہ ہے۔ مصنف شعر الہند کو بھی مصحفی کی اس خصوصیت نے اور اس کے اس اثر نے متوجہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "مصحفی ایک خاص بات میں تمام اساتذہ سے بڑھے ہوئے ہیں یعنی جو صفائی اور روانی اُن کے کلام میں پائی جاتی ہے وہ میر، سودا اور جرأت و انشا کسی میں نہیں پائی جاتی۔ چنانچہ مرزا لطف علی تذکرۂ گلشن ہند میں لکھتے ہیں، "اور گفتگو اس کی بہت صاف ہے بندش نظم میں اُس کے ایک صفائی و شیرینی اور بندش میں اُس کے بلندی اور رنگینی ہے"

یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ میں بھی جب اس خاندان کے لوگوں کو اسیر و امیر کے دامن میں پناہ نہیں ملتی تو زبان کے لحاظ سے اپنے ابوالآبا مصحفی ہی کا سہارا ڈھونڈھتے ہیں۔ چنانچہ جلیل فرماتے ہیں:۔

اس سخن کا جلیل کیا کہنا ۔۔۔ مصحفی کی زبان ہے گویا

قدما کے کلام میں جو شتر گربگی، ناہمواری اور فحاشی پائی جاتی ہے، باوجود پُرگوئی کے بھی مصحفی کا کلام اس سے خالی ہے۔ مصنف شعر الہند سے یہاں تک تو میں بالکل متفق ہوں لیکن اس کے بعد ہی وہ جب یہ کہتے ہیں کہ مصحفی "کسی خاص رنگ کے پابند نہیں" اور جب وہ آزاد کی اس رائے کو صحیح بتاتے ہیں کہ مصحفی کی "غزلوں میں سب رنگ کے شعر ہوتے ہیں کسی خاص طرز کی خصوصیت نہیں"، تو مجھے اس کے ماننے میں تامل ہوتا ہے۔ کیونکہ تقلید و انتخابیت کے باوجود بھی مصحفی، مصحفی رہتا ہے۔ اُس کے ہر روپ میں بھی اُس کا اصل روپ نظر آتا ہے۔

رہا یہ سوال کہ مصحفی کو کس سے زیادہ اور کس سے کم اور کس کے برابر سمجھا جائے اس سوال کا فیصلہ کرتے ہوئے کچھ تکلیف سی محسوس ہوتی ہے۔ خود مصحفی کے زمانے میں تو مصحفی کو جگت اُستاد مانا جاتا تھا اور آج بھی اسکو جگت کا اُستاد ماننا پڑتا ہے۔ سودا کا قایل ہوتے ہوئے بھی مصحفی نے سودا کو جیسا کچھ سمجھا ہے اس کا حوالہ میں مصحفی کی رباعی نقل کر کے دے چکا ہوں۔ ایک اور مقطع میں کہتے ہیں:-

مصحفی ریختہ پہونچاؤ تم اس رتبہ کو — شور یاں گرد ہو مرزا کی بھی مرزائی کا

اب اس کا فیصلہ آپ کیجئے کہ مصحفی غزل میں اپنے کو سودا کے برابر مانتا تھا یا کم یا زیادہ میر کو تو اس نے اس رباعی میں سودا سے ٹکرانے کی کوشش کی ہے اور مصلحت اسی میں دیکھی کہ خود اپنا نام اس سلسلہ میں نہ لائے۔

بہرحال مصحفی کو دوسرے شعراء سے جو نسبت حاصل ہے وہ ہم بتا چکے۔ اور مصحفی کے انفرادی رنگ کو بھی واضح کر چکے مصحفی کے ہمہ گیر اثر کو بھی دیکھ چکے۔ مصحفی نے اُردو غزل کو جو چیز دی وہ ایک مزاج یا رنگ مزاج ہے اس نے ہمارے شاعرانہ کیف و اثر کو ایک ایسا پیمانہ دیا جو نہ بلا نوشوں کے لئے ہے نہ کم ظرفوں کے لئے اور جس کے نشہ کے چڑھاؤ اُتار میں ایک ایسا ربط پیدا ہو جاتا ہے کہ خمار کے ڈر سے بھی پیمانہ ہم کو بچا لیتا ہے۔

فراق گورکھپوری

مصحفی کی غیر مطبوعہ مثنویاں

کہتے ہیں کہ دلّی میں ولؔی کا دیوان پہونچا تو یہاں بھی ریختہ گوئی کا چرچا ہوا اور شاہ حاتم، آبرو، سراج الدین علی خاں آرزو وغیرہ اس طرف متوجہ ہوئے۔ اگرچہ تمامہ اس روایت سے اتفاق کرنا صحیح نہیں۔ تاہم یہ ماننا ہی پڑیگا کہ ریختہ گوئی کی گرمیٔ بازار بہت کچھ اس واقعہ کی رہین منت ہے۔ مگر ساتھ ہی اس خیال میں بھی شک کی گنجایش نہیں کہ ریختہ نے دلّی میں پاؤں پھیلائے تو وہ اُن تمام اصناف پر ضرور حاوی ہو گئی ہو گی جو اُس میں آجتک پائی جاتی ہیں۔ غزل، قصیدہ، رباعی، ترجیع بند، مخمس، مسدس وغیرہ یہ سب چیزیں ہوں گی، جیساکہ مٹے مٹے نشانات آج تک موجود ہیں۔ پھر جب یہ سب کچھ تھا تو یہ کون کہے اور کیونکر کہے کہ مثنوی جس کی ایجاد و اختراع پر اہل عجم کو بجا طور پر ناز ہے ریختہ میں نہ ہو گی اسکی ایک وجہ اور یہ بھی ہے کہ دکنی شاعری میں مثنوی کا صرف وجود ہی نہ تھا بلکہ وہ اور اصناف میں چاند سورج بن کر چمک رہی تھی اور کامل الفن مشاق شعراء کی جولانی کے لئے ایک وسیع میدان کی حیثیت رکھتی تھی جس میں بڑے بڑے شہسوار سخن اپنی جودت طبع کے نمونے دکھا گئے تھے اور دکھا رہے تھے۔ چنانچہ وجدؔی کی مثنوی تحفۂ عاشقاں ۱۰۱ھ میں محمد قلی قطب شاہ بادشاہ گولکنڈہ کی مثنوی ۱۰۱ھ میں لکھی جا چکی تھیں۔ اُس کے بعد سیف الملوک و بدیع الجمال۔ خاور نامہ، علی نامہ، پھول بن بنگاپ نامہ وغیرہ مختلف وقتوں میں تصنیف ہوئیں گو یہ سب نقش اولین کی حیثیت رکھتی تھیں۔

افسوس ہے کہ دلّی کے دور طوایف الملوکی نے اور چیزوں کے ساتھ ادب کی متاع گراں کو بھی غارتگروں کی دست برد کے نذر کر دیا، ورنہ نہ معلوم کتنی مثنویوں کا اور پتہ چلتا۔ پھر بھی شاہ مبارک آبرو اور مولوی سید محمد کی مثنویاں قابل ذکر ہیں جنکا اب وجود تو نہیں ہے مگر نام باقی ہے۔ شاہ مبارک آبرؔو اور حاتؔم کے دور کے بعد ہی سوؔدا، مصحفؔی، میؔر، اثؔر، حسؔن، انشؔا، جراؔت وغیرہم کا دور آیا اور میرے خیال میں یہ زمانہ باوجود آشوب ناک ہونے کے اتنا مثنوی خیز تھا کہ شاید اُس کے بعد اُردو کو اپنی بقا تک پھر ایسا وقت نصیب نہ ہو سکے

میؔر، اثؔر، حسؔن، سوؔدا، انشؔا، وغیرہ کی مثنویاں تو آج اتنی مشہور ہیں کہ اس سے زیادہ کی امید نہیں کی جا سکتی۔ مگر رونا آتا ہے تو مصحفؔی غریب کی قسمت پر جن کا مثنوی کے بارہ میں اگر کوئی نام جانتا ہے تو صرف بحر المحبت کی وجہ سے

اور وہ بھی اس لئے کہ اب وہ چھپ گئی ہے یا زیادہ سے زیادہ شعلۂ شوق سے کان آشنا ہیں۔ مولوی محمد حسین آزاد مرحوم نے یہ تو لکھا کہ "شعر کی ہر شاخ کو لیا ہے اور جو قواعد و ضوابط اُس کے پُرانے اُستادوں نے باندھے ہیں اُنکا حق حرف بہ حرف بلکہ لفظ بہ لفظ پورا ادا کیا ہے" قصیدوں۔ تذکروں اور فارسی دیوان کا بھی ذکر کرتے ہیں مگر مثنویوں کا نام نہیں لیتے۔ اسی طرح گل رعنا میں مثنوی سے اُن کی تصنیفات کی فہرست خالی ہے مولانا افق امروہوی نے صحیفۂ مصحفی میں اور سب کچھ لکھا ہے مگر مثنویوں کے ذکر میں مثنوی شعلۂ شوق۔ بحر المحبت، دو جزو شاہنامہ تا نسب شاہ عالم کا ذکر ہے اور کچھ نہیں۔ بحر المحبت کو مولوی عبد الماجد دریا بادی نے ترتیب دیا ہے۔ اگرچہ وہ اسوقت میرے پاس نہیں مگر میں نے اُسے دیکھا ہے اور جہاں تک یاد آتا ہے وہ بھی شاید دوسری مثنویوں کے ذکر سے خالی ہے بہر حال میرے سامنے اسوقت اُنکا دیوان دوم ہے۔ اس میں اُن کی مندرجۂ ذیل مثنویاں موجود ہیں اگرچہ ان مثنویوں پر نام نہیں ہیں مگر اُن کے مضمون سے تطابق کرتے ہوئے میں اُن کا نام خود تجویز کر کے لکھنے کی جرأت کرتا ہوں:-

۱- مثنوی در شکایت موسم گرما۔ سنہ بہ تابستان مصحفی، جس میں گرمی اور لُو کی شکایت کی گئی ہے۔ اس میں ۵۴ شعر ہیں۔

۲- مثنوی در بیان آتشزدگی۔ کسی سال آتش زدگی زیادہ ہوئی ہے تو انھوں نے طبیعت کی بھڑک سے یہ مثنوی کہہ ڈالی ہے۔ اس میں ۴۰ شعر ہیں۔

۳- غریب خانہ مصحفی۔ اس میں اپنے مکان کی کیفیت ارقام فرمائی ہے اور اس میں ۲۳ شعر ہیں۔

۴- کھٹمل نامہ۔ کھٹملوں نے زیادہ ستایا ہے تو ۵۹ شعر میں یہ مثنوی لکھی ہے۔

۵- سردی نامہ۔ کسی سال میں سردی بہت بڑھی ہے تو اس کے حالات ۴۳ شعر میں لکھے ہیں۔

۶- مثنوی شعلۂ شوق، جس میں ۸۱ شعر ہیں اور صحیفۂ مصحفی میں مولانا افق امروہوی نے اُسے شایع بھی فرما دیا ہے یہ دیوان ماہ رمضان المبارک سنہ ۱۲۴۰ھ عہدِ شاہ غازی الدین حیدر میں لکھا گیا تھا اور چونکہ سنہ ۱۲۴۰ھ ہی مصحفی کا سال وفات ہے اس لئے اس نسخہ کی صحت میں کسی کو شبہ نہ ہونا چاہئے۔ ہو سکتا ہے کہ اجودھیا پرشاد جو اسکے کاتب ہیں وہ مصحفی کے شاگرد ہوں۔

۷- مثنوی ہجو مودی خانہ۔ یہ غالباً شاہزادہ سلیماں شکوہ کے مودی خانہ کی ہجو ہے۔ جو اُن کے اُس دیوان میں بھی موجود ہے جو کتب خانہ ندوۃ العلماء میں محفوظ ہے۔ مگر چونکہ یہ دیوان قلمی ناتمام ہے اس لئے میں اندازہ نہیں کر سکا کہ یہ کونسا دیوان ہے۔ اس مثنوی میں ۵۲ شعر ہیں جو میرے پاس علحدہ موجود ہیں۔

۸- مثنوی بحر المحبت مطبوعہ شامل صحیفۂ مصحفی مرتبہ مولانا افق امروہوی مطبوعہ مطبع شاہی کانپور جنوری سنہ ۱۹۲۶ء اس میں سے صرف بحر المحبت اور شعلۂ شوق کو میں نظر انداز کر دوں گا کیونکہ وہ صحت کے ساتھ دار المصنفین اعظم گڈھ سے شایع ہو چکی ہے اس طرح شعلۂ شوق کو کہ وہ بھی صحیفۂ مصحفی میں شایع ہو گئی ہے۔ مگر صحت کے اہتمام نہ ہونے کی وجہ سے ان میں بہت سے اسقام موجود ہیں

مثنویاتِ مصحفی پر ایک عام رائے یا سرسری نظر محترم مولوی عبدالحق صاحب بی۔اے سکریٹری انجمن ترقی اُردو نے حیدرآباد سے ایک مرتبہ مجھے ایک خط میں تحریر فرمایا تھا کہ مصحفی اور میر حسن کی بہت سی مثنویاں دستیاب ہوئی ہیں اور اُن پر کچھ لکھا جا رہا ہے۔ ممکن ہے کہ اُن کی مثنویاں اور بھی ہوں لیکن میرا اندازہ ہے کہ مصحفی کی مثنویاں اگر اور ہوئیں بھی تو وہ مختصر ہوں گی۔ کیونکہ اُن کی موجودہ مثنویوں میں جو مثنوی سب سے بڑی میری نگاہ سے گزری ہے وہ بحر المحبت ہے۔ مگر وہ بھی درجۂ اختصار سے تجاوز نہیں کر سکی اور میر حسن کی مثنوی یا زہرِ عشق اور گلزار ابراہیم وغیرہ سے بہت کم ہے اور بقیہ مثنویاں جن کے اشعار کی تعداد ہم لکھ چکے ہیں اس سے بھی کم ہیں۔ اس سے اُن کا مذاق مثنوی نویسی معلوم ہوتا ہے اور صاف صاف پتہ چل جاتا ہے کہ وہ اس بارہ میں ہرچہ گوئید مختصر گوئید پر عامل تھے اور اسی لئے اُنکی مثنویوں میں وہ نقص پیدا نہیں ہو سکا، جس کی وجہ سے اکثر مثنوی نویس تسلسل سے ہٹ کر بے ربطی کے شکار ہو گئے ہیں یا اُن کی طولِ داستان سے پڑھنے والوں کو بیدلی اور بیزاری کا منھ دیکھنا پڑتا ہے۔

مثنوی کے صفات مثنوی کے لئے موجودہ نقادوں نے یہ قید بھی لگا دی ہے کہ فرضی اور وہمی دیو بھوت اور جنوں پریوں اور دور دراز کار باتوں پر اُس کی بنیاد نہ رکھی جائے۔ مصحفی اس سے بالکل دور ہیں میں نے اُن کی جو مثنویاں دیکھیں یا مجھے جن مثنویوں پر کچھ لکھنا ہے وہ بالکل مناظر و واقعات کے تحت میں ہیں اور اس لئے اگر دورِ سابق میں پسندیدگی کی نظر سے نہ بھی دیکھی جاتی ہوں تو آج ضرور پسندیدگی کے قابل ہیں۔

مثنوی میں مبالغہ کو اس حد پر کبھی نہیں پہونچنا چاہئے جو غلو کی حد تک پہونچکر سوئی کو پھاوڑا اور رائی کو پربت کر کے دکھائے۔ مصحفی کا بیان اس عیب سے بڑی حد تک پاک ہے۔

روانی، صفائی، سادگی، ہر کلام کی صفات مسلمہ میں سے ہیں اور مثنوی میں بدرجۂ اتم یہ چیزیں دلکش ثابت ہوتی ہیں۔ اس بارہ میں اول تو مصحفی کی مشاقی اور ریختہ کاری ہی کفیل ہیں۔ اس کے علاوہ سوز و برشتگی جو غربت، افلاس اور بارِ تنگدستی کی وجہ سے اُن کی طبیعت کا جوہرِ ثانی بن گئی تھیں وہ ہر جگہ اُن کی مثنویوں میں بھی غزلوں کی طرح نمایاں نظر آتی ہیں اور اُن کے کلام کو میر تقی میر کے سوائے دوسرے سے پوری طور پر مماثل نہیں ہونے دیتیں اس لئے جو جوہر میر کے کلام میں ہے وہی اُن کے یہاں ہے۔

ہجو کے لئے سودا اپنے زمانہ کا اُستادِ کامل مانا گیا ہے اور عجب نہیں کہ مقابلہ کرنے پر میر سے بھی یہ رنگ خاص اُسکے یہاں بہتر ہی ثابت ہو۔ مگر آپ دیکھیں گے کہ مصحفی اس میں بھی کچھ کم نہیں ہے۔

مصحفی کی مثنویاں شکایت و ہجو پر مبنی ہیں۔ جیسے کھٹمل نامہ یا غریب خانہ یا سردی کے زور و شور کا حال اور شکایت جب کبھی حد سے گزر جاتی ہے تو اس میں یا تو جنگجویانہ صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ یا پھر عجز و الحاح سے اس کا سلسلہ ملتا ہے یا ہجویہ صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اُن کی یہ شکایتیں بھی ہجو پر تمام ہوتی ہیں۔ اب لیجئے ہجو گوئی کو، ہجو صرف اسی کا

نام نہیں ہے کہ کسی کو کھلی کھلی گالیاں دیجائیں اور بس۔ بلکہ اس میں بھی ایک مشاق کو وہ تمام صناعیاں برتنے اور بروئے کار لانے کی ضرورت پڑتی ہے جس سے کلام میں میناکاری اور گنگا جمنی کا کام نظر آنے لگتا ہے اور کہیں سرخ کہیں نیلا کہیں سفید رنگ وہ عالم پیدا کرتا ہے کہ پھر نگاہ ایک جگہ ٹھہرتی ہی نہیں بلکہ بحیثیت مجموعی سے وہ ایک خاص اور دیکھنے کی چیز ہوتی ہے ہجو کی رنگ آمیزیاں کہیں مبالغہ کہیں استعارے، کہیں استہزا، کہیں پھبتی، کہیں طعن و تشنیع، کہیں رمز و کنایہ، کہیں تشبیہ اور کہیں صاف صاف واقعات اور کہیں کہیں کھلی کھلی کہنے پر منحصر ہوتی ہیں۔ اگر یہ سب چیزیں نہ ہوں تو پھر ہجو ہجو نہیں رہتی۔ مصحفی کے یہاں اپنے اپنے محل مناسب پر یہ سب چیزیں موجود ہیں۔

اتفاق سے مصحفی کی زیر بحث مثنویاں ایسے بیانات پر مبنی ہیں جن میں اُن کے معاصرین سودا، میر حسن، میر تقی اور اُن کے حریف انشا بھی اپنی اپنی جولانیٔ طبع دکھا چکے ہیں، اس لئے تقابل کا ایک خاصہ موقع ہاتھ آگیا۔

مثنوی کا یا خصوصاً اس قسم کی مثنویوں میں بڑی مشکل یہ پڑتی ہے کہ عامۃ الورود واقعات، معمولی لوگوں کی باتوں اور اُن کے محاورات وخیالات کو یا تو لیا ہی نہ جائے یا لیا جائے تو اس طرح کہ وہ شرفا کے رنگ اور طرز گفتگو سے علٰحدہ نہ ہوں اور اس کا نباہنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ سبھی جانتے ہیں کہ مصحفی کی زندگی عبرتناک آلام کا مجموعہ تھی اور یہی وجہ ان کے شکایات وہجویات کی ہوئی ہے اور اسی پر اُن کی مثنویوں کے اکثر حصوں کی بنیاد ہے۔ مگر اسکے بیان میں انھوں نے بڑی قدرت دکھائی ہے اور اگر سب جگہ نہیں تو بیشتر جگہ وہ بہت بلند نظر آتے ہیں۔

زبان کے لحاظ سے مصحفی کی زبان بالکل قلعہ معلے کی زبان ہے اور دہلی کے تمام محاورات پر وہ قادر ہیں اور ہونا بھی چاہیے۔ اس لئے کہ ان کی تعلیم وتربیت دہلی ہی میں مکمل ہوئی اور تمام مشاہیر سے ان کی ملاقاتیں تھیں۔ تکمیل زبان ومحاورات کا ان کو فطرتی ذوق تھا۔ پھر کوئی وجہ نہ تھی کہ ان کی مثنویوں میں کہیں زبان کی خامیاں نظر آئیں۔

ہم سب سے پہلے غریب خانۂ مصحفی کی تصویر دکھانا چاہتے ہیں جو انھوں نے اپنے الفاظ کے رنگ و روغن سے کھینچی ہے۔

غریب خانۂ مصحفی

اپنے رہنے کا جو ملا ہے مکاں — ہے بعینہ وہ صورتِ زنداں،
نہ تو روزن نہ اس میں جالی ہے — دن وئے (دن رہے) جیسے رات کالی ہے
اُس میں مطلق نہیں ہوا کا گزر — سیر نیلا کجی واں کرے ہے نظر
جائے بول اُس کے در کے آگے ہے — دوزخ اک میرے گھر کے آگے ہے

بوئے ناخوش جو اُس سے آتی ہے — جو ہرِ مغز کو جلاتی ہے[1]

مصحفی کے باقی اشعار سنئے:-

تس پہ جالوں کی کیا کہوں میں بات، — تو کہے چھت میں چھا رہی ہے رات

مکڑیوں نے جو گھر بنائے ہیں — تو سنئے کاٹ کر دکھائے ہیں[2]

خاکبازی ہے اس کی چھت کا کام — خاک اُس سے جھڑا کرے ہے مدام

چارپائی جو میں اُٹھاتا ہوں — ایدھر اودھر اُسے بچھاتا ہوں

سب کے گھر جا ذرا نہیں ملتی — خاک چھانی صفا نہیں ملتی[3]

---

[1] بیچارے میر حسن کو بھی یہی مصیبت پیش آئی۔ کہتے ہیں:-

نہ تو مطبخ نہ واں مکانِ ضرور — دونوں باتوں کا یہاں نہیں دستور

ایک چوکی دھرے ہے صحن کے بیچ — صحن میں ساری جا ضرور کی کیچ،

تسپہ دو ٹٹیاں برائے اوٹ — وہ کہ جاویں ہوا سے خاک میں لوٹ

ڈیوڑھی کا جو بند کیجئے در — بیٹھے جا ضرور تب جا کر

آنے والا جو کوئی آجاوے — بند دروازہ دیکھ پا جاوے

یعنی در جو کھلا نہیں پایا — کوئی ہے جا ضرور کو آیا،

اسی موضوع پر میر تقی میر کے بھی دو ایک شعر سن لیجئے اور ان کو مصحفی کی مثنوی کے ابتدائی شعروں سے ملائیے۔ کہتے ہیں:-

جسمِ خاکی میں جس طرح جاں ہے — اس طرح خانہ ہم پہ زنداں ہے

ظلمتیں اس کی سب پہ روشن ہیں — زندہ در گور ہم کئی تن ہیں،

[2] میر نے مکڑیوں کی صناعی کا ذکر اس طرح کیا ہے:-

دل ہے کچھ مکڑیوں کا احساں مند — کہ جنھوں نے کئے ہیں جھانکے بند

مصحفی کا پہلا شعر تو تشبیہی ہے لیکن دوسرے شعر میں جو اُنھوں نے تو سنئے کاٹ کر دکھانے کی پھبتی کہی ہے وہ لاجواب ہے اور شاید نئی بھی ہے۔

[3] میر حسن کے گھر میں بھی یہی خاک اُڑتی ہے۔ کہتے ہیں:-

گردیں صورتیں اٹی ہیں سب — ماٹی کی مورتیں بنی ہیں سب

کپڑے ہم جھاڑتے ہیں لیل و نہار — دھوبی دھوتے ہیں جیسے دے دے مار

تکیے رہتے ہیں اس طرح میلے، — جوں تیمم کی خاک کے تھیلے

طاق پر تھے جہاں جہاں جزدان — ہو گئے کل وہ خاک ریگستان

تھے دھرے وہ جو خاص و عام قلم — ریگِ ماہی ہوئے تمام قلم

جھاڑتے جھاڑتے بیاض و کتاب — حرف مٹ مٹ کے ہو گئے ہیں خراب

صاف آٹا نہ کوئی سانے گا — خوب جب تک نہ خاک چھانے گا

کیا کہیں کس طرح سے جیتے ہیں — خاک کھاتے ہیں کیچ پیتے ہیں

مصحفی :- دل کو کاوش ہی رات اور دن ہے　　بسکہ پشّوں کی اس میں بھن بھن ہے
الغرض اس میں مجھ کو ہر صورت　　رہتی ہے موذیات سے صحبت[لہ]
کبھی چیونٹی بدن کو کاٹے ہے　　کبھی دیمک ہی پائے چاٹے ہے
چارپائی جو ہے ہمارے پاس　　کھٹملوں کی رہے ہے اُس میں مواس
گھونس نے کردی ہے زمیں سوراخ　　موشک کور پر ہے عرصہ فراخ (بودو باش)
گر نظر جائے جانب دیوار　　نظر آتی ہے چیونٹیوں کی قطار
گھن نے پایوں کے تئیں جو ہو چاٹا　　خوردہ اس کا چنے کا ہے آٹا[ٹہ]
رات دن جی صفا کو ترسے ہے　　اپنی قسمت کی خاک برسے ہے
اس میں جتنے کہ ہیں لکھے اشعار　　سب وہ لکھے گئے بہ خط غبار
خاک اُن پر زبس پڑی پیہم　　سر خاکی ہوئے تمام قلم
گرد جزدانوں پر ہے دو دو تسو　　ہے قلمداں اٹا پڑا یکسو
گھر میں میرے جو کوئی آتا ہے　　اپنی صورت کو بھول جاتا ہے
مصحفی جائے سینہ چاکی ہے　　گھر نہیں یہ تو برج خاکی ہے

(کھٹمل نامہ)

مصحفی بیچارے کا گھر تو جیسا تھا اس کی ایک جھلک آپ دیکھ ہی چکے، اس میں کھٹملوں کا نہ ہونا ایک ایسی کمی تھی

لہ میر حسن بیچارے کو مچھروں کی بجائے چینٹیوں سے زیادہ سابقہ پڑا ہے اور وہ اسی کا رونا روئے ہیں :-

نہ تو بچھو نہ کھٹمل اور نہ مار　　مور نے سب کو کر دیا مسمار
اپنی بانی پہ جب یہ آتی ہیں　　بوٹیاں توڑ توڑ کھاتی ہیں
مردُم آزاری پر جو باندھی کمر　　تو نکالے ہیں چیونٹیوں نے پر
دیکھ کر ہم کو اس جگہ پہ نحیف　　پہلوانی کرے ہیں مور ضعیف
رات دن ہم سے یہ بگڑتی ہیں　　مورچہ باندھ باندھ لڑتی ہیں

ٹہ جیسے مصحفی کے پلنگ کے پایوں کو گھن نے چاٹ لیا تھا ایسے ہی میر صاحب کے چھپر کی جھینگروں نے خبر لی ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ:-

پھونس کچھ ہے کہیں سو آٹا ہے　　بانس کو جھینگروں نے چاٹا ہے
اڑ گئی گھاس مٹی ہے ڈالا　　ہے جو بندھن سو مکڑی کا جالا

جس کو اور کسی صورت سے پورا ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ غرض جہاں تک ہو سکا خوب خوب اُن کو بھنبوڑا اور جتنا ممکن ہوا وہ بھی چلائے۔ اُن کے حریف انشا بھی اس زد سے نہ بچ سکے۔ میر تقی میر کی بھی فریاد و فغاں پر نوبت پہونچی۔[1] مصحفی کا بیان ملاحظہ ہو:۔

کھٹملوں کی زبسکہ ہے افراط
تلخ ہے ان سے اپنا خواب نشاط
کافروں نے یہ سر اُٹھایا ہے
سارے پنڈے کو توڑ کھایا ہے
کیا کہوں ان گزندوں کی زشتی
کہ مجھے کر دیا ہے خارشتی
ہے بھکی آگ سی بدن میں تمام
پڑ گئے ہیں ددوڑے تن میں تمام
بسکہ بے چین ہوں میں انکے ہات
نیند آتی نہیں ہے ساری رات
دمبدم کروٹیں بدلتا ہوں
ایدھر اودھر پڑا اُچھلتا ہوں

---

[1] میر کی شکایت سنئے:۔

جنس اعلےٰ کوئی کھٹولا کھاٹ
پائے پٹی رہے ہیں جن کے پھاٹ
کھٹملوں سے سیاہ ہے سو بھی
چین پڑتا نہیں ہے شب کو بھی
شب بچھونا جو میں بچھاتا ہوں،
سر پہ روز سیاہ لاتا ہوں،
کیڑا ایک ایک پھر مکوڑا ہے
سانجھ سے کھانے ہی دہ دوڑا ہے
ایک چٹکی میں ایک چُھنگلی پر
اک انگوٹھا دکھاوے اُنگلی پر
گرچہ بہتوں کو میں مَسل مارا
پر مجھے کھٹملوں نے مل مارا
ملتے راتوں کو گھس گئیں پوریں
ناخنوں کی ہیں لال سب کوریں
ہاتھ تکئے پہ گہ بچھونے پر،
کبھو چادر کے کونے کونے پر
سلسلایا جو پائنتی کی اور
وہیں ملا کر ایڑیوں کا زور
توشک اِن رگڑوں ہی میں سب پھاٹی
ایڑیاں یوں رگڑتے ہی کاٹی
جھاڑتے جھاڑتے گیا سب بان
ساری کھاٹوں کی چولیں نکلیں ندان
نہ کھٹولا نہ کھاٹ سونے کو
پائے پٹی لگائے رونے کو
جب نہ تب پنڈے پڑے پائے
سیتلا کے سے داغ مرجھائے
سو بھی تنہا نہ بان میں کھٹمل
آنکھ مُنہ ناک کان میں کھٹمل

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۰۳ پر ملاحظہ ہو)

مصحفی کے باقی اشعار سنئے :-

پائنچے میں کبھی گھس آتے ہیں — کبھی نیفے میں سُر سُراتے ہیں
اک خلش ساری رات ازار میں ہے — آنکھیں بند اور ہات ازار میں ہے
گاہ رو گہ جبیں کھجاتا ہوں — گاہ سر گہ سُرین کھجاتا ہوں
مارتا جاتا ہوں انھیں جوں جوں — کان پر ان کے رینگتی نہیں جوں،
ان کے ملنے سے وقت (بجیسے جیسے) بد خوابی — چٹکیاں ہوگئی ہیں عنابی
بلکہ غصے سے جو دیا ہے فشار — سُرخ ناخن ہیں جوں لب سوفار
اُن کی گردن پہ خون میرا ہے — خوں مری اُنگلیوں پہ اُن کا ہے
اس سے رنگیں کوئی نہ تھا مضمون — باندھا میں اُنگلیوں پہ ان کا خون
گو کہ اب پہونچے سب بدن کو گزند — ہوگئیں اُنگلیاں تو فندق بند

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۰۲)

کہیں پھڑکا کہ جی سے تاب گئی — آنکھ سے تا بگاہ خواب گئی
سیکڑوں ایک چارپائی میں — اک ہتیلی میں ایک گھائی میں
ہاتھ کو چین ہو تو کچھ کہئے، — کب تلک یوں ٹٹولتے رہئے

میر کی فغان رنگین سُن چکے - انشاء کا بیان ملاحظہ ہو:-

کچھ یہ کھٹمل پڑے ہیں اب کے سال — کہ ہوئے سب زمین لالوں لال،
چھاگئے ہیں جو سارے یہ بدبخت — شاخ مرجاں بنے تمام درخت
گھسی ایک اُن کی جابجا سے لڑ ہے — میخ جو ہے سو مونگے کی جڑ ہے
ہوگئے سرخ بید سارے سرد، — لال مرغے بنے تمام تدرو
بسکہ جا کر جمے قطار قطار — ہوگئی لالہ نرگس بیمار
ان لعینوں کا یہ سُہاگ ہوا — تھا جہاں سبزہ لال ساگ ہوا
یہ جو سپٹے غرض کہ ہو بھٹی — گُل مختوم ہوگئی مٹی،
الغرض تھا جہاں جہاں جنگل — بن گیا کھنکچیوں کا وہاں جنگل

انشاء کی مثنوی میں ۹۶ شعر ہیں اور اس میں شک نہیں کہ اچھی اچھی تشبیہوں و استعاروں سے کام لیا ہے لیکن چونکہ انشاء کی زندگی امیرانہ بسر ہوتی تھی اور وہ کھٹملوں کی مصیبت سے خود دوچار نہ ہوا تھا اس لئے جو کچھ کہا ہے وہ صرف شاعری ہی شاعری ہے

لو ہو پی پی زمیں ہوئے موٹے — ریزۂ لعل ہیں بڑے چھوٹے
لیکن اس تب پہ یہ سبھی خناس — منھ میں رکھتے ہیں سوزن الماس
اُن کے نیشوں سے ہے مری فریاد — میں ہوں اور کتنے نشتر فصاد
ہر سر مو پہ میرے ایذا ہے — یعنی ان موذیوں کا بلوا ہے
گرچہ اک قطرہ مجھ میں خون نہیں، — لیک یہ خالی از جنون نہیں
تلے کروٹ کے آ جو جاتے ہیں، — وہ ہیں جھنجلا کے کاٹ کھاتے ہیں
کچھ مرا ان سے بس نہیں چلتا — میں تو رہتا ہوں ہاتھ ہی ملتا،
کاٹتا ہے جو کوئی آکے کہیں — بیٹھے بیٹھے اُچھل پڑوں ہوں وہیں
بسکہ ہے ان دنوں اُنھوں کا وفور — لیٹنے کا تو کیجئے کیا مذکور
اُن کے ہاتھوں سے ہے مجھے اے یار — بیٹھنا چارپائی پر دشوار
پانوں میں جو مواس ان کا ہے — اُس کا ہر پایہ بھڑ کا چھتا ہے،
الغرض شام سے ہو شب بیدار — کھیلتا ہوں میں کھٹملوں کا شکار
مارے جو موٹے موٹے چُن چُن کر — چھینٹ کا تھان بن گئی چادر
گھسے دیوار پر جو کر کے تلاش — کر دیا گھر کو خانۂ نقاش
نہ زمیں ہی میں خاکمال ہوئے — گھر کے کونے تمام لال ہوئے
نہیں مرتے ہیں تو یہی بد ذات — کیا انھوں نے پیا ہے آبحیات
کوئی کیونکر کرے اُنھوں کا شمار — پیدا ہوتے ہیں ایک سے یہ ہزار
ہے بجا بسکہ ہیں زمیں پہ زیاد — کہئے راون کی اُن کو گر اولاد[1]
فائدہ ان سے کچھ نہیں زنہار — غیر اس کے کہ ہوں میں شب بیدار

[1] اسی خیال کا اظہار انشاء نے بھی کیا ہے مگر وہی رنگینی اور پھوہڑپن کے ساتھ، اصلیت سے دور لکھتے ہیں:-

کبھی اُن کی جو کچھ شکایت کی — ایک پنڈت نے یوں روایت کی
ایک راون کا پوت تھا جیل — اُس کی اولاد ہیں یہ سب کھٹمل
راون اُلٹا تبھی ـــــ — لو ہو پینے کی ان کے دل میں ٹھنی،
کیوں نہ دیں چارپائی پر ڈنکا، — چھن گئی ان کی سونے کی لنکا،

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۰۵ پر ملاحظہ ہو)

یہ سمجھ کر کہ لوگ جاگتے ہیں — چور بھی ان کے ڈر سے بھاگتے ہیں
دوڑتے ہیں زبسکہ ہیں چالاک — میری آنکھوں میں ڈال جاتے ہیں خاک
آپڑیں ہیں جو میرے ہاتھ کہیں، — راہ لیتے ہیں آستیں کی وہیں
کوئی آسان ہاتھ آتے ہیں — گھائیوں میں سے نکلے جاتے ہیں
ہیں زباں ان کی جوں سناں سرتیز — یاد ہے تب تو ان کو جنگ گریز
بوریئے پر جو بیٹھے کوئی دم — وہاں بھی ان کا لگا رہے ہے غم
بیخبر وہیں کاٹ کھاتے ہیں — کب یہ بدبخت ہاتھ اُٹھاتے ہیں
میں بھی ازبسکہ ان کا ہوں اُستاد — قتل کی ان کے رہے ہے مجھ کو یاد
چارپائی کو جب بچھاتا ہوں — چادر اک اسپہ کھینچ جاتا ہوں
بعد ازاں رکھ سرہانے اک تکیا — سر کو رکھ اُسپہ سو رہوں ہوں ذرا
اتنے میں سونگھ کر یہ بوئے بدن — جوں ہیں باصد ہزار حیلہ و فن
فرش چادر پہ ہوکے پھرتے بے غم — چلنے لگتے ہیں ایک اک ازپئے ہم
میں بھی جلدی دیا منگا کے وہیں — گھس بتاتا ہوں خوب ان کے تئیں
گرچہ پاتے رہے ہیں نت مالش — پر مری ان سے ہے وہی نالش

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۰۴)

سو یہ سونتے کو سیتے ہیں جب تاڑ — کرتے ہیں اپنی سی اکھیڑ پچھاڑ
راچھسوں کی سی کیوں نہ باندھیں ساکھ — ایک سے ہوتے ہیں یہ نوے لاکھ
کیوں نہ ہر فرد ہوئے غیرت دار — قوم کے اپنی یہ بھی ہیں سردار

مصحفی نے ایک چلتی ہوئی بات کہدی تھی۔ انشاء کی ظریف طبیعت نے سوئی کا بھاوڑا اور رائی کا پربت بنا دیا۔ مگر فرق اتنا ہے کہ وہاں دلسوزی کے طور پر ایک بات کہی تھی انھوں نے بات کا بتنگڑ بنا دیا۔ اور ہنسی ہنسی میں کہیں سے کہیں پہونچ گئے۔ اس پر بھی قرار نہیں آگے چلکر لکھتے ہیں

جھوٹ پنڈت کی وہ روایت ہے — وہ جنوں کی سی اک حکایت ہے
پر یہی جانتے ہیں اہل یقیں — ہیں یہ سارے لعین ابن لعیں
یا تو ہیں یہ یزید کی اولاد — اگر بے شبہ نسل ابن زیاد
جوں جوں مرتے ہیں بڑھتے جاتے ہیں — اور لوگو اگر تو ڑے کھاتے ہیں
کام ہے ان سے ہی مریدوں کا — ڈھیر جو گنج ہے شہیدوں کا

وہی راتوں کا جاگنا ہے ہنوز / اور وہی خواب صبحدم ہر روز
اُن کی ایذا سے میں ہی کچھ نہیں دنگ / عرصہ کرمِ کتاب پر بھی ہے تنگ
یعنی مجھ پاس ہیں جو کچھ اجزا / دخل اُن میں بھی کافروں نے کیا
اُن میں جا کر ہوئے تو ہیں یہ بند / لفظ و معنی کے تئیں نہ پہونچے گزند
اور قلمداں میں جو گھسے جا کر / کیا یہ دیں گے مرے قلم کو ضرر
سو تو اُس کی زباں ہے ایسی تیز / جس سے کرنے لگیں بریز بریز
خاصہ ہنگام ہجو کہنے کے / الاماں مانگتے ہیں سب جس سے
دشمنِ جاں یہ مصحفی کے ہیں / تشنۂ خوں یہ ہر کسی کے ہیں
بیش و کم چلتی ہو زباں جس کی / چاہیئے ہجو ہی کریں ان کی

سردی نامہ

اب کے سردی کا جو ہوا ہے وفور / ڈھانپ کر منھ کو رہ گئے ہیں تنور
دیگداں گھر میں سب کے ہیں بے کار / یعنی آتش کا سرد ہے بازار
آئی ہے ہو کے زمہریر ہوا / ہے جہنم زمانہ سردی کا
بن رہے ہیں جو یخ ظروف تمام / برف خانہ ہے خانۂ حمّام
عوض آتش کے ان دنوں اے یار / خاک کھاتا ہے مرغ آتشخوار
شمع تک جا کے کیا کرے گلگیر / شمع تو بن رہی ہے خود کشمیر
بیچ پانی کے جاڑے کے مارے / بچہ بط ہیں یخ بچے سارے
صاحب لقوہ جیسے ہے نومید / کانپتا نکلے ہے سحر خورشید[1]
کہیں چمکے جو اک ذرا اخگر / پھر جو دیکھا تو ہیں وہ خاکستر

---

[1] سودا نے اپنی مثنوی کو اسی آخری شعر کے مضمون سے شروع کیا ہے۔ لکھتا ہے:۔

سردی اب کے برس ہے اتنی شدید / صبح نکلے ہے کانپتا خورشید

مگر انصاف یہ ہے کہ صاحب لقوہ کی تشبیہ سے مصحفی آگے بڑھ گئے ہیں۔ ایسے ہی مصحفی کا تیسرا شعر جو زمہریر کے مضمون کا ہے، بڑا نازک ہے اور ایک منطقی دلیل کی حیثیت رکھتا ہے کہ جب ہوا زمہریر بنکر آئی ہے تو مطلب یہ ہوا کہ جہنم کے معنے خود سردی کے زمانے کے ہیں سودا نے اسکو یوں کہا ہے

سودا ؎ جتنا عالم تھا کاشمیر ہوا / بلکہ کہئے کہ زمہریر ہوا

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۰۷ پر ملاحظہ ہو)

دلمیں سردی سے ہووے ہے اب درد — آتش عشق ہو گئی ہے سرد

آہ و نالہ میں وہ کہاں گرمی — دہر سے ہو گئی نہاں گرمی

ان دنوں وے جو عشق کرتے ہیں — دمبدم آہ سرد بھرتے ہیں[1]

برف باری ہے اب سحاب کا کام — نہیں اس رت میں آفتاب کا کام

ابر ہو دگلہ پوش آتے ہیں — دانت بجلی کے کڑکڑاتے ہیں[2]

دیکھ پھیکا سا آفتاب کا رنگ — آتش لعل ہے نہاں در سنگ

جوہری گر کرے اب اس پہ نظر — پنبہ دانہ ہے دانۂ گوہر

باغ ہستی میں دیکھکر یہ ہوا — سیب کیا کیا نہ سرخ و زرد ہوا

نہیں مطلق بہی کو اپنا ہوش — ناشپاتی روئی میں ہے روپوش

باغباں ہی نہ منہ کو ڈھانپتے ہیں — بید بھی اس ہوا سے کانپتے ہیں

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۰۶)

مصحفی نے کشمیر کا شعر بھی خوب کہا ہے اور اس میں بھی وہی منطقیت ہے۔ مصحفی کے یہاں یہ چھٹا شعر ہے مگر سودا نے شمع کے مضمون کی حیثیت کو بہت بڑھا دیا ہو کہتے ہیں ؎

یہ ہے آفت چراغ تک در پے — لو گویا کہربائے شمع سے ہے

مصحفی کا دوسرا اور پانچواں شعر جو آگ کے متعلق کہا ہے بہت خوب ہے۔ مگر سودا نے اس آگ کے مضمون کو واقعیت کا جامہ پہنا کر بہت بڑھا دیا ہے:۔

آگ بھی ٹھنڈ سے ٹھٹھرتی ہے — گودوں کے بیچ چھپتی پھرتی ہے

بے حرارت ہیں سردی کے مارے — طرح یاقوت کی اب انگارے

مصحفی نے چوتھے شعر میں حمام کے برتنوں کو یخ بنا کر حمام کو برف خانہ بنا دیا ہے۔ تو سودا نے برتن ہی نئے طیار کئے ہیں ملاحظہ ہوں:۔

بسکہ یخ بستہ بحر بیچ ہے آب — برف کی ہے رکابی ہر گرداب

[1] سودا کے ظریف مزاج نے عشق و عاشقی کے مضمون کو اپنی طبعی ظرافت کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ کہتا ہے:۔

جب سے سردی سے پڑ گیا پالا، — سرد ہے داغ عشق جوں لالا

کرے ہے ان دنوں جو کوئی بیاہ — ساس سسرے کے آگے رو ہے سیاہ

پڑا سکڑا ہے نے کنار نہ بوس — زانو آغوش میں ہیں جائے عروس

[2] جس طرح مصحفی نے ابر کو دگلہ پوش بنایا ہے، سودا کے تخیل نے بھی کئی چیزوں کو خلعت عنایت فرمایا ہے:۔

دیں ہیں پوشش زمیں کو پا تو نے جھاڑ — پابدامن ہیں جس قدر ہیں پہاڑ

پانی پر جس جگہ کہ کائی ہے — سبزہ و شال کی رضائی ہے

مشک پاتا ہے قیمت کافور — سر پہ نافے کی ہے کلاہ سمور
جب غریبوں کے سر پہ آئے ہے رات — ہے ہم آغوشی اُن کو زانو سات
سر پہ لیکر گلیم بخت سیاہ — گر رہیں ہیں گدا جو کر کر آہ
مارِ سرمانہ کاٹ کھائے کہیں — بیم سے پا دراز کرتے نہیں
اپنی حدّت سے جو ہوئی ہے نفور — فلفل گرداب ہے خود کافور
فلفل سرخ کا کروں اظہار — ٹک ادھر کان دھر کے سن لے یار
اس کو گر تو زبان پر رکھے — اور ذرا ان دنوں مزا چکھے
تجھ کو پہونچا دے وہیں تا لب گور — یہی جانے کہ کھالیا کافور
آگ سے شعلہ جو اُٹھے ہے کبھو — وہ بھی کرتا ہے دمبدم ہو ہو
سب کی مجمر پہ آنکھ رہتی ہے — جیسے ناسور ناک رہتی ہے
تھی جو گوگرد کی زمین کہیں — واں بھی گرمی کا نام خاک نہیں
ہے مزاج زمانہ جوں کافور — ہووے گرمی کسی میں کیا مذکور
تھی جنھوں کے مزاج میں سردی — اور بھی آگئی ہے نامردی
دست و پا اپنے یخ جو پاتے ہیں — آگ پر کچھ گرے ہی جاتے ہیں
تب کی نے حرف و نے حکایت ہے — ہے تو سردی ہی کی شکایت ہے
عزت دیں نہیں رہی زنہار — صاف آتش پرست ہیں دیندار[۱]
سر ہلاتے ہیں صاحب تمکیں — کونسی جا کہ رعشہ عام نہیں
تھا سمندر جو آگ کا کیڑا — آگ ہی میں وہ ہوگیا ٹھنڈا
پاؤں چلنے سے اُن کے ہیں بیکار — بہ تصور پھریں ہیں چوکیدار
چور چوری سے جی چراتے ہیں — شحنے گھر بھاگ جاتے ہیں
ہے دوشالوں کی یہ خریداری — نہیں آتی غریب کی باری
پشم پوشی پہ بسکہ مرتے ہیں — بعضے کمبل خرید کرتے ہیں

۱؎ یہ خیال بھی سودا سے نہیں چھوٹا ہے وہ کہتے ہیں۔ سودا سے

دیں ہے برباد ٹھنڈ سے یکدست — جو کوئی ہے وہ آفتاب پرست
کفر کی مے سے مست ہے جو ہے — غرض آتش پرست ہے جو ہے

پشم پوشی سے اپنی کرکے زیب　　سگ پشمی بنا پھرے ہے رقیب،
دی ہے سرمانے کیا مجھی کو شکست　　تا بحر باہے آفتاب پرست
جن کے تن پر نہیں ہے اک لتا　　کیا کہوں ہائے حال میں ان کا
آتش افروزی سے ہے سب سروکار　　قرص خورشید پر ہے دن کا مدار
تھے جو بعضے خورندے پانی کے　　اب وہ پانی ذرا نہیں پیتے
آگ کے بسکہ کھل گئے ہیں پچھے　　ہنستے ہیں اس کو دیکھ دیکھ توے
حال کیا ہووے گا غریبوں کا　　ہے روئی پر تو زور ہی لرزا
آپ کو بسکہ سرد پاتی ہے　　خود وہ پردوں میں منھ چھپاتی ہے
طرفہ سردی ہے ان دنوں یارب　　جس کے ڈر سے گلیم پوش ہیں سب
سنگ و آہن جواب بہم ہوں دوچار　　برف ان سے جھڑے بجائے شرار
ہاتھ میں لیجئے گر انگارا　　ہووے محسوس جیسے یخ پارا
دیکھیو شدت شب سرما　　بن بجھائے چراغ ہے ٹھنڈا
جس طرف دیکھوں آگ کی ہے پکار　　آگ کیا اک خدا کا ہے دیدار
مفلسوں کے بغل میں رہتے ہیں ہات　　ہیں نمدپوش آئینے دنرات[۱]
سرد دیکھی دکاں کبابی کی　　اب کے جاڑے نے کیا خرابی کی
ہے نمکداں میں برف جائے نمک　　خاک کھاویں گے بادہ نوش گزک
مہر سے پھر گئے بتان جہاں　　ڈھونڈئے کوئی گرم تو ہے کہاں
کر گئی ہے سفر حرارت تن　　دہاں برودت کا اب ہوا ہے وطن
گرمی ہوتی نہیں ذرا اظہار　　جیسے پانی ہے نبض کی رفتار
مصحفی اس ہوا میں کیا امکاں　　ہووے گرم سخن کسی کی زباں

تابستان مصحفی

کیا کہوں شورش ہوائے تموز　　ان دنوں ہے ہوائے طاقت سوز

[۱] سودا نے بھی نمدے سے کام لیا ہے مگر بہت عمدہ طریقے سے مصحفی کے یہاں مشاہدات کی ایک چیز تھی کہ آئینہ نمد میں روپوش رہتا ہے تو سودا نے دوسری چیز تلاش کی اور خوب تلاش کی۔ لکھتا ہے:-　جاڑا لگنے کا یخ تلک ہے حرف　　لپٹی رہتی ہے نمدوں ہی میں برف

سردی عالم سے کرگئی ہے کنار
موسم گل ہے اور شروع بہار

حوت میں آفتاب آیا ہے
مرغ و ماہی کے تئیں جلایا ہے

مارے گرمی کے سائے جلتے ہیں
اس ہوا میں درخت پھلتے ہیں

پھول سارے گئے ہیں یوں مرجھائے
بھوکے پیاسے کا جیسے منھ پھٹ جائے

ان دنوں باغ توپ خانہ ہے
سرب و باروت کا خزانا ہے،

آتش گل ذبسکہ ہے سرکش
اُسپہ لالہ ہوا ہے میر آتش

ہیں صنوبر کے تار شمع کے تار
سرو آتش فشاں ہے مثل چنار

وہ جو دست چنار بالا ہے
سو وہ آتش کا پنج شاخا ہے

دانۂ نار سب ہیں چنگاری
آگ کے پھولوں کی ہے گلکاری

گل کے جو تمتما رہے ہیں گال
دال ہے تب پہ اس کا چہرا لال،

شاخ نرگس نے قد کیا ہے علم
بن دئے آگ چھوٹے ہے یہ قلم

کیا عجب شعلہ بن گئے ہیں قبول
ہووے گلدستہ ہاتھ میں تو پھول

ٹہنیاں ہیں جو خشک اور کڑیاں
آگ دیجے تو چھوٹیں جوں لڑیاں

بسکہ طبع ہوا ہے آتش بیز
شاخ گل تک چمن میں ہے گلریز

جا پڑیں ہیں اِدھر اُدھر تک یار
پتی پھولوں کی اُڑکے مثل شرار

کوئی طاؤس ہے جو یہاں دلکش
ہے وہ طاؤس بازی آتش [1]

شیخ کی شکل سرو دلجو ہے
اُسپہ قمری کباب کو کو ہے

---

[1] آتشبازی کا تلازمہ مصحفی کے یہاں باغ کے ساتھ ملا دیا گیا ہے جیسا کہ بعض شعروں سے معلوم ہوتا ہے مگر سودا کے یہاں بدرجۂ اعلا یہی چیز موجود ہے۔ انھوں نے صرف آتشبازی کو مدنظر رکھ کر کاغذ پر شبرات کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ مصحفی اس بیان کو مکمل نہ کر سکے مگر سودا نے جتنے شعر کہے ہیں وہ تکمیل کے درجہ پر پہونچ گئے ہیں سنئے :-

کیوں ہوا اس قدر ہے عالم سوز
آتشی رنگ پر ہوا نوروز

اب کے رت سے یہ ہووے ہے معلوم
چمن آرا ہو شب برات کی دھوم

گرم ہے یہ بہار کا موسم
شاخ گل پھلجڑی سے ہنیں ہے کم

یہ پٹاخا ہے چٹکتے وقت گلاب
کف نرگس پہ چھٹتی ہے مہتاب

دستۂ گل کا کیا کہوں میں رنگ
اس میں ہت پھول کے سے ہیں گے ڈھنگ

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۱۱ پر ملاحظہ فرمائیے)

کوئی تنکا جو اڑ کے گل پہ پڑا
جل اُٹھا وہ دیا سلائی سا

شعلہ جاروبِ صحن گلشن ہے
جس سے خالی چمن کا آنگن ہے

جیسے گلخن کی ہووے گرم رماد
سایہ جلنے میں دھوپ سے ہے زیاد

بھول کر سایہ میں جو جا بیٹھے
کود کر دھوپ میں پھر آ بیٹھے

پاؤں سایہ پہ جو رکھے ناگاہ
کاٹ کھاوے وہ مثل مار سیاہ

ہیں سلیں پتھروں کی گرم تمام
جن پہ پائے نگہ کرے نہ قیام

پھول کھاوے جو مرغ آتشخوار
شکل گلگیر اُس کی ہو منقار

آگ پانو سے جو بجھاتے ہیں
دیکھ پھولوں کو جی چراتے ہیں

جعفری نے دیا ہے جلوہ روز
گل سوری بنا ہے شب افروز

شب کو ماہ فلک میں ہے وہ تاب
جیسے روشن کرے کوئی مہتاب

لگتے ہیں آسماں پہ یوں تارے
دگدگاتے ہوں جیسے انگارے

نسرِ طایر ہو کیوں نہ جلکے کباب
بان سا چھوٹتا ہے تیر شہاب

شفق شام کی جو ہے تحریر
برق ہے آسماں کی دامنگیر

وے جو صحرا میں ہیں وحوش وطیور
گرمی نے اُس سے بھی کیا ہے قصور

گینڈے ڈھالوں سے تن کو ڈھانپتے ہیں
شیر گرمی کے مارے ہانپتے ہیں

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۱۰)

غنچے کھلتے ہیں یوں ہو آتشبار
گویا پھٹتا ہے داغنے میں انار

جلوے دیں ہیں چنبیلی کے بوٹے
اس طرح جائی جوئی کب چھوٹے

نہیں گیندوں کے یہ چمن میں درخت
دی ہے آتش ستاروں کو یک لخت

کر دصد برگ جعفری پہ نظر
چھٹ رہی ہیں ہوائیاں منہ پر

یہی بولے ہے پانی بھر بھر کر
ہے چکاپو کا حوض گھن چکر

کیا میں فواروں کا کہوں عالم
جوں بچھیا چھٹے ہے لے لے دم

آوے ہے جس گھڑی طبیعت گل
گرم جوشی کو ٹک سوئے بلبل

اُن کی صحبت میں باغباں چھچھوندر
چھوڑ دیتا ہے ایک چھچھوندر

شور پانی کرے ہے رہ رہ کے
اس طرح چھوٹتے ہیں جوں پچھکے

مرغ آئے ہیں گھونسلوں سے نکل — کہ بسیرے میں آگیا ہے خلل،

باغ بے آب و خشک ہیں تالاب — دیکھتے نہیں زمیں پہ سبزہ بخواب

سب کنوؤں پر چرس پڑے ہیں چھوٹ — کہ کنوؤں کے گئے ہیں پانی ٹوٹ

قد آدم جنھوں میں تھا پانی — اُن سے مشکل ہے بوند بھی پانی

ہے توے پر کنوؤں کے یہ تف و تاب — ہو گیا ہے توے کی بوند سب آب

پوچھ مت کچھ مسافروں کا حال — اُن پہ لایا ہے آفتاب زوال

وے لوئیں گرم گرم آتی ہیں — چھاتیاں جس سے بھلسی جاتی ہیں

کوئی جاتا ہے گر کسی کے گھر — مثل مستسقی آب پر ہے نظر

نہیں گرتا ہے اس سے اک قطرہ — آسماں بن گیا ہے لوہے کا،

ہم کو کب فکر تشنگی کی ہے، — موت ہے سو ٹیڑی ہی کی ہے

سادہ سبزے سے دشت و صحرا ہے — سبز ہے سو وہ اک جوانسا ہے

آکے خشکی نے جو کیا ہے اثر — پپڑیاں پڑ گئی ہیں ہونٹوں پر

بعضے پیاسوں کے کنٹھ خشک ہوئے — بیچ صحرا کے تشنہ لب وہ موئے

بعضے گرمی کے مارے تو نس گئے — بعضے بے آسرے ہو بیٹھ رہے

بعضوں کو بے کلی سے لگ گئی ڈاک — بعضے ہونے لگے چٹک سے ہلاک

خلق بے آبی سے پر از غم ہے — جیٹھ گویا مہ محرم ہے

ہیں جو اندارے چاہ یاں ان کے — مارے گرمی کے کھل گئے ہیں پیچے،

کون کرتا ہے چہ بچوں کا حساب — حوض و تالاب ہیں سبھی بے آب

مصحفی کیا کروں میں آگے رقم
خشکی دوڑے ہے تا زبانِ قلم[1]

---

[1] مصحفی کی پوری مثنوی آپ دیکھ چکے، روانی و سادگی کے لحاظ سے بڑا کارنامہ ہے اور خاصکر اُن لوگوں کے لئے دیکھنے کی چیز ہے جو کہتے ہیں کہ اُردو میں قدما نے نیچرل نظمیں نہیں کہیں۔ اب ناانصافی ہوگی اگر ہم سودا کے بھی متفرق اشعار نقل نہ کردیں کیونکہ مختلف تشبیہات میں اُنھوں نے بڑی صنعت گری سے کام لیا ہے

سنگ پر یوں ہے اب کے آب کی دھار — چھاتی پر جوں گرے ہے نزلۂ حار

مرغ آبی چمن میں اب جو ہے، — مُنھ کھلا ہی رکھے ہے جوں بطمے

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۱۳ پر ملاحظہ ہو)

بیان آتش زدگی

مصحفی نے اس بیان کو نہایت صاف اور واقعات روزمرہ پر مبنی کیا ہے اور خوب مثنوی لکھی ہے، چونکہ اس بارہ میں کوئی اور مثنوی مجھے نہیں مل سکی اس لئے تقابل کی کمی رہے گی۔

سوز آتش ہے کس قدر اس سال — جس سے ہے دل پہ مرد و زن کے ملال
بانس سے بانس جو کھڑکتا ہے — آگ کا شعلہ اک بھڑکتا ہے
گھر غریبوں کے جلتے آتے ہیں — گھر سے سب لوگ بھاگے جاتے ہیں
یوں پتنگے اڑیں ہیں یکباری — تو کہے ہے ہوا میں پھلواری
جب کہ چھپر کسی کا جلتا ہے — کف افسوس شعلہ ملتا ہے
کوئی کاندھے پہ رکھ کے مشکیزا — آب پاشی کو جائے ہے دوڑا
کوئی اُس پر گھڑا لنڈھاتا ہے — کوئی ہاتھوں ہی سے بجھاتا ہے

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۱۲)

گرگزک پر ہو میخوروں کا من — ہو رہے ہیں کباب مرغ چمن
طایروں تک ہے یہ ہوا کا اثر — پر قمری ہے مشت خاکستر
سرو کا حال کیا کروں میں بیاں — پاؤں اس کا ہے اور آب رواں
لالہ کے ہر چراغ پر اس آن — لٹ دھوئیں کی ہے شاخ نافرمان
ہے حرارت گلوں کو اب یاں تک — نہیں شبنم یہ نکلی ہے چیچک
یہ نہ لالے کی پاتی جھڑتی ہے — آگ جامے سے نکلی پڑتی ہے
بوند کو دل صدف کا ترسے ہے — آب نیساں سے آگ برسے ہے
شفق آفتاب شام و سحر — آگ دے ہے جہان کو یکسر
مہ کے پرتو کی کیا کروں تقریر — جوش کھا جوں اُبل چلے ہے شیر
پھوڑ کر حلق کو زبان کے خار — نکلے گدی سے طرح گل کی پار
بسکہ گرمی کی آن آنی ہے — شرم سے آگ پانی پانی ہے
آگ سے دن کی جل گئی ہے رات — جلے ہے اب سیاہی لے کے دوات

سودا کے یہاں آتشبازی کا تلازمہ چھوڑنے کے بعد بھی نہایت عمدہ اور نازک تشبیہات ہیں مگر مصحفی کے بیان میں سادگی و صفائی زیادہ ہے۔

گھر غریبوں کے جو رہے ہیں پھوس — دن دئے آگ نے لئے ہیں موس
ہائے کیا حال میں کہوں اُن کا — خانہ پاشی شعار ہے جن کا
دم خفا ہو کے پردہ پوش ہوئیں — چکیاں جل کے سنگ سرمہ ہوئیں
تھی جو گھر میں کسی کے کوئی تلوار — سو وہ بجلی کی ہو گئی اکبار
جس جگہ ہے برایچہ کی دکاں — آگ ناگاہ جا لگی ہے وہاں
ہیں جو بیوپاری کرتے پھرتے ہیں آہ — منڈیاں ہو گئی ہیں خاک سیاہ
آگئے آیا ہے اُن کے گردہ خویش — گھاس بھس والے ہیں سبھی دل ریش
تابہ ہیزم فروش و پنبہ فروش — سر کو زانو پہ رکھ کے ہیں خاموش
اب اگر اُس پہ جا کے کیجے نگاہ — کوئلے والے کی دکان ہے سیاہ
ہے غرض جس فریق کا انساں — اُس کی بیداد سے ہے شکوہ کناں
سبھی تیلی تنبولی اور بزاز — کاسہ گر مے فروش آتش باز،
اُس کے ہاتھوں جلے ہوئے ہیں سبھی — نہیں بیداغ اک غریب کا جی
ہائے اُن کو بھی سوختہ مغموم — دھوبیوں سے سُنی ہے اسکی دھوم
سہما جاتا ہے ہول سے دریا — ماہی تر ہے آب میں قلیا
آگ نے بسکہ سر اُٹھایا ہے — ایک عالم کا جی جلایا ہے
ایک کے گھر سے جوں ہی شعلہ اُٹھا — جا کے گھر دوسرے کے پھول پڑا
گر لیا اُس کے تئیں بجھا تو خیر — نہیں تو اور ہی ہوئی اک سیر
ایک کے گھر جو لگتی ہے آتش — اور اُٹھتا ہے شعلۂ سرکش
دوسرا چڑھ کے اپنے چھپر پہ — اُس کو پانی چھڑک کرے ہے تر
جس طرف دیکھو آگ کی ہے پکار — گھر کے گھر ہو گئے ہیں یہاں فی النار
لگی کیا آگ فتنہ اک جاگا — شُہدا گھر میں سے کھڑکی لے بھاگا
لوگ آکر کے جو پڑے سب ٹوٹ — مچ گئی گھر میں اک مزے کی لوٹ
کوئی کہتی ہے ہائے رے میں موئی — کوئی پھرتی ہے بلبلاتی ہوئی،
کوئی تکتی ہے مُنھ کو شوہر کے — کوئی ساتھ اُٹھ چلی برادر کے
کوئی ہمسائے میں چھپی جا کر — گر پڑی ٹھوکر اک کوئی کھا کر

سر سے برقع کسی نے پھینک دیا اُٹھ بھاگا کسی بنے ہاتھ لیا
رہ گئی کوئی در کے بیچ اَڑی کوئی اٹھی جو گرم گر ہی پڑی
سن کے جو ہیں یہ شور ہمسائے مل کے آتش بجھانے کو آئے
بعضے رستے کے جانے والے بھی دیکھ کر رک گئے یہ شعلہ وری
اس بہانے سے وہاں تلک آئے جس کو آتش نے جلوے دکھلائے
خس و آتش کی طرفہ سیر ہوئی نہ جلا جی کسی کا خیر ہوئی
روئے زیبا پہ مت نظر کر تو آتش حُسن سے حذر کر تو

ایک کہتا ہے جلوہ میرا دیکھ
مصحفی گھر جلا تماشا دیکھ

ہجو مودی خانہ

مودی خانہ گودام کو کہتے ہیں جس میں اقسام اجناس محفوظ رہتی ہیں امرا کے یہاں مودی خانہ میں تمام وہ سامان بھی رہتا تھا جس کی محل خانہ کے روزمرہ کے مصارف میں ضرورت پڑتی تھی اور وہی شخص جو مودی خانہ میں بہ حیثیت منیب کے کام کرتا تھا۔ وہی بخشی گری خزانچی متصدی اور تقسیم تنخواہ ملازمان کا کام بھی انجام دیتا تھا۔ یہ شخص بجائے خود مالک کی حیثیت رکھتا تھا۔ رشوت کی گرم بازاری اور ذاتی اغراض کی وجہ سے اس سے یا اس قسم کے دوسرے لوگوں سے عملے والے بڑے پریشاں رہتے تھے۔ تنخواہ چڑھی ہوئی ہے مالک کی فرد دستخطی موجود ہے ادا کرنے کا حکم ہو چکا ہے مگر بیچارہ ملازم ہاتھ میں کاغذ لئے مارا مارا پھرتا ہے اور دن میں سو سو پھیرے لگاتا ہے اور بغیر مٹھی گرم کئے کوئی نہیں سنتا، اگر بدقسمتی سے رشوت سے بھی کام نہ چلا پھر قیامت آجاتی تھی۔ غرض جو کچھ یہ لوگ چاہتے سے تھے کرتے تھے اور کوئی پوچھنے گچھنے والا نہ تھا۔ بیچارے میر تقی میر ایک دستخطی فرد لئے ہوئے نہ معلوم کہاں کہاں مارے پھرے کیسے کیسے دوستوں کو آزمایا مگر آخر میں وہی ناکامی کا مُنھ دیکھنا پڑا جس کے لئے ایک مخمس اُنکے کلیات میں موجود ہے، اسی طرح سودا نہایت دل شکستہ تھے انھوں نے بھی عاجز آکر ایک قصیدہ میں اس قسم کے کارکنوں کے حرکات کا ذکر کیا ہے۔

مصحفی لکھنؤ میں آئے تو مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں زمرۂ مصاجبین میں ملازم ہوئے اور کچھ درماہہ مقرر ہو گیا مگر درماہہ کی وصولیابی میں جو دشواریاں پڑتی تھیں وہ ایسی نہ تھیں کہ ان کو خاموش رہنے دیتیں چلا اُٹھے چنانچہ ایک مثنوی لکھ ڈالی۔ جس میں اس عالم رستخیز کا ذکر نہایت عمدگی سے کیا جو مودی خانے میں برپا رہتا ہے اور جہاں

سے کوئی ضرورتمند شاد و خرم واپس نہیں جاتا۔

یہ جو مودی خانہ ہے سرکار کا ۔۔۔ ہے نمونہ بیش و کم دربار کا
رات دن رہتے ہیں یاں اکثر کھڑے ۔۔۔ دائیں بائیں پیش و پس چھوٹے بڑے
روز کی لینے پہ کوئی بیٹھی ہے ۔۔۔ لکڑی والی پر کسی کی چھیٹی ہے
گراصیل و گاہ اَتّا آئی ہے ۔۔۔ گاہ خیرد گاہ ختا آئی ہے
پوچھتا ہے کوئی شکّر کا بھا ۔۔۔ گڑ کا طالب ہے کسی کا ذائقا
گرم ہفت وہشت کا بازار ہے ۔۔۔ بحث ہے رنجش ہے اور تکرار ہے
عرش پہ ہے لالہ لچھمن کا دماغ ۔۔۔ یہ سنے کس کی کہاں، اتنا فراغ
کوئی نقدی کوئی جنسی پائے ہے ۔۔۔ لیک نقدی والا پھر پچھتائے ہے
نت نئے یاں جانور کا دانہ ہے ۔۔۔ مودیخانہ کیا کبوتر خانہ ہے
بیش و کم گرمی ہے گر نصف النہار ۔۔۔ شام کو دانے کی پڑتی ہے پکار
ہے جو ہرلال اُن سبھوں کا سرگروہ ۔۔۔ اُس کے حیلوں سے ہے اک عالم ستوہ
کیا کہوں اُس کا دروغ بیفروغ ۔۔۔ یہاں نہیں چلتا نجف خاں کا دروغ
جمع خود کرتے ہیں ل اور کیا ہی خرچ ۔۔۔ ہے تو یہاں امروز و فردا کا ہی خرچ
کوئی مٹھی مانگے ہے اپنی کھڑا ۔۔۔ اور کوئی از بہر چٹکی ہے اڑا

لہ جیسے لالہ لچھمن اور ہرلال سے میاں مصحفی عاجز ہیں۔ اسی طرح غریب میر۔ ہلاس رائے سے پریشان ہیں۔ بلکہ مصحفی سے کچھ زیادہ اُنکا اضطراب معلوم ہوتا ہے سُنئے کہتے ہیں:-

سنو یارو ہلاس رائے کا حال ۔۔۔ ایک لُچّا ہے وہ عجائب مال
کام لینا ہے اس سے امر محال ۔۔۔ سو بھی جا اڑیں تو دیوے نکال
پیر کو اپنے دے نہ .... کا بال
لے جو کچھ اُس سے ایسا ویسا ہو ۔۔۔ ورنہ کیا دخل کوئی کیسا ہو
کہتا ہے دوں جو پاس پیسا ہو ۔۔۔ ہوتے جو دے نہ۔ ایسا تیسا ہو
خلق ناحق ہے میرے جی کا وبال
ایک عمدہ کے ہاں ہے اہل کار ۔۔۔ فوج کے لوگوں کا سب اُسپہ مدار
سو یہ بڑھ چڑھ ایسا خوش اقرار ۔۔۔ کہے ہر اک کو دینے سو سو بار
پھر نہ دے جز فریب تا دہ سال

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۱۷ پر ملاحظہ ہو)

اصطبل سے دوڑے سائیس آئے ہیں   ورنہ سوالحاح سے بلوائے ہیں
ہاتھی والے ایک سے تا فوجدار   کر رہے ہیں اپنے راتب کی پکار

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۱۶)

یا مہینوں تلک رہے روپوش   یا ملے ہے تو بے حواس و ہوش
لوگ کرتے پھرو نہ جوش و خروش   یہ کچہری میں بیٹھا ہے خاموش

زرد رو بے حیا ہے گویا لال

قصہ کوتاہ بعد چندیں ماہ   میری اس بھڑوے پر ہوئی تنخواہ
جانے آدم لگا گدو بیگاہ   یہ تو مغرور بے تہ و گمراہ

مفتری کاذب و سفیہ و ضلال

جو گیا آدمی سوداغ آیا   ٹک نہ یہ ----- شرمایا
جب تقاضے سے اس کو گھبرایا   پھیر منھ لب پہ یہ سخن لایا

تم تو کاٹو ہو پہلے چوسے گال

یوں تو سو بار آؤ جاؤ گے   پیسے تدریج ہی سے پاؤ گے
اور اس پر بھی جو ستاؤ گے   اپنے پیسوں سے ہاتھ اُٹھاؤ گے

بوجھ میں اپنے سر سے دونکا ٹال

اس کے بعد سودا کے بھی چند شعر سننے کے قابل ہیں:۔

پروانہ لکھا کر گئے عامل کنے جسوقت   کہتا ہے وہ پیسہ ابھی مجھ پاس کہاں ہے
اودھر سے پھر آئے تو کہا جنس ہی لیجا   دیوان بیوتات یہ کہتے ہیں گراں ہے
آخر کو جو دیکھو تو وہ پیسے ہیں نہ وہ جنس   ہر اک متصدی سے میاں اور تیاں ہے
دیوان کے بخشی کے بیوتات کے حاضر   مانند کنھیا کے جہاں دیکھو تہاں ہے
ہر بات پلٹتا ہی رہے صبح سے تا شام   پیپل کے پتوے کی طرح منھ میں زباں ہے
جتادے غرض پیسے اُڑا کر ہوا روپوش   گھر جا کے پکارے جو کوئی لالہ کہاں ہے
جسوقت سنا یہ وہیں آواز بدل کر   آپ ہی کہا گھر میں سے کشن چند کے ہاں ہے
پھر ہو جو موکل سے کہیں راہ میں بھیٹا   اسناد کا جاگیر کے یہ اسکی بیاں ہے
عرضی پہ ہوا میم سیاہ ہے پہ ہوا جیم   پروانہ میں تم پر ہوں تصدق مری جاں ہے
کاہے کی غرض عرضی وہ اور کس کا سیاہا   کیدھر کا وہ پروانہ وہ جاگیر کہاں ہے

اک طرف اک طور پر کوئی خواص — ہے جتاتا اس کو اپنا اختصاص
اک طرف کہتا ہے میدانی زدور — آج تو میری صفائی ہے ضرور
بدزبانی ہے کہیں دربان سے — آب کش ہے ہاتھ دھوئے جان سے
مرغ بازوں میں ہیں جتنے دست کش — کر رہے ہیں وہ جلدی ہی کشمکش[1]
کوئی سینک، اور کوئی دانا مانگے ہے — ہلدی اور کوئی کھانا مانگے ہے
سر جھکائے مودی ہے محو حساب — کون دیوے ان بچاروں کو جواب
اک طرف کوئی اس سے سرگوشی میں ہے — بسکہ وہ از خود فراموشی میں ہے
کیوں نہ ہووے اہل دانش کو عذاب — کیونکہ یہاں ہر روز ہے اور حساب
دیکھ اوساں اُس کے گھبرائے ہوئے — بعض اُٹھ آتے ہیں شرمائے ہوئے
شاہ جولاں اک طرف حیران ہیں — اوڑھے کمل بادل بریان ہیں
یہ روپے والوں کو پیسے دیتے ہیں — پیسے والے کوڑیاں لے لیتے ہیں
سود بٹے سے اُنھیں نت کام ہے — گر نہ ہووے سود سودا خام ہے
ہے غضب پھر تیسرے بتّے کی مار — شعر خوانی سے ہو کیا صحبت برآر
اور میاں جرات کبھی آئے اگر — تو اُنھیں کیا خاک آتا ہے نظر
ہاں مگر آواز میں اس سے کہا — لالہ صاحب یہ جھینا بھی چلا
تب کہا اُن نے اکٹھا لیجیو — آدمی کل اپنا بھجوا دیجیو
کل سے مقصود اس کا تھا روزِ جزا — الغرض جوں توں کے وہ دن تو ٹلا
وقت حاجت جب اُنھوں کی کی نہ عون — آدمی کو اُن کے پھر دیتا ہے کون

---

[1] میر صاحب نے اس قسم کی کشمکش کا عالم اپنی کئی نظموں میں دکھایا ہے مگر ہم اسی نظم سے جس کے چند بند اول میں نقل کئے ہیں دو ایک بند نقل کرکے دکھاتے ہیں جس سے اس ہڑبونگ کے عالمگیر ہونے کا نقشہ ذہن میں کھنچ جائے گا۔

جب سے ہے یہ محرر دفتر — تب سے ہنگامہ ہی رہا اکثر
ہووے پرچا جو دے کسو کو زر — سو یہ بٹی پڑھا نہیں ہے لچر
سب سے اُس کو ہے ایک جنگ و جدال

لات لگی ہے گہ رہیلوں سے — دھول جھکڑ ہے گاہ چیلوں سے
کم نہیں ہے کچہری میلوں سے — آتے جاتے ہیں لوگ ریلوں سے
نکلی ہے تیغ کھڑکی ہی واں ڈھال

اور جو آ نکلے کبھی میاں مصحفی　　با کمالِ انقباض و بستگی،
دیکھتے ہی اُن کی صورت یوں کہا　　صبر کیجئے اور بھی دو دن ذرا
ان دنوں پیسے کا ہے توڑا بہت　　رام ہی رکھے تو کچھ رہتی ہے پت[۱]
لالہ لچھمن سن کے یوں کہنے لگے　　ان کے پیسے جوں بنے کر دیجئے
کیوں کہ مردِ آدمی کم گو ہیں یہ　　اور شاعر بھی مُسلّم گو ہیں یہ
صاحب عالم بھی ان سے شاد ہے　　ان کو کھٹمل نامہ بھی اک یاد ہے
الغرض اس طرح کی دار و مدار　　قسمیں جھوٹی سیکڑوں قول و قرار
مصحفی ان صاحبوں کو یاد ہیں　　جن کے ہاتھوں کتنے گھر آباد ہیں
ہے جو مودی خانہ سرکار ـــــ　　جس میں بھوسے پر نہیں زنہار ریت
لالہ و دتو کہ لچھمن رام ہیں　　سچ جو پوچھو اُن کے یہ اقسام ہیں
دیر وہاں کی تو سمجھ لے یہاں کی دیر　　شکر حق کر گر ملے کھانے کو سیر
یہ بچارے محض بے تقصیر ہیں　　ان سے گو شاکی جوان و پیر ہیں
جو چڑھا ہے اپنا وہ لیویں ہی گے　　ان کا دینا کام ہے دیویں ہی گے
برج میزاں میں رہے گا ان کا گھر　　چرخ رکھے گا سعادت پر نظر
پر بہ آں شرطے کہ سنکر یہ کلام　　مصحفی کو دیں کے بھر یہ دام دام
ورنہ حال ان کا تبہ ہو جائے گا　　شہ کوئی مودی نیا ہو جائے گا،
ہم ہیں اپنے شاہ کے مدحت سرا　　مانگیں پھر کیوں مودی خانے کی دُعا

عبد الباری آسی

---

[۱] مودیوں کی ناداری کی غداری کا بیان میر صاحب نے ذرا تفصیل کے ساتھ دیا ہے وہ بھی سنتے چلئے۔ مودی کہتا ہے:-

یاں کھڑا دو دن رہے ہے دو اب　　مطبخ خاص کو لے ہے جواب
منھ تکا دیر کرتے ہیں نواب　　کس کا اللہ میاں کہاں کا ثواب
بے زری سے ہے زیست رنج و نکال
کام جوں توں کے میں چلاتا ہوں　　سو بھی تتو تتو دکاں پہ جاتا ہوں
قرض کچھ مل گیا تو لاتا ہوں　　جیسا میں نے کیا ہے پاتا ہوں
متصدی گری ہے یا جنجال
باز آتا نہیں ہے نفس شوم　　ورنہ کس سے اُٹھے ہے ایسی دھوم
ہر سحر روز والوں کا ہے ہجوم　　ہے تمھیں حال یہاں کیا معلوم
تم تو سونٹا لئے کرو ہو !!

مصحفی اور انکی شاعری

اُردو شاعری کی تاریخ میں مصحفی کی ذات کئی اعتبار سے اہم اور قابل لحاظ ہے اور وہ ایک ایسی حیثیت کے مالک ہیں جس کے اندر ہم کو ایک عجیب تناقص اور ایک غیر معمولی تضاد نظر آتا ہے ان کی شاعری ہمارے اندر ایک تصادم کا احساس پیدا کرتی ہے یہ تصادم مزاج اور ماحول کا تصادم ہے۔ مصحفی تاریخ کی دو بالکل مختلف فصلوں کی درمیانی کڑی ہیں، وہ اُردو شاعری کے دو مختلف مدرسوں کے درمیان ایک رابطہ کی حیثیت رکھتے ہیں ایک طرف تو وہ اس دور کی آخری یادگار ہیں جو میر۔ سودا اور درد جیسے کاملین سے ممتاز ہے اور جس کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت خالص تغزل یعنی داخلیت (Subjectivism) ہے دوسری طرف ان سے اس دور کی ابتدا ہوتی ہے جس کو اُردو شاعری کا لکھنوی دور کہتے ہیں۔ یہ دور خارجیت کا دور ہے اور تکلف اور ظاہری سجاوٹ کے لئے مشہور ہے۔ اس دور کی سچی نمایندگی کرنے والے انشاء، جرأت اور رنگین ہیں یہ وہ زمانہ ہے جبکہ دلی اُجڑ چکی ہے اور سلطنت و امارت کی طرح شعر و شاعری بھی اپنا ڈیرہ خیمہ لیکر لکھنؤ میں آبسی ہے۔ مصحفی بھی اسی "اُجڑے دیار" کے رہنے والے" تھے جو "پورب کے ساکنوں" میں آپڑے تھے۔ دلی کی وضع اور اس کی سچائی اور معصومیت ان کا خمیر ہو چکی تھی ان کے خون میں وہی معصومانہ تغزل وہی خلوص شعری حرکت کر رہا تھا جو میر اور درد کا ترکہ تھا لیکن کرتے کیا زمانہ کی ہوا بدل چکی تھی نیا دیس تھا اور نیا بھیس زمانہ اور ماحول دونوں خلاف مزاج زمانے کے ساتھ مصالحت کئے بغیر چارہ نہیں تھا۔ انشاء کی چہلوں اور جرأت کی طراریوں کے سامنے قدم جمائے رہنا تھا اور اس میں شک نہیں کہ اس آزمائش اور کشاکش کو جس سلیقہ کے ساتھ مصحفی نے نباہا وہ ہر شخص کا کام نہیں تھا۔ لیکن انکو پورا احساس تھا کہ وہ غلط زمانے میں پیدا ہوئے جبکہ اصلی شاعری کی کہیں قدر نہیں رہی اور جبکہ شاعری بھی لکڑی اور دنگل کی طرح اکھاڑے کی چیز ہو کر رہ گئی تھی۔ ایک غزل میں جو غالباً طرحی تھی اسی کا رونا روتے ہیں :-

کیا چکے اب فقط مرے نالے کی شاعری　　اس عہد میں ہے تیغ کی بھالے کی شاعری
شاعر رسالہ دار نہ دیکھے نہ میں سُنے　　ایجاد ہے انھیں کی رسالے کی شاعری
ہوں مصحفی میں تاجر ملک سخن کہ ہے　　خسرو کی طرح یاں بھی اٹالے کی شاعری

غرض کہ مصحفی کی شاعری میں دہلوی اور لکھنوی دونوں دبستانوں کی خصوصیات باہم دست وگریباں نظر آتی ہیں اور وہ بیچارے کفر وایمان کی کشاکش میں بُری طرح مبتلا رہتے ہیں۔

اپنی شخصیت اور اپنی حیثیت کے لحاظ سے تاریخ شعر اُردو میں مصحفی بالکل اکیلے ہیں اور کیا اس سے پہلے اور اس کے بعد ان کا ساتھ دینے والا اور ان کی ہمنوائی کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ وہ بیک وقت ماضی کی یادگار اور حال کی کشاکش میں مبتلا اور مستقبل کے میلانات کا اشارہ ہیں۔ متقدمین کے گائے ہوئے راگ نہ صرف ان کے کانوں ہیں بلکہ ان کی ہستی کی ایک ایک تہ میں گونج رہے تھے۔ لیکن خود ان کے زمانے میں دوسرے راگوں کی مانگ تھی جن کے موجد جرأت اور انشا رتھے نتیجہ ایک لطیف اور پرکیف قسم کی انتخابیت یا ہم آہنگی تھی جو مصحفی کے دم سے شروع ہوئی اور انھیں پر ختم ہوگئی۔ غور سے مطالعہ کرنے والوں کو مصحفی کے کلام میں اگر ایک طرف اس قسم کا خالص تغزل ملتا ہے:-

ترے کوچے اس بہانے مجھے دن سے رات کرنا — کبھی اس سے بات کرنا کبھی اُس سے بات کرنا

یا- کبھو تک کے در کو کھڑے رہے کبھی آہ بھر کے چلے گئے — ترے کوچے میں اگر آئے بھی تو ٹھہر کے چلے گئے

یا- کنج قفس بھی ہم تو رہے مصحفی اسیر — فصل بہار باغ میں دھومیں مچا گئی

تو دوسری طرف ایسے اشعار کی بھی کثرت ہے جو صرف لکھنوی فضا میں پیدا ہو سکتے تھے اور جو لکھنوی دبستان شاعری کے لئے ہمیشہ سرمایہ ناز و افتخار رہے ہیں مثلاً:-

آیا لئے ہوئے جو وہ کل ہات میں چھڑی — آتے ہی جڑ دی پہلی ملاقات میں چھڑی

یا- آنکھوں میں اس کی میں نے جو تصویر کھینچ لی — سرمے نے اس کی چشم کی شمشیر کھینچ لی

یا- جنبش لب نے تری میری زباں کر دی بند — تو نے کچھ پڑھ کے عجب مجھ پہ یہ منتر مارا

ظاہر ہے کہ ان اشعار میں محض قافیہ اور ردیف اور رعایات و مناسبات سے مضمون پیدا کئے گئے ہیں اور ان میں جذبات و واردات یا خیالات و افکار کی سچائی سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ اس قسم کی شاعری کی بنیاد جس کو مجملاً خارجی شاعری کہتے ہیں لکھنؤ میں پڑی اور یہیں سے اس نے فروغ پایا۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس دبستان شاعری کے بانیوں میں مصحفی بھی تھے جو مجبور رہتے تھے کہ اپنے کو غالب جماعت میں شامل رکھیں۔

قبل اس کے کہ ہم مصحفی کے کلام سے تفصیلی بحث کریں اگر ان کی زندگی پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لی جائے تو بے موقع یا غیر متعلق بات نہ ہوگی۔

مصحفی کا اصل نام غلام ہمدانی تھا اور باپ کا نام شیخ ولی محمد وطن امروہہ ضلع مراد آباد تھا انکے آبا و اجداد ملازمان شاہی میں سے تھے عنفوان شباب میں ان کا دلی آنا ہوا اور لکھنؤ آنے سے پہلے برابر دلی ہی میں رہے طبیعت علم و ادب کی طرف بچپن سے مائل تھی اور شعر و سخن سے خداداد مناسبت تھی۔ دلی اُسوقت تک رباب

فضل وکمال سے خالی نہیں ہوئی تھی مصحفی نے بہت جلد مروجہ نصاب کے مطابق عربی فارسی میں خاطر خواہ دستگاہ حاصل کرلی۔ وہ خود اپنے تذکرے "ریاض الفصحا" میں لکھتے ہیں کہ تیئس سال کی عمر میں انھوں نے شاہجہاں آباد میں فارسی نظم ونثر کی تکمیل کرلی تھی اور پھر لکھنؤ پہونچکر مولوی مستقیم ساکن گوپامئو سے عربی علوم یعنی طبیعی الہی اور ریاضی وغیرہ میں مہارت حاصل کی قانونچہ مولوی مظہر علی صاحب سے پڑھا آخر عمر میں تفسیر اور حدیث کے مطالعہ کی طرف مائل ہوئے عربی میں ان کو اتنی قدرت حاصل تھی کہ قریب ایک جزو غزلیات اور سو دو سو نعتیہ قصیدے اس زبان میں بھی کہے جو طاق پر دھرے دھرے نمزدگی کے سبب سے کرم خوردہ ہوکر غارت ہوگئے غرضکہ مصحفی نہ صرف شاعر تھے بلکہ خاصے عالم وفاضل تھے فارسی میں دو دیوان لکھے تھے ایک تو دلی میں چوری گیا۔ یہ دیوان مرزا جلال اسیر اور ناصر علی کے رنگ میں تھا۔ اس شعر میں اسی دیوان کی طرف اشارہ ہے:۔

اے مصحفی شاعر نہیں پورب میں ہوا میں　　دلی میں بھی چوری مرا دیوان گیا تھا

دوسرا دیوان باقی رہا جو بعض کتب خانوں میں اب بھی موجود ہے۔

فارسی کلام کا نمونہ یہ ہے:۔

مدتے شد کہ میاں من وا وآشتی است　　کیست آنکس کہ کنوں مید ہد آزا مرا

مرکب انداز کہ میدان تگ وتازے ہست　　در رہت سینہ سپر عاشق جانبازے ہست

مائل سوختنم شعلۂ آوازے ہست　　در کمین دل من زمزمہ پردازے ہست

نیست نومیدنم از تو کہ دگر چشم ترا　　سوئے آئینہ نگاہے غلط اندازے ہست

درون خانہ تو اے نازنیں چہ میدانی　　کہ گفتہ شد سر بازار داستان کسے

یہ منتخب اشعار سے انتخاب تھا اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مصحفی کے فارسی کلام میں کوئی خاص بات نہیں ہے بلکہ زبان اور مضامین دونوں کے اعتبار سے ان کا یہ کلام ڈھیلا اور پھیسا معلوم دیتا ہے۔

جب دلی اُجڑی اور اہل علم وفن کی رہی سہی محفل بھی برہم ہوئی تو مصحفی نے بھی رخت سفر باندھا اور لکھنؤ کی راہ لی یہ آصف الدولہ کا زمانہ تھا دلی چھوڑ کر مصحفی سب سے پہلے ٹانڈہ (ضلع فیض آباد) پہونچے اور قیام الدین قائم کے توسط سے نواب محمد یار خاں کے دربار میں ملازم ہوئے کچھ دنوں اس طرح فکر معاش کی جانکاہیوں سے آزاد رہے اور یک گونہ سکون کے ساتھ بسر اوقات کی نواب محمد یار خاں کے زوال کے بعد لکھنؤ آئے اور پھر دلی چلے آئے اس نیت سے کہ اب استغنا اور قناعت کے ساتھ پاؤں سمیٹ کر یہیں رہیں گے لیکن سفاک زمانے نے ان کا یہ عہد پورا نہ ہونے دیا اور معاش کی کوئی صورت نہ نکل سکی آخر کار پھر لکھنؤ آئے اور اب کے مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں مامور ہوئے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ فراغت اور آزادی کے دن ان کو پھر کبھی

نصیب نہیں ہوئے۔ لطف "گلشن ہند" میں لکھتے ہیں "بالفعل کہ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں ایک چودہ برس سے اوقات لکھنؤ میں بسر کرتا ہے ذی تماش تو ایک مدت سے وہاں نصیب اہل کمال ہے اسی طور پر درہم برہم اس غریب کا بھی احوال ہے"۔

مصحفی کا ایک شعر ہے:۔

سُنئے ہے مصحفی اب تو بھی فی الحال — منڈا کر سر کو ہو جا فارغ البال

بیچارے کو آخر کار یہی کرنا پڑا جس شعور کی تربیت دتی میں ہوئی تھی اس کو لکھنؤ پہونچکر اپنا مزاج اور اپنا لب و لہجہ دونوں بدل دینا پڑا اور جمہور کو قایل کرنے کے لئے ایک ایسی طرز اختیار کرنا پڑی جس سے اگر مصحفی دتی میں رہ جاتے تو یقیناً اپنے کو علحدہ رکھتے لیکن فضا اور ماحول سے بغاوت کرنا نہ ہر شخص کے بس کی بات ہے اور نہ خطرات سے خالی۔ مصحفی مجبور تھے کہ اس قسم کے شعر کہکر عوام سے داد لیں اور انھیں کو معراج شعری سمجھیں

نہ کھینچے خامۂ مو ایسی تمثال — کہ وہ ہے عاشقوں کی ناک کا بال

یا۔ جو دیکھیں اُنگلیاں وہ گوری گوری — بنا خورشید پانی کی کٹوری

لیکن مصحفی کے کلام کا یہ حصہ بھی جو لکھنؤ کا ساختہ و پرداختہ ہے اگر غور سے پڑھا جائے اور اس پر گہری ناقدانہ نظر ڈالی جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ شاعر اصلاً و فطرتاً لکھنؤ کا شاعر نہیں ہے۔ اُن کی زبان اور انکے اسلوب میں یہاں بھی ایک اندرونی فضائی کیفیت ہوتی ہے جو ایک نرمی اور ایک گداز لئے ہوئے ہوتی ہے اور جو بہت واضح طور پر خوش نوایانِ دہلی کے گائے ہوئے راگ کا آخری ارتعاش معلوم ہوتی ہے۔

لکھنؤ پہونچکر مصحفی کی شاعری نے بات کی بات میں اتنی شہرت حاصل کر لی کہ ہر طرف سے شاگردوں کی آمد شروع ہوگئی۔ یہ تو امر مسلمہ ہے کہ جتنے شاگرد مصحفی کو نصیب ہوئے کسی دوسرے اُردو شاعر کو نہیں ہوئے خود مصحفی کو اس کا پندار ہے "ریاض الفصحاء" میں لکھتے ہیں:۔ "در زبان اُردوئے ریختہ قریب صد کس امیرزادہ و غریب زادہا بحلقہ شاگردی من آمدہ باشند و فصاحت و بلاغت از من آموختہ"۔

دواوین کے علاوہ مصحفی نے نثر میں کئی کتابیں لکھی ہیں جن میں تین تذکرے شاعروں کے ہیں جو مشہور ہیں اور چھپ گئے ہیں۔ ان میں سے دو یعنی "ریاض الفصحاء" اور "تذکرۂ ہندی" میں اُردو شاعروں کے ذکر ہیں۔ تیسرا یعنی "عقد ثریا" چند فارسی شعراء کا ایک مختصر سا تذکرہ ہے۔ مصحفی نے چونکہ عمر طویل پائی اس لئے اکثر متقدمین و متاخرین کے ہمعصر رہے ان تذکروں میں شاعروں کی بابت جو کچھ لکھا ہے وہ تاریخی اعتبار اور اہمیت رکھتا ہے اور پھر چونکہ مصحفی سخن سنج تھے اس لئے کلام پر رائے عموماً جنچی تلی دیتے ہیں اور کلام کا جو انتخاب دیتے ہیں وہ انکے مذاق سلیم پر دلالت کرتا ہے۔ "ریاض الفصحاء" سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک رسالہ عروض میں لکھا تھا جسکا نام "خلاصۃ العروض"

تھا اور ایک کتاب فارسی محاورات پر تھی جس کا نام "مفید الشعراء" بتاتے ہیں۔

مصحفی جیسا کہ بتایا جا چکا ہے اُردو شاعری کے دو مختلف زمانوں اور دو مختلف مدرسوں کو ملاتے ہیں ایک طرف تو انھوں نے میر اور سودا کا آخری زمانہ دیکھا تھا اور دوسری طرف انشا اور جرأت کے ساتھ مشاعرے اور مطارحے کر رہے تھے۔ ان کی غزلوں میں جہاں میر، سوز اور درد کی خصوصیات ملتی ہیں وہیں پہلو بہ پہلو انشاء اور جرأت کا رنگ بھی کافی نمایاں نظر آتا ہے بالخصوص جرأت کی ریس تو وہ سعی و کاوش کے ساتھ کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں لیکن انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ خود ان کو دہلی کے متغزلین کا ہم آہنگ ہونا مرغوب تھا اور یہ کہنا بعید از قیاس نہ ہوگا کہ جب تک دلی میں رہے اسی آہنگ میں شعر کہتے رہے۔ چنانچہ میر حسن نے اپنے "تذکرۂ شعرائے اُردو" میں مصحفی کے کلام کا جو انتخاب دیا ہے ان میں شاید ہی دوچار اشعار ایسے نکلیں جن پر لکھنوی رنگ کا دھوکا ہو اور میر حسن جسوقت اپنا تذکرہ لکھ رہے تھے مصحفی شاہ جہاں آباد دہی میں تھے اور تجارت کرتے تھے۔

مصحفی ایک زبردست قوت آخذہ کے مالک تھے اور جیسا کہ اس سے پہلے بھی میں ایک مرتبہ کہیں کہہ چکا ہوں ان کی سب سے بڑی انفرادی خصوصیت تقلید اور انتخابیت ہے۔ یعنی دوسروں کے اثرات کو اخذ اور قبول کرنے کا ان میں خاص ملکہ تھا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بقول آزاد کے "غزلوں میں سب رنگ کے شعر ہوتے تھے کسی طرز خاص کی خصوصیت نہیں" مصحفی انتخاب اور تقلید کی طرف فطرتاً مائل نظر آتے ہیں اس سے ان کو فایدہ بھی پہونچا اور نقصان بھی فایدہ تو یہ پہونچا کہ متقدمین کے رنگ کو اپنے کلام میں اس طرح جذب کر لیا کہ وہ گویا ان کا اپنا رنگ تھا۔ مگر اسی کے ساتھ اپنے وقت کی خصوصیات اور میلانات پر بھی نظر رکھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو شاعری کی دنیا میں ان کا مرتبہ انشاء اور جرأت اور دوسرے معاصرین سے بہت بلند رہا اور ان اساتذہ کے مقابلہ میں آجتک غزل گو شعراء مصحفی کی شاعری سے زیادہ اثر قبول کرتے اور فیض اُٹھاتے رہے۔ لیکن اسی تقلید سے مصحفی کو نقصان یہ ہوا کہ خواہ مخواہ زمانہ سازی کی غرض سے انشاء اور جرأت کی طرز میں اپنی قوت ضایع کرنے لگے جس سے ان کو کوئی طبعی مناسبت نہیں تھی مگر یہ ہونا تھا قوت آخذہ جب ضرورت سے زیادہ بڑھجاتی ہے تو اکثر ما صفا اور ما کدر میں امتیاز کرنے سے قاصر رہ جاتی ہے۔

مصحفی اگرچہ انشاء اور جرأت کے ہمعصر ہیں لیکن ان کے ان اشعار سے قطع نظر کرنے کے بعد بھی جن میں صاف میر اور سودا کے انداز پائے جاتے ہیں وہ بالعموم زبان اور محاورات میں اپنے زمانہ سے الگ رہتے ہیں اور ان متقدمین کے عہد سے قریب۔ آزاد نے ان کو میر سوز، سودا اور میر کا آخری ہم زبان بتایا ہے اور جس کسی نے بھی مصحفی کے کلام کا مطالعہ کیا ہے اس کو اس رائے سے اتفاق ہوگا۔ ان کی زبان میں وہی ملائمت اور گداختگی ہے جو میر کے عہد کی عام خصوصیت تھی اور ان کے لب و لہجہ اور اسلوب میں وہی نرمی اور مسکینی ہے جو پھر کبھی کسی دوسرے دور

کو نصیب نہیں ہوئی۔ مصحفی کے وہاں ایسے اشعار کی تعداد کافی ہے جن پر سوز، اور میر اور ان کے دوسرے معاصرین کا دھوکا ہو سکتا ہے۔ مثلاً:-

ہم سمجھے تھے جس کو مصحفی یار　　　وہ خانہ خراب کچھ نہ نکلا،
آ کے میری خاک پہ کل گردباد　　　دیر تلک خاک بسر کر گیا
جب واقف راہ و روش ناز ہوئے تم　　　عالم کے میاں خانہ برانداز ہوئے تم
مصحفی آج تو قیامت ہے،　　　دل کو یہ اضطراب کس دن تھا
تم رات وعدہ کر کے جو ہم سے چلے گئے　　　پھر تب سے خواب میں بھی نہ آئے بھلے گئے
او دامن اٹھا کے جانے والے　　　ٹک ہم کو بھی خاک سے اٹھالے

ان اشعار میں جو شکستگی اور سپردگی پائی جاتی ہے وہ کچھ میر، درد اور قائم وغیرہ ہی کی یاد تازہ کرتی ہے۔

ظاہر ہے کہ اس مزاج و طبیعت کا آدمی انشا و جرأت کا حریف نہیں ہو سکتا تھا یہ ان کی بدنصیبی تھی کہ انکو ایسے بھانڈوں سے پالا پڑا۔ جہاں تک شاعری اور اسکی فطرت کا سوال ہے مصحفی اور انشا میں کوئی مناسبت نظر نہیں آتی۔ آزاد نے آبحیات میں انشا کو جو مصحفی سے اسقدر بڑھا چڑھا دکھایا ہے وہ انکا محض تعصب ہے۔ مصحفی کے متعلق انکا یہ کہنا یقیناً صحیح ہے کہ ''ذرا اکڑ کر چلتے ہیں تو ان کی شوخی بڑھاپے کا ناز بے نمک معلوم دیتا ہے'' مصحفی کی فطرت میں اکڑنا نہیں ہے اس لئے ان کو اکڑنا زیب نہیں دیتا۔ لیکن اکڑنے کا نام شاعری نہیں ہے شوخی اور طراری کو دراصل شاعری اور بالخصوص غزلگوئی سے کوئی تعلق نہیں۔ انشا کی تیزی اور طباعی مسلم ان کی علمی قابلیت بھی مسلم مگر ان کے اندر وہ خصوصیات بہت کم تھیں جو تغزل کی جان ہوتی ہیں اور جو تھیں وہ ہمارے کسی کام کی نہیں اس لئے کہ خود شاعر نے ان کا صحیح استعمال نہیں کیا۔ آزاد نے انشا کے متعلق میاں بیتاب کی رائے نقل کی ہے کہ ''سید انشار کے فضل و کمال کو شاعری نے کھویا اور شاعری کو سعادت علی خاں کی مصاحبت نے ڈبویا'' اس میں اتنا تو ہم بھی مانتے ہیں کہ ان کے فضل و کمال کو ان کی شاعری نے کھویا لیکن جہانتک ان کی شاعری کا تعلق ہے ہم کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر سعادت علی خاں کی مصاحبت نہ ہوتی تو بھی وہ ڈوبی ہوئی ہی تھی۔ آخر مصحفی کی شاعری کو کسی نے کیوں نہیں ڈبویا۔ انشار اگر خود ایسے نہ ہوتے تو سعادت علی خاں کی مصاحبت ان کا کچھ نہ بگاڑ سکتی۔ بلکہ شاید اس مصاحبت کو ضرورت سے زیادہ دخل ہی نہ ہوتا۔

بہرحال جہاں تک غزل سرائی کا تعلق ہے انشا اور مصحفی کا کوئی مقابلہ نہیں۔ جرأت غزل سرا ضرور تھے، لیکن ان کی غزل سرائی تمامتر خارجی انداز کی تھی۔ انھوں نے غزل میں ایک بالکل دوسری دھن اختیار کی یعنی معاملہ بندی اور ادابندی۔ اُردو میں انداز و ادا اور معاملہ کی شاعری (Poetry of behaviour)

جرأت سے شروع ہوتی ہے۔ لکھنوی دبستان شاعری کے بانی دراصل جرأت تھے۔ لکھنؤ کے شاعروں کا طرۂ امتیاز خارجیت ہے جو اس تکلف اور تصنع کی ذمہ دار ہے جس کو ہم لکھنؤ کے ساتھ مخصوص کرتے ہیں۔

مصحفی کو فطرتاً ان راگوں سے رغبت تھی جو متقدمین گا گئے تھے۔ اس دعوے کے ثبوت میں ان کی عشقیہ مثنوی "بحر المحبت" بھی پیش کی جا سکتی ہے جو انھوں نے میر کی مثنوی "دریائے عشق" کو سامنے رکھکر لکھی ہے اور جس میں اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ میر کی ہو بہو نقل اتار کر رکھدیں۔ مصحفی کی مثنوی کو میر حسن کی مثنوی سے کوئی مشابہت نہیں ہے حالانکہ میر حسن بھی مصحفی کے معاصرین میں سے تھے

پہلے ہم مصحفی کے اس کلام کی طرف متوجہ ہونا چاہتے ہیں جس پر متقدمین بالخصوص میر کا نرم اور پرگداز تغزل چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ میر وغیرہ کا جہاں مصحفی نے تتبع کیا ہے وہاں اپنے رنگ کو ان لوگوں کے رنگ سے کافی ملا دیا ہے اور خود انھیں لوگوں میں رل مل گئے ہیں۔ مصحفی کی شاعری کا مطالعہ کرکے ماننا پڑتا ہے کہ شاعر کا کام قدیم رسوم و روایات کو اپنے اندر جذب کرکے محفوظ رکھنا ہے اگر وہ اس قابل ہیں۔ شاعر کا یہ فرض ہے کہ ادب اور زندگی کے روایات میں سے ان عناصر کو لے لیں جو زمانی اور مکانی خصوصیات سے محدود نہ ہوں۔ شاعر اور نقاد دونوں کی نظر ادب کے ان اجزا پر ہونا چاہئے جن میں بقا اور ارتقاء کی صلاحیت ہو۔ مصحفی نے یہی کیا ہے۔ انھوں نے پرانے اسالیب و صور کو اختیار کرکے نہ صرف زندہ رکھا ہے بلکہ ان کو از سر نو تربیت دیکر ان کے اندر نئے امکانات پیدا کئے ہیں۔ ان کی زبان اگرچہ میر، درد اور سودا کے مقابلہ میں زیادہ منجی اور کسی ہوئی ہے لیکن انہیں دردمندی دل برشتگی اور سوز و گداز کافی حد تک وہی ہے جس کو ان بزرگوں سے منسوب کیا جاتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اندر وہی خلوص اور محویت وہی عاشقانہ انفعال اور خودگزاشتگی ہے جو غزل کی جان ہے اور جو میر و درد کا مخصوص انداز ہے۔ دو شعر ملاحظہ ہوں:-

یاد ایام بے قراریٔ دل		وہ بھی یارب عجب زمانہ تھا
اب کہاں ہم کہاں وہ کنج قفس		کوئی دن واں بھی آب و دانہ تھا

یہ غزل میر اثر کی اس مشہور غزل پر کہی گئی ہے جس کے تین شعر یہ ہیں:-

کبھو کرتے تھے مہربانی بھی		آہ وہ بھی کوئی زمانہ تھا
کیا بتادیں کہ اس چمن کے بیچ		کہیں اپنا بھی آشیانہ تھا
ہوشیار دل سے ملکے جانوگے،		کہ اثر بھی کوئی دیوانہ تھا

مصحفی کے اشعار بھی خاص و عام زبانوں پر چڑھ کر ضرب المثل ہوجانے کی اسی قدر صلاحیت رکھتے ہیں جس قدر کہ میر اثر کے اشعار۔ لیکن مصحفی اپنی پُرگوئی اور ہمہ رنگی کی وجہ سے اکثر خسارے میں رہتے ہیں۔ ورنہ

خالص تغزل کے رنگ میں ان کے وہاں کافی شعر موجود ہیں۔ مثال کے طور پر ان اشعار پر غور کیجئے:۔

مت میرے رنگ زرد کا چرچا کرو کہ یاں — رنگ ایک سا کسی کا ہمیشہ نہیں رہا
مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم — تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا
تجھے اے مصحفی کیا ہے خبر درد محبت کی — نہ اے بیدرد میرے سامنے لے نام درماں کا
صدمے سو دل پہ ہوئے ہم نے نہ جانا کیا تھا — ہائے رے ذوق وہ الفت کا زمانہ کیا تھا
کہتا نہ تھا میں اے دل جانا نہ اس گلی میں — آخر تو مجھ پہ آفت خانہ خراب لایا

میر، درد اور اثر کی ایک ممتاز خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اکثر چھوٹی چھوٹی سادہ اور شگفتہ بحریں اختیار کرتے ہیں جن میں بجائے خود وہ گداز اور وہ بے ساختہ پن ہوتا ہے جس کا دوسرا نام تغزل ہے اور ان بحروں میں انھوں نے وہ اشعار نکالے ہیں جو ان کا حاصل عمر ہے۔ مصحفی کو بھی انھیں اکابر متغزلین کی طرح چھوٹی اور دلآویز بحروں کے ساتھ خاص انس ہے۔ جن میں انھوں نے بڑے پر تاثیر اشعار کہے ہیں۔ مصحفی کی ان غزلوں کو پڑھئے تو ان پر اور بھی متقدمین کے رنگ کا دھوکا ہوتا ہے۔ البتہ مصحفی جب چھوٹی بحریں اختیار کرتے ہیں ان میں میر، درد اور اثر کی چھوٹی بحروں کے مقابلہ میں اکثر لوچ اور ترنم زیادہ ہوتا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے لکھنؤ کی نئی فضا کے بہترین عناصر کو بھی اپنی شاعری میں جذب کر لیا ہے۔ کچھ اشعار سنئے:۔

خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا — ہجر تھا یا وصال تھا کیا تھا
شب جو دل دو دو ہاتھ اُچھلتا تھا — وجد تھا یا وہ حال تھا کیا تھا
جس کو ہم روز ہجر سمجھے تھے — ماہ تھا یا وہ سال تھا کیا تھا
مصحفی شب جو چپ تو بیٹھا تھا — کیا تجھے کچھ ملال تھا کیا تھا
مصحفی یار کے گھر کے آگے — ہم سے کتنے نگھرے بیٹھے ہیں
تلوار کو کھینچ ہنس پڑے وہ — ہے مصحفی کشتہ اس ادا کا
فلک گر ہنساتا ہے مجھ پر کسی کو — میں ہنس کر فلک کی طرف دیکھتا ہوں
یار کا صبح پر ہے وعدۂ وصل — ایک شب اور ہی جئے ہی بنی
رکھا تہ خاک مصحفی کو — آرام تمام ہو چکا اب
کہدے کوئی جا کے مصحفی سے — ہوتی ہے بری یہ چاہ ظالم
کیا کریں جا کے گلستاں میں ہم — آگ رکھ آئے آشیاں میں ہم
مصحفی عشق کر کے آخر کار — خوب رسوا ہوئے جہاں میں ہم

غم دل کا بیان چھوڑ گئے   ہم یہ اپنا نشان چھوڑ گئے
صفحۂ روزگار پر لکھ لکھ   عشق کی داستان چھوڑ گئے

یہ مصحفی کا وہ تغزل ہے جو ان کو متقدمین سے بالکل گھلا ملا دیتا ہے۔ جذبات میں وہی سادگی اور خلوص ہے انداز بیان میں وہی بھولا پن ہے الفاظ اور ان کی بندش میں وہی بے تکلفی اور سہولت ہے۔

لیکن ادبی انتخابیت (Literary Electicism) میں سب سے بڑی خرابی یہ ہوتی ہے کہ وہ کبھی کسی ایک رنگ پر قناعت نہیں کرتی اور بعض اوقات وہ رنگ بھی اختیار کر لیتی ہے جس کو چھوڑے رہنا ہی بہتر ہوتا۔ اسی انتخابیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج اگر مصحفی کے کلام کا کوئی نقاد ان پر یہ الزام لگائے کہ وہ کسی خاص طرز کے ماہر نہیں ہیں تو اس کی تردید مشکل سے کی جا سکتی ہے۔ متقدمین ہی میں لے لیجئے۔ جہاں مصحفی نے میر، سوز، درد اور اثر وغیرہ کے رنگ کی تقلید کی ہے وہیں سودا کی تقلید بھی کچھ کم نہیں کی ہے۔ اور اکثر سنگلاخ زمینوں میں مرکب اور طویل ردیفوں کے ساتھ غزلیں لکھی ہیں جن میں صرف تکلف اور تصنع برتا جا سکتا ہے اور تغزل کو نباہا نہیں جا سکتا۔ کہا جا سکتا ہے کہ اگر انشاء کے دور میں نہ پیدا ہوئے ہوتے اور انکو ایسے معرکوں میں نہ شریک ہونا پڑتا تو شاید وہ اس روش سے احتراز کرتے۔ یہ کہنا ایک حد تک تو صحیح ہو گا لیکن مصحفی کی طبیعت ضرورت سے زیادہ ہمہ گیر اور وسیع المذاق واقع ہوئی تھی۔ انشاء سے مقابلہ نہ بھی ہوتا تو بھی وہ ہر رنگ میں طبع آزمائی ضرور کرتے۔ تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جس رنگ کو بھی انھوں نے اختیار کیا اس میں نہ صرف اپنی اُستادی اور کمال فن کا ثبوت دیا بلکہ غزل کی آبرو بھی رکھ لی۔ یہ سچ ہے کہ مشکل اور ٹیڑھی زمینوں میں وہ انشاء کے سامنے مشکل سے ٹھہرتے نظر آتے ہیں لیکن اگر اس غیر مناسب موازنہ کو نظر انداز کر دیا جائے تو خود اپنی جگہ مصحفی اپنے فن کے تنہا ماہر ہیں۔ زبان اور محاورہ اور شاعری کے رسوم و آداب کی تہذیب و تحسین میں ان کا درجہ انشاء سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ پر تکلف زمینوں میں چند اشعار مثالاً درج کئے جاتے ہیں:-

پیری سے ہو گیا یوں اس دل کا داغ ٹھنڈا   جس طرح صبح ہوتے کر دیں چراغ ٹھنڈا

اس طرح میں انشا کی غزل مصحفی کی غزل سے بڑھی چڑھی معلوم ہوتی ہے جس کا مطلع یہ ہے:-

پرتو سے چاندنی کے ہے صحن باغ ٹھنڈا   پھولوں کی سیج پر آ کر دے چراغ ٹھنڈا

لیکن مصحفی کی غزل نہ صرف لطف زبان۔ حسن محاورہ الفاظ کے رکھ رکھاؤ اور دوسرے عصری میلانات کے لحاظ سے ایک دلکش نمونہ ہے بلکہ اس کے اندر وہ متانت وہ گھلاوٹ وہ نرمی اور وہ دل گداختگی پورے طور پر موجود ہے جو غزل کے ترکیبی عناصر میں داخل ہیں اور جن کے لئے اس سے پہلے کا دور مشہور ہے۔ مصحفی کے دیوان میں ایسی غزلیں بھی کافی تعداد میں ہیں جن کے لطف کا دارومدار ردیفوں پر ہے۔ لیکن جو اپنے اندر پوری غزلیت

بھی رکھتی ہیں۔ یہ غزل مشہور ہو چکی ہے:۔

جو پھر اکے منھ کو اس نے بقفا نقاب اُلٹا — اِدھر آسمان اُلٹا اُدھر آفتاب الٹا

میں عجب یہ رسم دیکھی کہ بروز عید قرباں — وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا

بسوال بوسہ اس نے مجھے رکے دی جو گالی — میں ادب کے مارے اسکو نہ دیا جواب اُلٹا

اسی طرح میں انشاء کی بھی غزل ہے اور جہاں تک بیان کے زور اور انداز کے بانکپن کا تعلق ہے انکی غزل مصحفی کی غزل سے ممتاز ہے۔ اس میں وہی طرّاری اور چنچل پن ہے جو انشاء کی فطرت تھی۔ ان کے عام لب ولہجہ اور تیور کا انداز ان کے صرف ایک شعر سے ہو جاتا ہے:۔

عجب اُلٹے ملک کے ہیں اجی آپ بھی کہ تم سے — کبھی بات کی جو سیدھی تو ملا جواب الٹا

مصحفی کا رنگ بالکل جدا ہے جس کا انشاء کے رنگ سے مقابلہ کرنا اک فضول سی بات ہے۔ مصحفی کی زبان اور ان کے اسلوب میں وہ سادگی اور سیدھا پن ہے جو خلوص کی علامت ہے اور جس کے بغیر غزل صحیح معنوں میں غزل نہیں ہوتی۔ چند اور مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

چھپایا تم نے منھ ایسا کہ بس جی ہی جلا ڈالا — تغافل نے تمھارے خاک میں ہمکو ملا ڈالا

کہے تو کھیل لڑکوں کا ہے یعنی مصور نے — جو نقش اس صفحۂ ہستی پہ کھینچا سو مٹا ڈالا

زلفوں کی برہمی نے برہم جہان مارا — پلکوں کی کاوشوں نے سینوں کو چھان مارا

ہرگز وہ دست و بازو ملتے کبھی نہ دیکھے — جو تیر اس نے مارا سو بے گمان مارا

ایسی طرحوں میں پر تاثیر اشعار نکالنا ہر شاعر کا کام نہیں ہے۔ زبان اور محاورے اور ردیف کے پیچھے غزلیت کا سر رشتہ اکثر ہاتھ سے چلا جاتا ہے۔ ایسی غزلوں میں بھی مصحفی کے یہاں جو بے تکلفی، بے ساختگی اور تاثیر ہے وہ انکے معاصرین میں بہت کم ملتی ہے۔ مصحفی صرف قافیہ ردیف یا محاورے کے لئے اپنے اشعار کے ساتھ زبردستی نہیں کرتے۔

ان دو اشعار میں محاورے اور ردیف قافئے کس خوبی کے ساتھ نباہے گئے ہیں اور آورد یا تکلف کا کہیں سے احساس نہیں ہونے پاتا۔

جب کوہ و بیاباں میں جا ہم نے قدم مارا — فرہاد نہ کچھ بولا مجنوں نے نہ دم مارا

تنہا نہ دل اپنا ہی میں زیر و زبر دیکھا — اس جنبش مژگاں نے عالم کو بہم مارا

یہی کیفیت ان اشعار میں ہے:۔

جس دم کہ وہ کمر میں رکھ کر کٹار نکلا — جس رہگذر سے نکلا عالم کو مار نکلا

آئی زباں جو اپنی جنبش میں نزع کے دم — تیرا ہی نام منھ سے بے اختیار نکلا

تہمت ہے مصحفی پر سیر چمن کی یارو — کب گھر سے اپنے باہر وہ سوگوار نکلا
ایک ہچکی میں ٹھکانے دل بیمار لگا — اس پہ اب تیر لگا خواہ تو تلوار لگا
مصحفی عشق کی ہے گرمی بازار وہی — کشور حسن میں نت رہتا ہے بازار لگا

یہی بات انشاؔ کو میسر نہیں ہوئی۔ ایسی ٹیڑھی طرحوں میں انھوں نے اپنی شوخ و شنگ طبیعت کی جولانیاں جتنی بھی دکھائی ہوں لیکن مصحفی کی طرح ظاہری رکھ رکھاؤ کے ساتھ کلام کو ایک باطنی کیف سے معمور رکھنا انکے بس کا کام نہ تھا۔ اب ہم ایسی ہی طرحوں میں سے کچھ اور اشعار یکجا کرتے ہیں :-

میں ادا اسکی کہوں کیا مرے مینوش نے رات — سر پہ ساقی کے کس انداز سے ساغر مارا
مصحفی عشق کی وادی میں سمجھ کر جانا — آدمی جاتا ہے اس راہ میں اکثر مارا
آخر کو مصحفی نے دی جان تیری خاطر — جی سے گزر گیا وہ نادان تیری خاطر
کیوں نہ ہو شیشۂ دل چور مرے پہلو میں — میں نے ایام جنوں کھائے ہیں تھوڑے پتھر
کوئی سحر سے باندھتا ہے دکاں کو — وہ کافر جو آوے تو بازار باندھے
نہ ساون کرے پھر برسنے کا دعوے — جو یہ دیدۂ تر کبھی تار باندھے
محبت میں صادق یہ اغیار ٹھہرے — ہم اک بات کہکر گنہگار ٹھہرے

مصحفی کے کلام کا ایک معتد بہ حصہ خارجی انداز میں ہے جو جراُت کا اسلوب رکھتا ہے۔ وہ معاملہ بندی۔ ادا بندی۔ معشوق کا سراپا۔ اس کے عشوہ و ناز اور سج دھج کے بیان میں بھی اُستادانہ مہارت رکھتے ہیں۔ اس میدان میں ان کا جراُت کے ساتھ مقابلہ تھا اور یہ کہنا غلط نہیں کہ اول اول انھوں نے جراُت ہی کی تقلید میں یہ رنگ اختیار کیا لیکن جراُت و مصحفی میں فرق ہے۔ خارجی رنگ میں بھی مصحفی کا انداز متقدمین ہی سے قریب معلوم ہوتا ہے۔ ان کی زبان یہاں بھی انشاؔ اور جراُت دونوں سے پیاری ہوتی ہے۔ لیکن ان کے یہاں وہ پتہ کی باتیں سننے میں نہیں آتیں جن کے لئے جراُت مشہور ہیں۔ جراُت کا چلبلاپن ان کی اپنی فطرت کا تقاضا تھا جس سے مصحفی کو کوئی طبعی مناسبت نہ تھی۔ چنانچہ جب کبھی خواہ مخواہ کی ریس میں اپنے اوپر بہت زیادہ تشدد کرتے ہیں تو مبتذل ہو جاتے ہیں جو ان کے دیہاں شاق گزرتا ہے۔ مثلاً مصحفی جیسے شاعر سے ہم اس قسم کی باتیں سننے کی توقع نہیں رکھتے :-

یہ طرفہ اختلاط نکالا ہے تم نے واہ — آتے ہی پاس چپٹ سے وہیں مار بیٹھنا
پانی بھرے ہے یارو یاں قرمزی دوشالہ — لنگی کی سج دکھا کر سقنی نے مار ڈالا

لیکن اکثر مقامات پر اس تقلید میں بھی کامیاب رہے اور تخیل کی مدد سے ان خارجی موضوعات میں بھی جراُت

سے زیادہ پیاری اور مزیدار باتیں کہہ گئے ہیں۔ یہ ان کے رچے ہوئے مذاق کا نتیجہ تھا۔ متقدمین کے غائر مطالعہ سے انھوں نے اپنے تخیل اور اپنی فطرت شعری کی تربیت کی تھی۔ اس لئے جہاں جہاں خارجی معاملات باندھے ہیں اثر و کیفیت کو قایم رکھا ہے مثلاً:۔

قدم اس دھج سے کچھ پڑتا ہی اس غارتگر جاں کا
کہ دل ہر ہر قدم پہ لوٹ ہے گبر و مسلماں کا

بھیگے سے ترا رنگ حنا اور بھی چمکا
پانی میں نگاریں کف پا اور بھی چمکا

گیند بازی سے اذیت نہ کہیں پہونچے تجھیں
کہ پلٹتی ہے بری طرح سے سرکار کی گیند

دل لے گیا ہے میرا وہ سیم تن چرا کر
شرما کے جو چلے ہے سارا بدن چرا کر

اے مصحفیؔ تو ان سے محبت نہ کیجیو
ظالم غضب کی ہوتی ہیں یہ دتی والیاں

میری نظر تجھی کو لگے دور چشم بد
اس وقت بن رہے ہو پری پھر کے دیکھ لو

جمنا میں کل نہا کر جب اس نے بال باندھے
ہم نے بھی اپنے دل میں کیا کیا خیال باندھے

اول تو یہ دھج اور یہ رفتار غضب ہے
تس پر ترے پازیب کی جھنکار غضب ہے

مصحفی کے کلام میں اس شُہدپن کا شائبہ بہت کم ہے جس کی جراٗت وغیرہ کے یہاں بہتات ہے۔ انکی شاعری خالص شاعری ہے۔ ان کے اندر جتنی نزاکتیں اور لطافتیں اور جتنی رنگینیاں ملتی ہیں ان کی زبان اور طرز ادا میں جو سجاوٹ اور طرحداری ہوتی ہے وہ سب ان کے ذوق شعر اور مطالعہ کا نتیجہ ہیں۔ انھوں نے بہترین روایات شاعری کو اخذ کر کے اپنی چیز بنا لیا تھا۔ اُردو میں دو شاعر ایسے ہیں جن کو روایات و صور کے شاعر کہہ سکتے ہیں۔ مصحفی اور حسرت موہانی۔ ان کی شاعری کے محرکات زندگی کے تجربات اتنے نہیں جتنے کہ خالص شاعری کے تجربات۔ شاعری کے تجربات سے میری مراد اساتذہ کے کلام کا ذوق و انہماک کے ساتھ مطالعہ کر کے اس کو اپنے ہر رگ و پے میں جذب اور ساری کر لینا ہے۔ مصحفی اور حسرت دونوں نے یہی کیا ہے۔ دونوں کو شاعر بنانے کے لئے تخیل اور اساتذہ کے کلام کافی تھے۔

مصحفی کا کلام چاہے وہ خارجی پہلو رکھتا ہو چاہے داخلی ایک خاص کیفیت کا حامل ہوتا ہے ان کی شاعری ارتسامی (Impressionistic) ہوتی ہے۔ ان کے محاکات حسن کاری (Art) کی ایک خاص بصیرت لئے ہوتے ہیں۔ ایک شعر سنئے:۔

کیا نظر پڑ گئیں آنکھیں وہ خمار آلودہ
شفق صبح تو ہے زور بہار آلودہ

یوں تو بظاہر مصحفی کے کلام میں کوئی انفرادیت نظر نہیں آتی اور آزاد کی یہ رائے صحیح معلوم ہوتی ہے کہ غزلوں میں ہر رنگ کے شعر ہوتے ہیں کسی خاص رنگ کی قید نہیں لیکن گہری نظر ڈالنے سے مصحفی کے کلام

میں ہم کو ایک تیز انفرادی کیفیت نظر آتی ہے جو انھیں کی چیز ہے اور جس کو میں نے ایک اندرونی فضائی کیفیت بتایا ہے۔ مصحفی اُردو کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے غزل کے اشعار میں رنگ اور فضا کا احساس پیدا کیا۔ اور یہی ان کی سب سے زبردست انفرادی خصوصیت ہے جس کا اثر بعد کی اُردو شاعری میں کافی دور تک پڑا اور جس کی وجہ سے جرأت کے مقابلہ میں شاعروں نے مصحفی کو زیادہ نظر کے سامنے رکھا۔ کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

ایک دن رو کے نکالی تھی میں واں کلفتِ دل
اب تلک دامنِ صحرا ہے غبار آلودہ

اس شعر میں ایسی گہری اور چھا جانے والی فضا پیدا کر دی ہے کہ سنگلاخ زمین کا خفیف سے خفیف احساس بھی پیدا ہونے نہیں دیا ہے۔ اسی طرح کے کچھ اور اشعار سنئے:۔

چلی بھی جا جرس غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلۂ نوبہار ٹھیرے گا

تیری رفتار سے اک بے خبری نکلے ہے
مست و مدہوش کوئی جیسے پری نکلے ہے

کھول دیتا ہے تو جب جا کے چمن میں زلفیں
پا بہ زنجیر نسیم سحری نکلے ہے

جس بیابان خطرناک میں ہے اپنا گزر
مصحفی قافلے اس راہ سے کم نکلے ہیں

کس نے رکھے ہیں قفس ان پہ گرفتاروں کے
کانٹے کیوں سرخ ہیں سب باغ کی دیواروں کے

مجنوں گورکھپوری

اشاعتِ اُردو

کے لئے بالکل نیا لیکن نہایت مفید ادارہ

دفتر معمۂ "اشاعتِ اُردو" ہے

جو ہر مہینے دو مرتبہ علاوہ دو ہزار روپیہ نقد انعام کے ملک کے مختلف اخبار و رسایل بھی مفت جاری کرتا ہے اس وقت تک متعدد بار یہ انعام دئے جا چکے ہیں۔ حسب ذیل پتہ پر قواعد طلب کیجئے:۔

دفتر معمۂ اشاعت اُردو۔ افضل گنج روڈ۔ حیدر آباد دکن

مصحفی

نام و تخلص شیخ غلام ہمدانی نام مصحفی تخلص خلف شیخ ولی محمد امروہہ کے رہنے والے تھے۔ زمانہ طالب علمی دہلی میں بسر کیا اور کسب کمال کے بعد لکھنؤ میں اقامت گزیں ہو کر وہیں کے ہو رہے۔

عادات و مشاغل خوش خلقی اور خوش مزاجی کے ساتھ ادب و لحاظ کی پابندی کے باعث سے جہاں رہتے تھے عزیز دلہا ہو کر رہتے تھے۔ تباہی دہلی کے بعد بعہد نواب آصف الدولہ بہادر لکھنؤ آئے اور مرزا سلیمان شکوہ ابن شاہ عالم بادشاہ دہلی کی سرکار میں ملازم ہوئے اور آخر وقت تک شغل شعر و شاعری میں مصروف رہے اور اس درجہ استعداد و مشق بہم پہونچائی کہ دنیائے اُستادی میں عدیم المثال قرار پائے۔

کہنہ مشقی و تصنیفات ان کی کہنہ مشقی سے متعلق تذکروں میں اکثر روایتیں نظر سے گزرتی ہیں مثلاً مضمون نثر کو دیکھ دیکھ کر اس طرح پر بے تکلف نظم کر دیتے تھے کہ دیکھنے والوں کو نقل کا گمان ہوتا تھا یا طرح مشاعرہ پر لا تعداد اشعار لکھتے چلے جاتے تھے جن میں سے بعد کو مشاعرہ میں اپنے نام سے پڑھنے کے لئے لوگ غزلیں چھانٹ کر مول لیجاتے تھے۔ اسپر بھی اردو کے آٹھ دیوان و ایک دیوان فارسی اور دو تذکرے شعرائے اردو و فارسی کے ان سے یادگار باقی ہیں جن کے مطالعہ کے بعد انکی اُستادی اور مشاقی کے ثبوت کے لئے پھر کسی دوسری دلیل کی حاجت نہیں رہتی۔

شاگرد و معاصر اور اس سے بڑھکر ثبوت انکے کمال فن کا یہ ہے کہ جتنے اُستاد انکے شاگردوں اور عقیدتمندوں میں سے نکلے اتنے ولی سے لیکر اُسوقت تک کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوئے چنانچہ انکے معاصر اُستادوں میر حسن، جرأت و انشا کے شاگردوں کی تعداد اُنکے متوسلین کے دسویں بلکہ بیسویں حصہ کے برابر بھی نہیں ہے حتی کہ میر حسن کے صاحبزادے میر خلیق خود اپنے والد کے اشارے سے انھیں کے شاگرد ہوئے اور شاگردی پر قایم بھی رہے — ذیل میں ہم ایک نقشہ سلسلۂ مصحفی کا درج کرتے ہیں جسکے ملاحظہ سے معلوم ہوگا کہ مصحفی کے بعد لکھنؤ کے تمام مشہور اُستاد انھیں کے حلقہ بگوش تھے یہانتک کہ بعض تذکرہ نویسوں کی تحقیق کے مطابق شیخ ناسخ کو بھی بواسطہ محمد عیسیٰ تنہا انھیں سے تلمذ تھا چنانچہ دیباچہ دیوان ششم مصحفی کی عبارت سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے جس میں مصحفی لکھتے ہیں کہ:- "حصۂ نعمت الوان این خوان بہ شیخ ناسخ کہ یکے از دوستان محمد عیسیٰ تنہا است و بفقیر ہم رسوخے ارتہ دارد مقسوم گشتہ

نقشہ سلسلۂ مصحفی

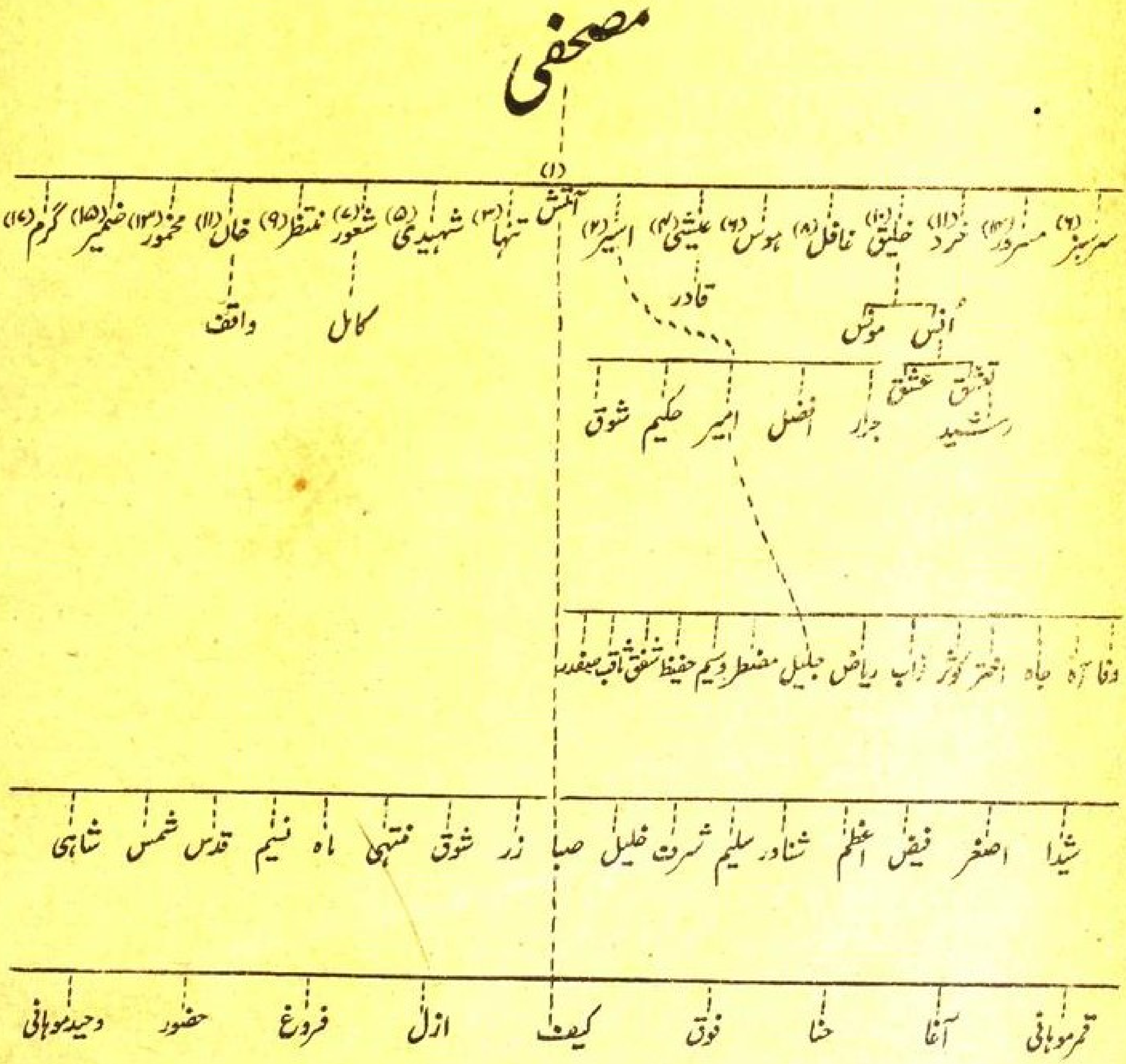

نوٹ:- اس نقشہ میں ہر اُستاد کے شاگرد رشید کا نام درمیان میں اور پھر سلسلہ وار داہنے بائیں یکے بعد دیگرے حسب مرتبہ دوسرے شاگردوں کے نام درج ہیں جیساکہ شاگردان مصحفی کی فہرست میں نمبر دیکر ظاہر کر دیا گیا ہے۔

مصحفی کی شاعری

مصحفی کی ہمہ گیر و ہمہ رنگ طبیعت نے کسی خاص رنگ سخن پر قناعت نہ کرکے مشاہیر شعرائے متقدمین و متاخرین میں سے تقریباً ہر ایک کے انداز سخن کا پسندیدہ نمونہ پیش کیا ہے چنانچہ اُن کی غزلوں میں کہیں میر کا درد ہے تو کہیں سودا کا دبدبہ۔ کسی مقام پر فغاں کی رنگینی ہے تو کسی جگہ سوز کی سادگی۔ کہیں واقعات میں جرأت کی سلاست و حقیقت نویسی سے کام لیا گیا ہے تو کہیں ترکیب الفاظ اور انداز بیان میں انشاء کا طنطنہ اور جبروت صرف ہوا ہے۔ کہیں پر غزلوں کو قطعات مسلسل پر ختم کرنے میں جعفر علی حسرت کا رنگ کلام پیش نظر ہوتا ہے تو کہیں مشکل ردیف قافیوں کو بخوبی و صفائی نباہنے میں شاہ نصیر کا کمال سامنے آجاتا ہے اور پھر ان سب کے علاوہ جن غزلوں اور بیتوں میں ان تمام اساتذہ کی خوبیوں کو ان کی کہنہ مشقی اور اُستادی یکجا کردی ہے ان کا شمار لاریب اُردو شاعری کے بہترین نمونوں میں کیا جا سکتا ہے

مصحفی کی زبان اگرچہ میر و سودا کی قدیم زبان سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے لیکن اس درجہ شیریں اور سبک واقع ہوئی ہے کہ اکثر اس کی حلاوت اس زمانہ میں بھی ناظرین کے دلوں میں اس کے متروک الاستعمال ہونے کا گمان نہ پیدا ہونے دیگی ملاحظہ ہو:۔

جب واقفِ راہ و روشِ ناز ہوئے تم
عالم سے کے میاں خانہ بر انداز ہوئے تم

رات پردے سے ذرا منہ جو کسو کا نکلا
شعلہ سمجھا تھا اُسے میں وہ بھبھوکا نکلا

اس نازنیں کی باتیں کیا پیاری پیاریاں ہیں
پلکیں ہیں جس کی چھریاں آنکھیں کٹاریاں ہیں

جاگا ہے رات پیارے تو کس کے گھر جو تیری
پلکیں او نیندیاں ہیں آنکھیں خماریاں ہیں

ترسانہ مجھ کو کھینچ کے تلوار مار ڈال
گر مار ڈالنا ہے تو ایکبار مار ڈال

صیاد تجھکو کس نے کہا تھا کہ فصلِ گل
مجھکو قفس میں کرکے گرفتار مار ڈال

"تجھسے کہا تھا" کی جگہ "تجھکو کہا تھا" قدیم زبان ہے اگرچہ بعض لوگ حکم کے معنوں میں اب بھی اس کا استعمال جائز سمجھتے ہیں:۔

عارض نہ تیری زلفِ پریشان میں دیکھا
یوسف کو زلیخا کے میں زندان میں دیکھا

فارسی اضافت کے ساتھ اعلان نون بھی غالب کے وقت تک جائز تھا اب اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ تیں کا استعمال بحذف "نے" علامت فاعل بھی قدیم شیوۂ سخن طرازی ہے۔

فارسی محاوروں کے ترجموں کا اُردو الفاظ سے جوڑ ملانا بھی شعرائے متقدمین کا خاص جوہر ہے۔ چنانچہ مصحفی نے

بھی بعض محاوروں کو اس خوش اسلوبی کے ساتھ اُردو زبان میں آمیختہ کیا ہے کہ ارباب بنیش انکو دیکھیں گے تو تعجب کریں گے

زلفوں کی برہمی نے برہم جہان مارا — پلکوں کی کاوشوں نے سینوں کو چھان مارا
جب کوہ و بیاباں میں جا ہم نے قدم مارا — فرہاد نہ کچھ بولا مجنوں نے نہ دم مارا
تنہا نہ دل اپنا ہی میں زبر و زبر دیکھا — اس جنبش مژگاں نے عالم کو بہم مارا
میں تیرے تغافل کا کشتہ ہوں کہ عاشق کو — معشوق کی آنکھوں نے اس لطف سے کم مارا
اے مصحفی جو میرے اشعار بیاضی تھے — میں صاد کیا ان پر اور سب کو قلم مارا
مجھ صید ناتواں سے مگر عار لے گیا — قاتل جو اپنی کھینچ کے تلوار لے گیا

اب ہم اپنے بیان کی تائید میں دواوین مصحفی سے ہر رنگ کا کلام پیش کر کے مختلف اساتذہ کے انداز سخن سے اسکا موازنہ کریں گے۔ اول چھوٹی بحر میں ان کی دو غزلیں ملاحظہ طلب ہیں:-

گر ابر گھرا ہوا کھڑا ہے — آنسو بھی تلا ہوا کھڑا ہے
حیران ہے کس کا جو سمندر — مدت سے رُکا ہوا کھڑا ہے
ہے موسم گل۔ چمن میں ہر نخل — پھولوں سے لدا ہوا کھڑا ہے
شمشاد برابر اس کے قد کے — دہشت سے بچا ہوا کھڑا ہے
خونیں کفن شہید الفت — دولہا سا بنا ہوا کھڑا ہے
اے جان نکل کہ مصحفی کا — اسباب لدا ہوا کھڑا ہے

دیکھ اس کو اک آہ ہم نے کرلی — حسرت سے نگاہ ہم نے کرلی
کیا جانے کوئی کہ گھر میں بیٹھے — اس شوخ سے راہ ہم نے کرلی
جب اس نے چلائی تیغ ہم پر — ہاتھوں کی پناہ ہم نے کرلی
نخوت سے جو کوئی پیش آیا — کج اپنی کلاہ ہم نے کرلی
دی ضبط میں جبکہ مصحفی جاں — شرم اس کی گواہ ہم نے کرلی

ان دونوں غزلوں کی سادگی اور صفائی خصوصاً دوسری غزل کا درد میر تقی میر کے کلام کی یاد دلاتا ہے اگر بحیثیت مجموعی، مصحفی کا کلام میر سے دوسرے درجے پر ہو۔ میر کی سادگی اور درد کے ساتھ ہی ساتھ سودا کا زور اور دبدبہ بھی موجود ہو۔ ملاحظہ ہو:-

منظور گر تمھیں بھی تماشائے خلق ہے — وابستہ اک نظر کی تمنائے خلق ہے
کس طرح کوئی چین سے بیٹھے کہ رات دن — دور سپہر درپئے ایذائے خلق ہے
کچھ شعر و شاعری سے نہیں مجھکو فائدہ — الّا حصول کاوش بیجائے خلق ہے
چل تو بھی مصحفی کہ وہ نکلا ہی بزم میں — ہے بار عام نوبت مجرائے خلق ہے

تم گرم ملے ہم سے نہ سرما کے دنوں میں
پیش آئے بگرمی بھی تو گرما کے دنوں میں
نے غرفے سے جھانکے نہ کبھی بام پر آئے
پنہاں رہے تم حسن دل آرا کے دنوں میں
جی ہی میں رکھی اپنے میاں جی سے جو گذری
کچھ ہم نے کہا تم سے تمنا کے دنوں میں

بلبل خوش صفیر ہوں گلشن روزگار کا
کچھ میں نشید خواں نہیں زمزمۂ بہار کا
لالہ ہوا بروئے خاک رنگ شفق بر آسماں
خون کہاں کہاں گرا زخم دل فگار کا

خالص عاشقانہ انداز میں سادگی بیان کے ساتھ واقعیت مضمون کا نباہنا جرأت کا حصہ ہے لیکن مصحفی نے بھی جا بجا اپنی غزلوں کو اس رنگ میں جرأت سے ملا دیا ہے۔ مثلاً لکھتے ہیں:-

چھپایا تم نے منہ ایسا کہ بس جی ہی جلا ڈالا
تغافل نے تمہارے خاک میں ہم کو ملا ڈالا
نہ اٹھا حشر میں بھی اس کی تیغ ناز کا مارا
کیا خوں اس نے اک عالم کا اور وہیں چھپا ڈالا
مرض تھا مصحفی کو صعب تر یہ خوب وہ سمجھا
کہ جوں توں آپ کو اس نے ترے کوچے میں لا ڈالا

شب گھر سے جو بیٹی کی وہ آواز پہ نکلا
نکلا تو ولیکن عجب انداز پہ نکلا
دل مجلس خوباں میں جو گم رات ہوا تھا
صد شکر اسی محرم ہمراز پہ نکلا
اے مصحفی حسن اس کا جو دیکھے ہو کہے ہے
یہ طرفہ ستارا فلک ناز پہ نکلا

اس غزل کے دوسرے شعر میں "کے پاس" کی جگہ "پہ" استعمال کیا گیا ہے۔ یہ محاورہ نواح بداؤں وغیرہ میں اب بھی مستعمل ہے۔

حسن اس کا اب سماں کچھ اور دکھلانے لگا
چاند سا پردے سے وہ مکھڑا نکل آنے لگا
میں ہی کچھ بے صبر و طاقت عشق میں اسکے نہیں
دل بھی اب بے طاقتی کو کام فرمانے لگا
یا وہ عالم تھا کہ کوئی اس سے واقف ہی نہ تھا
یا یہ عالم ہے کہ عالم اس پہ مرجانے لگا
کان میں قاصد نے کچھ ایسا ہی آکر کہہ دیا
جس کو سنکر سر میں دیواروں سے ٹکرانے لگا
مجھ کو ساقی کی یہ محفل میں ادا بھائی بہت
مصحفی کو جام خالی سے جو ڈھکانے لگا

ہے ہے ٹک اس طرف کو اجی پھر کے دیکھ لو
اک ناتواں کا جائے ہی جی پھر کے دیکھ لو
کیا مجھ کو چھوڑ نزع میں جانا ضرور ہے
اور یونہی ہے خوشی تو ذری پھر کے دیکھ لو
مارا ہے جس کو کج نظری سے اسے میاں
ابرو کی یوں کہے ہے کجی پھر کے دیکھ لو
تم مصحفی کو چھوڑ کے بسمل چلے گئے
رخصت حیا نے اتنی نہ دی پھر کے دیکھ لو

مصحفی کے کلام کی خوبی زیادہ تر شگفتہ و دراز قافیوں اور ردیف کی تلاش اور پھر ردیف کو مختلف طور پر نباہنے کی ترکیب پر منحصر ہے اور یہی مسلک تھا تقریباً تمام پرانے شاعروں کا جو لکھنؤ میں مصحفی کے بعد بھی ہوس و عیشی تک اور دہلی میں شاہ نصیر کے بعد ظفر تک قائم اور

پسندیدہ اہل نظر رہا۔ مندرجۂ ذیل منتخب غزلوں کو پڑھکر ارباب انصاف ملاحظہ فرمائیں کہ مختلف ردیفوں کو اُستاد نے کن کن پہلوؤں سے نباہا ہے اور قادر الکلامی و مشاقی کی کیسی کیسی مثالیں بروئے کار آئی ہیں۔

بھیگے سے ترا رنگ حنا اور بھی چمکا
پانی میں نگاریں کفِ پا اور بھی چمکا

جوں جوں کہ پڑیں مُنھ پہ ترے مینھ کی بوندیں
جوں لالۂ تر حُسن ترا اور بھی چمکا

بھینے کا نہیں کوئی اگر یوں نہیں عزیزو
یہ طفل پریزاد ذرا اور بھی چمکا

دھویا نہ گیا خون مرا تیغ سے اسکی
کمبخت یہ پانی جو پڑا اور بھی چمکا

اے مصحفی کیا بات کہوں درد جگر کی
جوں جوں کہ میں کی اُس کی دوا اور بھی چمکا

ازبسکہ مرے دیدۂ حیران میں کچھ ہے
اک آن میں دل کچھ ہے تو اک آن میں کچھ ہے

خالی ہی چلے آتے ہیں ہم سیر چمن سے
داماں میں کچھ ہے نہ گریباں میں کچھ ہے

جادو تو میں کہتا نہیں پر سمجھوں ہوں اتنا
واللہ تری نرگس فتاں میں کچھ ہے

اے مصحفی مرنے کی مرے سُنکے وہ بولا
کیا لگتا ہے مرجانے کو انسان میں کچھ ہے

جس کشتے کا زخموں میں ہو چور بدن سارا
خوں میں نہ بھرے کیونکر پھر اس کا کفن سارا

گر شمع کے رونے میں ہے ایسی ہی رنگینی
بھر جائے گا لوہو سے تا صبح لگن سارا

اے مصحفی تو واں سے کیوں روٹھ کے اُٹھ آیا
دیوانے تری خاطر کرتا ہے وطن سارا

جسدم کہ وہ کمر میں رکھکر کٹار نکلا
جس رہگزر سے نکلا عالم کو مار نکلا

آئی زباں جو اپنی جنبش میں نزع کے دم
تیرا ہی نام منھ سے بے اختیار نکلا

تہمت ہے مصحفی پر سیرِ چمن کی یارو
کب گھر سے اپنے باہر وہ سوگوار نکلا

اک تیغ کے لگتے ہی لگی جان ٹھکانے
اچھا تو ہے لگ جائے گر انسان ٹھکانے

نومید پھرا واں سے تو قاصد نے کہا یوں
یہ خط نہیں لگتا کسی عنوان ٹھکانے

اے دست جنوں تیری مدد ہووے تو اب بھی
اک جھٹکے میں لگتا ہے گریبان ٹھکانے

تھی تھوڑی سی کچھ رات یہ پروانہ کہے تھا
جسوقت لگی شمع شبستان ٹھکانے

گہہ دوش پہ پڑتی ہے تو گہہ دوش کمر پہ
ڈھونڈھے ہے تری زلف پریشان ٹھکانے

اُلجھا ہے تو کس سے جو ترے جامے کے پیارے
نے چین ٹھکانے ہے نہ دامان ٹھکانے

آویزہ بنا محمل لیلےٰ کے جرس کا
صد شکر لگا اب دل نالان ٹھکانے

پھر کھینچیو تلوار میاں غصے میں آکر
عاشق کو لگاتی ہے یہی آن ٹھکانے

اے مصحفی اس زلف میں لاکھوں کو ملی جا
لیکن نہ لگا اک یہ پریشان ٹھکانے

یاران عدم رفتہ گئے دور بہت سے — ہمسار کے[1] پیچھے رہے رنجور بہت سے
ٹپکی جو کہیں ہاتھ سے شب اُسنے گلابی — مجلس میں ہوئے شیشۂ دل چور بہت سے
اے مصحفی جا نکلیں نہ کبھی اُسکی گلی لیک — ہاتھوں سے ہم اس دل کے ہیں مجبور بہت سے

دیکھ اسکی شب وصل میں اوسان ہمارے — پھر پھر کے فلک ہووے ہے قربان ہمارے
جب ہو نہ سکا ضبط غم عشق تو آخر — کیا پھوٹ بہے دیدۂ گریان ہمارے
کل پان کا رنگ آئینہ میں دیکھ وہ بولے — کیا لال ہوئے ہیں لب و دندان ہمارے
پہنے ہوئے دیکھا ہے اُسے سُرخ جو جامہ — ہے دجلۂ خوں تا بگریبان ہمارے
اور اس سے سوا مصحفی کیا ہووےگی شہرت — جیتے ہی لکھے جاتے ہیں دیوان ہمارے

ان غزلوں کے دیکھنے سے ثابت ہوگا کہ میر تقی کے رنگ میں مصحفی میر حسن کے ہم پلہ، سودا کے انداز میں انشا کے ہمپایہ اور جعفر علی حسرت کے طرز میں جرأت کے ہمنوا ہیں لیکن بحیثیت مجموعی اپنے ان سب ہمعصروں سے باعتبار کمال سخندانی و مشاقی برتر ہیں اور یہیں سے ہو کر راقم کی نگاہ میں میر و مرزا کے بعد کوئی اُستاد انکے مقابلے میں نہیں جچتا۔ معلوم نہیں کہ صاحب آبحیات نے کس بنا پر سید انشا کو مصحفی پر ترجیح دینے کی جا بجا کوشش کی ہے۔ سید انشا کی طباعی اور قابلیت میں کسکو شبہ ہو سکتا ہے لیکن دربار لکھنؤ کی مجبوریوں نے ان کی ظرافت کو دائرۂ اعتدال سے خارج کرکے ان کے کلام کو بقول شیفتہ ساقط الاعتبار بنا دیا تھا، چنانچہ نظر بحالات موجودہ انھیں مصحفی کے مقابل لانا مصحفی کے کمال کی توہین کرنا ہے اور بس۔ اب ہم اپنی اس مختصر تحریر کو مصحفی کے چند متفرق مطلعوں پر ختم کرتے ہیں جن کی خوبی اور دلفریبی میر کے نشتروں اور سودا کے خنجروں سے کسی حال میں کم نہیں۔ ناظرین ملاحظہ فرمائیں اور لطف اندوز ہوں

اک ذرا دیکھیو اس رشکِ پری کا سونا — میں تو دیکھا نہیں اس بیخبری کا سونا

ترے کوچے ہر بہانے مجھے دن کو رات کرنا — کبھی اس سے بات کرنا کبھی اُس سے بات کرنا

زلفوں سے اسکی میں نے جسدن کہ ہاتھ دھویا — ابرِ سیاہ آکر تربت پہ میری رویا

دل لے گیا ہے میرا وہ سیمتن چرا کر — شرما کے جو چلے ہے سارا بدن چُرا کر

شب ہجراں تھی میں تھا اور تنہائی کا عالم تھا — غرض اس شب عجب اک بے سروپائی کا عالم تھا

میں وہ نہیں ہوں کہ اُس بُت سے دل مرا بھر جائے — پھروں جو اس سے تو مجھسے مرا خدا پھر جائے

راہ میں کشتہ پڑے ہیں کئی ارمان بھرے — بچکے چلیو نہ ترا خون سے دامان بھرے

ہے غریبی میں خبر کس کو وطن والوں کی — کیا گرفتار سے پوچھو ہو چمن والوں کی

حسرت موہانی

---

[1] "ہمسار کے" یعنی "ہم سے"۔ یہ محاورہ دکن میں ابتک مستعمل ہے۔

مصحفی کی دو گمشدہ بیاضیں

ید بیضا اور نورِ ازل

شاعری کا ستارہ اودھ میں اسوقت چمکا جبکہ تیموری اقبال لب بام تھا اور شاعری رفتہ رفتہ ایک پیشہ ہو کر رہ گئی تھی اور اس عصر کے شاعر متاع ہنر کو کاسۂ گدائی بنائے ہوئے دربدر آوارہ گردی کر رہے تھے۔ نظام سلطنت کے اجزاء خزاں کے تند جھونکوں سے منتشر ہو چکے تھے شاہجہاں آباد کا رنگ پلٹ چکا تھا حالات موافق نہ تھے۔ ضروریات زندگی کے ذرائع محدود تھے شعراء رنگ زمانہ سے متاثر ہو کر بصد حسرت و یاس پورب کی طرف چل کھڑے ہوئے اور وادی غربت میں قدم رکھا۔ بیت السلام کی حالت خواہ کتنی ابتر کیوں نہ رہی ہو لیکن وہ جماعت جس نے اپنی عمر عزیز اس کی گلیاں چھاننے میں گزاری ہو اس نے اپنے دلوں پر پتھر رکھکر عزیز وطن کو خیرباد کہا مگر عمر بھر یہ داغ مفارقت نہ مٹا۔

اس آوارہ منش تاراج شدہ قافلہ کو لکھنؤ میں امن و عافیت کی جگہ نصیب ہوئی اور سلطنت اودھ نے اپنی بساط بھر ان باکمال افراد کو سر آنکھوں پر جگہ دی ان کی عزت و منزلت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ آسایش بہم پہونچائی مناصب مقرر کئے مسافر نہیں مہمان عزیز سمجھا اور ان گرامی قدر مخدوموں نے پردیسیوں کی ایسی خدمت کی کہ مہاجرین کرام غربت کے شدائد بھول گئے اور وہ نغمات جو کسی وقت دولت مغلیہ کی ہم نوائی میں الاپے جاتے تھے اب سلطنت اودھ کی ثناگری میں صرف ہونے لگے۔

شہنشاہ شاہ عالم کے صاحبزادے آفاق مرزا سلیمان شکوہ بھی بیت الشرف لکھنؤ میں داد عیش دے رہے تھے صاحب عالم کی ڈیوڑھی ہر مہاجر کے لئے ملجا و مامن تھی وہی دبدبہ تھا اور وہی طنطنہ۔ نواب وزیر اودھ مچھل ہلاتے تھے اشرفیاں پاتے تھے نذریں پیش ہوتی تھیں۔ شاہجہاں آباد سے جو جاتا پہلے حضور میں قدم بوس ہونے کی سعادت حاصل کرتا۔ وہ شاعر تھے اور شاعر گر بھی، شعر و سخن کا فطری ذوق تھا، شعراء و اہل کمال کی عزت افزائی کرتے تھے اور غلام ہمدانی مصحفی اسی دربار سے منسلک تھے ۔۔۔۔۔ ہم کو اسی عہد سے تعلق ہے کیونکہ لکھنؤ کی

شاعری کا سنگ بنیاد اسی دور میں رکھا گیا تھا اور تاریخی حیثیت سے یہ عہد ۱۲۰۱ھ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

مصحفی نے اپنے تذکروں میں صاحب عالم کی فیاضیوں کا ذکر بڑے مزے لے لیکر کیا ہے:-

"در ایامیکہ حکم ترتیب مجلس مشاعرہ شدہ بود اکثرے از کاردانان ایں فن در حضور آمدہ حاضر می شدند۔ ایں فقیر حقیر ہیچوں نسبت دیگراں باوصف گوشہ نشینی دریں کار زیادہ رسوائی داشت بگفتۂ میر انشاء اللہ خاں حسب الطلب حضور باوصف کم بغلی و شکستہ حالی شریک مجلس یاراں شدہ بود، چنانچہ در ہماں تاریخ بہ حلقۂ ملازماں حضور در آمد و بعد چندے از کلام حقیر محفوظ شدہ در جائزۂ قصاید مدحیہ کہ مشتمل بر تہنیت عیدین بودند بانعام تبریک مکرر سر احقر را از حضیض خاک باوج افلاک رسانیدند و ہمچنیں قلندر بخش جرأت کہ پس از فقیر بعد سہ چہار ماہ دولت ملازمتِ حضور حاصل نمودہ بنوازش خسروانہ در آمدہ و نیز نوکر شدہ و میر سوز کہ کسوتِ درویشی بہ قامت حال خود راست داشت در اوایل مشاعرہ بانعام یک دوشالہ و یک پٹو سرفرازی یافتہ راہ خود پیش گرفت و میر انشاء اللہ خاں کہ بہ نائب و مختار حضور یعنی خانصاحب قبلہ خان زاد خاں بہادر کہ ایشاں در شعر فہمی و نثر نویسی نظیر خود ندارند صیغۂ اخوت خواندہ اند، ہمیشہ مورد گونا گوں الطاف خسروی می باشند و چند بار بانعام لایقہ قبا و گوشوارۂ سر جواہرات بر افروختہ اند۔ حق تعالیٰ ایں قدر شناس شعرا را کہ دریں زمانہ دوں قدر سخن با خاک یکساں شدہ بر تخت سلطنت و جہانبانی زود مسلط گرداناد و مرادِ دل دولت خواہان حضور کہ شب و روز دست بر دعا دارند زود بر آرد۔ آں زماں بیانِ داد و دہش ہمت عالی کردہ خواہد شد حالا کلام معجز نظام حضرت نوشتہ می شود"

مصحفی نے اس تعلق پر فخر کیا ہے:-

پایۂ تخت سلیماں کا ہے شاعر مصحفی
ہے اسی کے خاتم دست سلیماں ہاتھ میں

یہ عہد ۱۲۰۱ھ کا ہے جب مصحفی کو میر انشاء اللہ کی وساطت سے اس دربار میں جگہ ملی۔

مصحفی کو دربار میں گئے ہوئے زیادہ زمانہ نہ گزرا تھا کہ درباری حسد و رشک رقابت و غمازیاں اپنا رنگ لائیں اور مختلف عیاریاں اور افترا پردازیاں مصحفی کو زک دینے کے لئے دربار میں استعمال ہونے لگیں اس عہد میں جرأت۔ مصحفی و انشا نے جس قدر شہرت پائی وہ کسی کو نصیب نہ ہوئی۔ انشا بلا کے ذہین تھے اور دنیا کی کوئی ایسی حرکت نہیں ہے جسے وہ شعر میں نہ ظاہر کر سکتے ہوں جس چیز کا نام تغزل ہے وہ اُن کے مقدر میں نہ تھی لیکن قسمت کے دھنی تھے۔

نواب سعادت علی خاں کے مزاج میں در خور تھا، مصحفی ایسے باکمال کی کچھ نہ چل سکی۔ انشا۔ جرأت۔ مصحفی۔ خواجہ تاش اور ہم پیشہ تھے اول اول شاعرانہ چشمک رہی بعد میں یہ رنگ جنگ و جدال اور فحش تک پہونچ گیا۔ ہزلیات میں مصحفی اور انشا نے وہ کیچڑ اُچھالی کہ تہذیب نے آنکھیں نیچی کر لیں حیا و غیرت نے پردہ کر لیا لیکن حیرتناک امر یہ ہے کہ نواب وزیر اور صاحب عالم نے بھی اس میں حصہ لیا اور لطف اندوز ہوئے اور شہر والوں کو ایک دل لگی ہاتھ آئی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ انشا اپنی طراری تیزی اور شوخی سے بازی لے گئے۔

ایسے باکمال شخص کے لئے یہ قطع تعلق بہت مفید ثابت ہوا مصحفی اپنی ہمہ گیر طبیعت کے لحاظ سے سودا تھے اور تغزل میں تو سودا سے بھی افضل - اس میں شک نہیں ہے کہ گو حکومت اودھ نے ان کی قدر نہ کی لیکن لکھنؤ کی شاعری ہمیشہ ان کی زیر بار احسان رہے گی کیونکہ جس قدر شاعران باکمال گزرے ہیں وہ سب مصحفی کے شاگرد یا اُنکے شاگردوں کے شاگرد تھے ناسخ اسی دبستاں کے پرورش یافتہ تھے۔ آتش نے یہیں فیض پایا۔ متاخرین میں اسیر، انیس، دبیر بھی سب اسی میخانہ سے سیراب ہو چکے تھے۔ دربار سے علٰحدگی شاعری و زبان اور ادب کے لئے ہر آئینہ مفید ثابت ہوئی اگر مصحفی دربار کی بھول بھلیوں میں پھنسے رہتے تو آج مورخ اُن کو وہ درجہ تاریخ ادب کے زندہ اوراق میں نہ دیتا جس کے وہ آج مستحق ہیں بلکہ ذوق کی طرح درباری ملک الشعراء کے عہدے سے متجاوز نہ ہوتے

اس میں شک نہیں کہ دنیاوی حیثیت سے مصحفی بدنصیب تھے لیکن شاگردوں کے معاملہ میں ان سے زیادہ خوش نصیب کوئی نظر نہیں آتا۔

مصحفی کے اُستاد ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے وہ مشاق اور پختہ گو شاعر تھے آٹھ دیوان۔ متعدد قصاید اور مثنویاں انھوں نے تصنیف کیں، علاوہ اس کے تین تذکرے اور دو بیاضیں اُن کی یادگار ہیں۔ تذکرے تو شائع ہو چکے ہیں لیکن بیاضوں کی اشاعت کی نوبت ابتک نہیں آئی تھی۔ ید بیضا غیر مسلم شعراء کا تذکرہ ہے۔ اسکی شان نزول مقدمہ میں خود مصحفی سے سنئے:۔

> "بتکلیف عزیز از جان لالہ کانجی مل صبا قوم کایتھ سکسینہ کہ وطن بزرگانش فیروز آباد و وجودش در لکھنؤ نشو نما یافتہ فرمائش تذکرہ ہنود نمودند، فقیر را ایامیکہ وارد ایں شہر بود چندے حسب اتفاق بر مجلسرائے ایشاں اقامت داشت مشارٌ الیہ دراں ایام بمقتضائے موزونی طبع شوق شعر پیدا کردہ شعرے کہ بر زبان خود می گفت آنرا بہ نظر فقیر باعتقاد تمام میگذرانید طبعش بخیال شعر بسیار مناسب افتادہ بود اگر عمرش وفا میکرد زیادہ ازیں قدم بجادہ ترقی می نہاد اما حیف کہ بہ عمر بست و پنج سالگی در عین عالم شباب مدقوق شدہ دیر گذشت و داغ حسرت بر دل باقی ماندگاں نہاد۔ الغرض شوق شعر ہندی دامن دلش را بحکم فرا گرفتہ طوعاً و کرہاً قدم دریں وادی پرخار گذاشت ...... و بقید حروف تہجی اسامی شعرائے ہنود ہمت گماشت"

جب یہ بیاض تیار ہو گئی تو صبا اس عالم میں نہ تھے لامحالہ مصحفی نے صاحب عالم مرزا سلیمان شکوہ کی خدمت میں پیش کی چنانچہ خاتمہ میں مصحفی لکھتے ہیں کہ:۔

> "بیاض ید بیضا را کہ از چند سال ناتمام افتادہ بود صاف نمودہ و احوال شعرائے جدید اضافہ کردہ بخدمت حضور پرنور مرشد زادہ آفاق پیش کردہ ...... امید کہ بہ نظر قبول حضور پرنور مرشدزادہ آفاق مرزا محمد سلیمان شکوہ بہادر

دام اقبالہ، در آمدہ مقبول دلہا کردہ"

اس کے ساتھ جو قطعات تاریخ شامل ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیاض یا تذکرہ ۱۲۰۳ھ میں پورا ہوا ہے۔ اس بیاض کی نقل مرزا حیدر علی گرم ولد مرزا نیاز علی بیگ شاہجہاں آبادی نے یہیں لکھنؤ میں کی اور پنڈت لمودھر کی فرمائش سے کی جو حویلی مرزا جنگلی میں رہتے تھے۔ اس کے بعد مرزا محمد علی بیگ نے جمادی الثانی ۱۲۳۶ھ میں کی۔

دوسرے تذکرہ کا نام "بیاض نورِ ازل" ہے۔ مسودہ کا دیباچہ جابجا سے بہت کرم خوردہ ہے، لیکن جتنا حصہ موجود ہے اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اُسوقت ضبط تحریر میں آیا ہے جب وہ تذکرۂ فارسی ختم کر چکے تھے۔ یہ تذکرہ انھوں نے "راجہ جسونت سنگھ پروانہ عرف کاکاجی، خلف الرشید راجہ بہادر راجہ بینی پرشاد" کی فرمائش پر لکھا جو نواب وزیر اودھ شجاع الدولہ کے "رکن رکین" تھے۔ اس تذکرہ میں حروف تہجی کے لحاظ سے "اسامی قدیم شعراء عہد فردوس آرامگاہ تا شعراء عصر" درج ہیں اور اس تذکرہ کا مقصود "استفادۂ امراء سلطنت و اہل دول" ظاہر کیا گیا ہے۔ یعنی اس میں صرف رؤساء، امراء اور اہل دول شعراء کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اس کی تاریخ تحریر ۱۲۰۹ھ ہے جیسا کہ مصحفی نے خود ہی لکھا ہے۔

سالِ او چوں زخود بپرسیدم یک ہزار و دوصد و نُہ بنوشت

اس کے اس تذکرہ کی نقل مرزا عابد حسین رزم ولد مرزا احمد حسین بزم نے ۱۲۱۷ھ میں کی۔ یہ یہیں لکھنؤ محلہ مفتی گنج کے رہنے والے تھے، دوسری نقل ۱۲۳۹ھ میں کسی صاحب احمد علی وفا نے کی اور تیسری کتب خانہ امیر محل کاکوری کے لئے محمد خلیل خاں نے اسی سال کی اور یہی نقل میرے سامنے ہے۔

تذکرۂ ید بیضا اس تذکرہ میں جیسا کہ پہلے ظاہر کیا گیا ہے صرف اُن ہندو شعراء کا حال اور انتخاب کلام درج ہے جو مصحفی کے زمانہ میں موجود تھے یا جن سے ان کی ملاقات تھی۔ اس میں ایسے ۴۵ شعراء کا نام پایا جاتا ہے۔ تذکرہ حروف تہجی کے لحاظ سے مرتب ہوا ہے۔ اور سب سے پہلا نام لالہ موہن لال کایستھ ساکن لکھنؤ کا ہے جو پہلے بیتاب اور پھر انیس تخلص کرنے لگے انتخاب کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف فارسی میں شعر کہتے تھے ان کے نو شعر انتخاب کئے ہیں، لیکن ان میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ دوسرا نام لالہ گوربخش ادیب کا ہے، یہ لالہ بینی پرشاد ظریف کے شاگرد تھے، لیکن بعد کو مصحفی سے اصلاح لینے لگے۔ چند دن کے بعد محمد علیؔ تنہا کے مشورہ کے مطابق مصحفی نے اصلاح دینا ترک کر دیا۔ یہ نواب سعادت علی خاں اور غازی الدین حیدر کے زمانہ میں تام جھام برداروں میں ملازم تھے لیکن بعد کو خزانہ میں محرر بنا دئے گئے۔ ان کے منتخب اشعار میں ایک شعر فارسی کا اچھا ہے:۔

مے عیش دو جہاں دفع ملالم نکند من کہ از مستیِ چشمِ تو خمارے دارم

اُردو کا بھی ایک شعر سن لیجئے :-

کوچہ سے اسکے اب کہیں اُٹھ جا تو اے ادیب   اس جا علاجِ عاشقِ بیمار کم ہوا

حرف ب میں صرف بیتاب، بہار اور بہجت تین تخلص نظر آتے ہیں پہلا تخلص لالہ مدن لال کایستھ کا ہے اور صرف دو شعر ان کے انتخاب کئے ہیں جو بہت معمولی ہیں، دوسرا تخلص مشہور فارسی گو شاعر لالہ ٹیک چند کا ہے جو آرزو کے شاگرد تھے ان کا صرف ایک معمولی شعر اُردو کا دیا ہے، تیسرا تخلص جکھن لال کایستھ کا ہے جو بلگرام کے رہنے والے اور حسرت شاہجہانپوری کے شاگرد تھے، ان کا کوئی شعر نہیں دیا۔

حرف پ میں پہلا نام رائے جسونت سنگھ پروانہ کا ہے جو راجہ بینی بہادر کے لڑکے تھے اور سروپ سنگھ دیوانہ کے شاگرد تھے، ان کی قابلیت کی بڑی تعریف کی ہے، لیکن فارسی کا صرف ایک شعر انتخاب میں دیا ہے، دوسرا تخلص پنچھا ہے، نام نہیں لکھا بلکہ صرف یہ تحریر کیا ہے کہ سوبھا رام طبیب کے صاحبزادے ہیں۔

حرف ت میں پہلا نام لالہ ٹیکا رام تسلی کا ہے۔ تسلی، رائے گوپال رائے بخش کے فرزند تھے۔ مصحفی نے ان کے اخلاق اور علم و فضل کی بڑی تعریف کی ہے۔ یہ فارسی شاعری میں مرزا فاخر مکین کے شاگرد تھے، اُردو میں بہت کم کہا لیکن جو کچھ کہا وہ مصحفی کے نگاہ سے گزرا۔ ان کے بارہ شعر نقل کئے ہیں جن میں دو یہ ہیں :-

اب بھی اس نیم جان میں کچھ ہے   فایدہ امتحان میں کچھ ہے
کیوں ستاتا ہے دیکھ تو پیارے   اس دلِ ناتوان میں کچھ ہے

تمنا کا کلام کچھ نہیں ہے، نومشق تھے اور مصحفی سے اصلاح لیتے تھے۔

حرف ح میں، تین شاعروں کا ذکر ہے حسرت، حریف اور حضور۔ حسرت کا نام ذوقی رام تھا قوم کے بقال تھے اور شاہجہاں آباد کے رہنے والے تھے۔ ان کی فارسی دانی کو مصحفی نے بہت سراہا ہے یہاں تک کہ فغانی، وحشی اور نظیری کا ہم پلہ قرار دیا ہے، لیکن انتخاب میں ایک شعر بھی نہیں دیا۔ حریف کا نام چینی لال تھا اور مصحفی سے تلمذ حاصل تھا۔ انتخاب میں نو شعر دئے ہیں لیکن بہت معمولی ہیں ۔ حضور کا نام لالہ بال مکند تھا اور خواجہ میر درد کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ ان کا ایک شعر ہے :-

وفا کو تم جفا سمجھے ستم کو ہم کرم سمجھے   اُدھر کچھ دل میں تم سمجھے ادھر کچھ دل میں ہم سمجھے

حرف خ میں صرف لالہ لچھمی رام خورشید کا ذکر کیا ہے، ان کے تین شعر فارسی کے دئے ہیں، ایک یہ ہے :-

خون شد از غم جگرِ من خبرے نیست ترا   نالہا کردم و در دل اثرے نیست ترا

حرف د میں صرف رائے سروپ سنگھ دیوانہ کا ذکر ہے، یہ قوم کے کھتری تھے اور بقول مصحفی "ہمیشہ فکر شعر ہندی" میں مصروف رہتے تھے، خواجہ میر درد کے خاص دوستوں میں تھے اور شاہجہاں آباد سے کسی برہمی کی بنا پر لکھنؤ چلے

آئے تھے، ان کے تین دیوان تھے اور مصحفی کے زمانہ میں یہاں "ان کا کوس لمن الملکی" بجتا تھا۔ انتخاب کوئی نہیں دیا

حرف ذ میں آسارام ذوق، شیو پرشاد ذوق اور ذہین کا ذکر ہے، معمولی شاعر تھے۔

حرف ر میں امام بخش رستم (پہلے ہندو تھے بعد کو مسلمان ہوگئے) اور آفتاب رائے رسوا کا ذکر کیا ہے اور

حرف ز میں گوبند رام زیرک، کنورجی زخمی کا ذکر ہے، زخمی قتیل کے شاگرد تھے اور فارسی شعر کہتے تھے لیکن معمولی

حرف س میں لچھمی رام سرور کا ذکر ہے یہ کشمیری تھے اور فارسی گو شاعر تھے۔

حرف ش میں رائے امر سنگھ شایق اور لالہ سیو رام شایق۔ اول الذکر شایق کا یہ شعر اچھا ہے:۔

ایک دل تھا مرے اسباب جہاں میں باقی سو بھی وہ سوختۂ آتشِ ہجراں نکلا

حرف ص میں صرف لالہ کانجی مل صبا کا ذکر کیا ہے، مصحفی جب لکھنؤ آئے تو اول اول انھیں کے مکان میں ٹھیرے تھے اور یہ تذکرہ ید بیضا انھیں کے اصرار سے مرتب کیا تھا۔ ان کے کلام میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔

اس کے بعد سلسلہ وار یہ نام پائے جاتے ہیں:۔

چھنو لال طرب۔ شیو سنگھ ظہور۔ لالہ ٹیکا رام ظفر (ان کی فارسی دانی کی مصحفی نے تعریف کی ہے) لالہ بینی پرشاد ظریف۔ رائے بھکاری داس عزیز۔ پریم کشور فراقی۔ بدھا دھر فصیح۔ ان میں سے کوئی اچھا شاعر نہ تھا۔

ان کے بعد قتیل کا ذکر ہے، لکھا ہے کہ ان کے بزرگ بٹالہ کے تھے جب قتیل فیض آباد گئے تو مرزا محمد باقر اصفہانی کے ہاتھ پر ۱۸ سال کی عمر میں مسلمان ہوئے اور مرزا محمد حسن کے نام سے مشہور ہوئے بعد کو امامیہ مذہب اختیار کر لیا اور نواب سعادت علی خاں کے دربار میں باریابی ہوئی، انکی فارسی دانی کی مصحفی نے بہت تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ دریائے لطافت کی ترتیب میں یہ انشاء کے شریک تھے۔ کلام کا نمونہ کوئی نہیں دیا۔ باقی شعراء کی فہرست یہ ہے:۔

کنور بہادر گریاں۔ لالہ جیا لال گلشن۔ بھوراسنگھ مشرب۔ انند رام مخلص۔ کشن چند مجروح۔ لالہ عوض رائے امسرت لالہ موجی رام موجی۔ رائے بشن ناتھ کے نواسے مجنوں۔ ایک کشمیری پنڈت مضطر۔ لالہ کنور سین مضطر۔ لالہ درگا پرشاد مضطرب ایک کشمیری پنڈت نصرت۔ لالہ گنگا سنگھ نادر۔ سنجاب رائے والی۔ ایک نوجوان کایستھ متخلص بہ وارفتہ۔ اور اسی نام پر یہ بیاض ختم ہو جاتی ہے۔

بیاضِ نورِ ازل جیسا کہ اس سے قبل ظاہر کیا گیا ہے یہ امراء اور اہل دولت کا تذکرہ ہے۔ اس میں ۱۴ شعراء کا ذکر کیا گیا ہے۔ خاص خاص یہ ہیں:۔

شاہ عالم بہادر بادشاہ غازی آفتاب۔ نواب آصف الدولہ۔ اور نظام الملک آصف جاہ، جو آصف تخلص کرتے تھے، ان کا ایک شعر فارسی کا نہایت پاکیزہ درج کیا ہے:۔

سحر خورشید لرزاں بر سر کوئے تو می آید دل آئینہ را نازم کہ بر روئے تو می آید

اور امراء یہ ہیں :-

نواب محمد یار خاں امیر، نواب علی محمد خاں کے صاحبزادے، حافظ رحمت اللہ خاں کی شکست کے بعد انکا انتقال ہوگیا نواب امین الدولہ معین الملک امیر - سید محمد خاں آگاہ، نواب مختار الدولہ بہادر نائب صوبہ دار اودھ کے بڑے بھائی امیر خاں نواب عمدۃ الملک انجام - ان کے یہ دو شعر فارسی کے نہایت پاکیزہ انتخاب میں آئے ہیں :-

براوجِ بیکسی ما پرِ ہما نرسد | رسیدہ ایم بجائے کہ کس بما نرسد

یار احوال دل از من پرسید | غنچۂ لالہ بدستش دادم

امین الدین خاں امین - سید علی حسین خاں اندوہ، صاحبزادہ نواب شمس الدولہ - نواب احمد جان خاں افسر، صاحبزادۂ نواب محمد یار خاں - کلب حسین خاں الطاف - نواب امداد علی خاں امداد - مرزا حسین علی خاں اثر - نواب اصغر علی خاں اعجاز - مرزا مظفر علی خاں بریاں - صاحبزادہ نواب احمد علی خاں شوکت جنگ - راجہ جسونت پروانہ جنکی فرمائش پر بیاض نورازل مرتب کی گئی - اسد اللہ رستم الملک مرزا محمد تقی - شاہزادۂ ولیعہد صاحب عالم جہاندار - مرزا علی نقی جنون، مرزا محمد تقی ہوس کے صاحبزادے - فخر الدین احمد خاں جعفر - نواب علی ابراہیم خاں جدت - نواب نصیر الدولہ رشید - نواب مہربان خاں رند - نواب مرزا احمد علی خاں شوکت جنگ سوزاں - مرشد زادہ مرزا محمد سلیمان شکوہ سلیماں - مرزا سیف علی خاں بہادر شگفتہ، صاحبزادۂ نواب شجاع الدولہ - نواب اصغر علی خاں شکیب - نواب جعفر علی خاں صادق - صمصام الدولہ خان دوراں بہادر صمصام - نواب ہدایت علی خاں ضمیر - شاہ عالم خاں عالم خلف الرشید نواب محبت خاں -

نواب اشرف علی خاں فغاں ان کے متعلق مصحفی لکھتے ہیں کہ "جب فقیر شاہجہاں آباد میں تھا تو وہ میر محمد نعیم اپنے ہم مکتب کی معرفت نواب شجاع الدولہ بہادر کی ملازمت میں داخل ہوئے - ایک دن نواب وزیر نے عالم اختلاط میں انکا ہاتھ بیسہ سے جلا دیا فغاں کی آنکھوں میں پانی بھر آیا لیکن کچھ نہ کہا اور آزردہ ہوکر عظیم آباد چلے گئے اور لالہ شتاب رائے کی سرکار میں ملازم ہوگئے، چند سال ہوئے وہیں انتقال بھی ہوا - ان کا ایک شعر یہ ہے :-

کیا پوچھتے ہو حال فغاں کا سنا نہیں | خانہ خراب عشق نے دنیا سے کھو دیا

نواب محبت خاں محبت، حافظ رحمت خاں کے صاحبزادے، ان کا ایک شعر ہے :-

جس کو تری آنکھوں سے سروکار رہیگا | بالفرض جیا بھی تو وہ بیمار رہے گا

نواب مرزا محمد تقی خاں ہوس، انکے متعلق مصحفی نے لکھا ہے "آپ کے بزرگ ہمیشہ ملوک و سلاطین کے مقرب رہے ہیں اور یہ خود نواب وزیر کے مشیر ہیں، پہلے میر حسن کے شاگرد تھے، انکی وفات کے بعد فقیر کو شرف اُستادی بخشا، انکی عمر ۵۰ سے متجاوز ہوگی ان کے علاوہ اور شعراء کا بھی ذکر ہے، لیکن اکثر و بیشتر نا تمام -

مشیر احمد علوی بی۔ اے۔

مصحفی کا ایک غیر مطبوعہ ترجیع بند

اے کہ صورت میں بنایا تجھے حق نے چوں ماہ — کیوں نہ دیکھے سے ترے ہووے فزوں نورِ نگاہ
اس کا مذکور ہے کیا قصۂ یوسف درچاہ — وصف کیجے تو ترے حُسن کے سبحان اللہ

گر بروئے تو زلیخا مژۂ وا می کرد
آنچہ در خواب ندید است تماشا می کرد

پر تعجب ہے کہ کچھ تجھ کو نہیں اپنی خبر — میری آنکھوں سے نہیں تجھ پہ پڑی تیری نظر
اس صفائی و صباحت پہ بھی اے رشکِ قمر — حُسن تیرا نہیں کرتا ہے ترے دل میں اثر

ہر نفس آئینہ می بینی و روے تابی
بندہ دارم عجب از تو کہ عجب در خوابی

ہے زبس جان مری حُسن ترا تو بر تو — دل کو زلفوں میں تری رکھتے ہیں زہاد گرو
تجھ تلک آکے میں پہونچا تو ہوں باصد تگ و دو — بیوفائی کو تری میں بھی ذرا دیکھوں تو

چارۂ کار من و دل بتوانی تا چند
حالِ من بشنوی و باز ندانی تا چند

جب سے پھینکی ہے تری کاکلِ مشکیں نے کمند — رہ گیا ہے یہ مرا آہوئے دل کر کے زغند،
اسی باعث سے مرے عزم کا گھوڑا جابند — مجھ سے یہ فعل عمل میں نہیں آیا ہر چند

ہر شب اندیشۂ دیگر کنم و رائے دگر
کہ من از دست تو فردا بروم جائے دگر

حال اپنا مجھے ہر دم بُرا آتا ہے نظر — اب یہ ڈر ہے کہ نہ ہو جائے کہیں اس سے بتر
بسترِ غم پہ پڑا رہتا ہوں با دیدۂ تر — غمِ فرقت میں غرض روز و شب و شام و سحر

سوز دم سینہ و دل تا کہ مرا جانے ہست
عشق بیدرد عجب آتشِ سوزانے ہست

اچھرا پھرتا ہے تو وہاں کوچہ و بازار کے بیچ — یہاں رمق بھی نہیں باقی ترے بیمار کے بیچ
جان کھپ جاتی ہو ہاں سچ ہے اس آزار کے بیچ — بیقرارانہ تری حسرت دیدار کے بیچ

شب کہ دل در گرویک نفسِ دیگر بود
بر نگاہم نفسِ ناز پس دیگر بود

حسرت آلودہ پھرے ہے مری آنکھوں میں نگاہ — نہ تو ہے نالہ کی قوت نہ رہی طاقت آہ
حالت نزع تو پہونچا ہوں میں اے غیرتِ ماہ — میرے احوال سے ابتک بھی نہیں تو آگاہ

چند گوئی کہ ترا در دل بیجا صل چیست
در دل من ہوس تست ترا در دل چیست

پوچھ مت حال مرا اے صنمِ بے پروا — حال ہو جائے گا تیرا متغیر بخدا
دل جفاؤں سے تری بسکہ بھرا ہے میرا — غیر اس کے نہیں کچھ میرے تئیں بن آتا

باز خواہم گلہ از جور تو بنیاد کنم
زیر دیوار تو بنشینم و فریاد کنم

بھیجتا ہے تو ہر اک شخص کو پیغام و سلام — میری قسمت میں نہیں لب سے ترے یک دشنام
الغرض عشق میں تیرے میں ہوا ہوں بدنام — قحط قاصد کا نہیں اس سے تو مت رکھ ناکام

از تو دشنام و عتابے چہ شود گر برسد
یا سلامے بہ جوابے چہ شود گر برسد

ہیں جفاؤں کے تری شہر میں آثار عیاں — ایسی خو پر تری ... ملایک ہے یہاں
نہ فقط میں ہی پڑا تڑپھوں ہوں ہر وقت یہاں — جس طرف دیکھیے کوئی نیک و بد و پیر و جواں

تا ز مژگان تو شورے بجہاں افتادست
بسملے بر سر ہر کوچہ طپاں افتادست

ڈر مری جان بتا دے مجھے کس کا ہے تجھے — دیر کرنی غرض اس امر میں بیجا ہے تجھے
تیغ خوش آب کی بیہودہ تمنا ہے تجھے — قتل کرنے کا مرے ہی جو ارادا ہے تجھے

سرِ من قابل شمشیر ستم نیست ترا
اب در خنجر مژگانِ تو ہم نیست ترا

ہے نظر بند مرے دیدۂ قربانی میں — تو نے جوں آئینہ رکھا مجھے حیرانی میں

ڈھونڈوں دل جمعیت دل کیونکہ پریشانی میں — اب تلک چیں پڑی ہے تری پیشانی میں

از من خستہ تو بیزاری و من میدانم

سر آزار دلم داری و من میدانم

گئی برباد ترے عشق میں سب دانائی — دے کے دل تجھ کو میں ناحق کو ہوا سودائی

تس پہ ہوں وصل سے محروم زہے رسوائی — تو پھر اب بھی میاں از رہ بے پروائی

شاد کے گردی اگر درد دلم گوش کنی

بشنوی بہ کہ کنی گوش و فراموش کنی

بسکہ صانع نے بنایا ہے تجھے رشک چمن — گل سے عارض ترے بہتر ہیں تو غنچہ سے دہن

نازکی ختم ہوئی تجھ پہ بس اے سیم بدن — نرم اندام تو اتنا ہے کہ جوں برگ سمن

ہمہ اعضائے تو نازک بود الّا دل تو

ماندہ سنگے دم ایجاد مگر در دل تو

چاند سے دور ہے کچھ اور ہے عالم تیرا — سچ ہے ایجاں مری تجھکو نہیں ہے پروا

حال درماندگی اپنی کا کہوں ہائے میں کیا، — کھو کے دل اپنا سر راہ میں تیری بیٹھا

زار مے گریم و از دل خبرے پیدا نیست

وہ کہ از گم شدۂ من اثرے پیدا نیست

ہم تو پھرتے ہیں تجھے ڈھونڈتے اے زہرہ جبیں — دن کہیں رات کہیں صبح کہیں شام کہیں

لیک ہم لوگوں کی پرواہ ہو کب تیرے تئیں — دردمند دل میں تو اپنے ہمیں کہتا ہی نہیں

چند شرح طلب و حرف تمنا گویم

تا کہ اش من بسر روئے تو تنہا گویم

کیا ہوا ہم سے جو راتوں کا وہ ملنا چھوٹا — کر دیا گردش گیتی نے تجھے ہم سے جدا

- - - - - - — تو سلامت رہے اس کا نہیں کچھ اندیشا

گر نہ بنیم بہ خلوت رخ چوں ماہ ترا

کے ازمانہ گرفت است سر راہ ترا

غیر کے ساتھ جلانے تو مجھے آتا ہے — میں ہی جانوں ہوں کڑھانے تو مجھے آتا ہے

اوپچی بن کے ستانے تو مجھے آتا ہے — غزہ کیا خوب منانے تو مجھے آتا ہے

خیر دیگر مینش فتنہ منگیز و برو
خویش را میکشم از دست تو برخیز و برو

میں نے مانا کہ بہت تجھ پہ ہوئے جور و ستم	تنگ آیا ہے تو اب تجھ میں نہیں تاب الم
جان جانے میں ترے اور ہے باقی کوئی دم	کوچہ یار میں تنہا ہو رہا صورت غم

چند سر بر سر زانو تہی اے دل برخیز
اینک اینک بسرت آمدہ قاتل برخیز

تھا تصور کا جو اُس شوخ کے میں دامنگیر	دل سے آتی ہے بصد رنگ زباں پہ تقریر
رو برو تھے مری آنکھوں کے اُسی کی تصویر	دیکھتا کیا ہوں میں ابتنے میں کہ وہ ماہ منیر

زلف آشفتہ رخے کردہ دمے خوردہ و مست
نیم شب بر سر بالیں من آمد بہ نشست

شب کی صحبت کا کہوں یار دمیں اب کیا احوال	آج تک ہے اُسی صحبت کا مرے دلمیں ملال
وصل کو اس کے سمجھتا تھا میں ہر چند محال	بر میسر جو ہوا - - - - - - - خیال

دست شوقے بہ کشیدیم کہ یار از در رفت
گُل مقصود نچیدیم و بہار از در رفت

پس دیوار میں اب اس کے جو جا کرتا ہوں	طرف غرفہ و روزن ہی تکا کرتا ہوں
اپنی خواری پہ نظر پھر جو ذرا کرتا ہوں	بھر کے اک آہ ابھی شعر پڑھا کرتا ہوں

یاد روزے کہ دلم طالب دیدار نبود
منتے بر سرش از سایۂ دیوار نبود

میں تو خواہندہ نہ تھا حشمت کاؤسی کا	تھا مجھے فکر سدا اپنی ہی محبوسی کا
رہگیا شوق سو وہ دل میں قدم بوسی کا	ہمنشیں پوچھ نہ قصہ مری مایوسی کا

از در دوست چہ گویم بچہ عنواں رفتم
ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم

تھا ازیں پیش تو میں عاشق رسوا مشہور	یاد کرتے ہیں ہر اک بزم میں میرا مذکور
ہو چکا کب سے سو یہ شیشۂ دل چکنا چور	مجھ کو ان باتوں کے سننے کا نہیں اب مقدور

دوستاں از تپش عشق کباب مکنید
مکنید ایں سخن و خانہ خرابم مکنید

ہم دل آزردوں کو کیا سیرِ چمن سے سروکار
گو بصد رنگ دگر پھولے پھلے یہ گلزار
فایدہ کیا ہے جو تم کرتے ہو ایسے اصرار
مگر اس بات سے واقف نہیں ایامِ بہار

عہد کردیم کہ بے دوست بہ صحرا نہ رویم
بے تماشا گہ رویش بہ تماشا نہ رویم

دل دیوانہ نہ سمجھا مرے سمجھانے سے
فیض پایا نہ کچھ اپنے سے نہ بیگانے سے
شہر میں نومید ہے ویرانے سے
مصحفی کچھ نہ ہوا کعبہ سے تبخانے سے

حالیا مصلحت خویش دراں مے بینم
کہ کشم رخت بہ میخانہ و خوش بہ نشینم

اس مسدس کے لکھنے کے بعد یہ کہنا کچھ غیر ضروری سا ہوگا کہ آج اسقدر زمانہ گزرنے پر بھی اس کا ایک ایک لفظ اپنی جگہ پر ایک ترشا ہوا نگینہ معلوم ہوتا ہے اور یہ صفت اُن کے تمام معاصرین سے اُن کو ممتاز بنا دیتی ہے کہ اتنی طویل نظم کا ایک شعر بھی آج تک بدلنے کے قابل نہیں ہے۔ ان کے مقابلہ میں انکے دوسرے معاصرین کو لیجئے تو اُن کے مختصر سے مختصر کلام میں بھی بندش کی قدامت کو نظر انداز کرنے پر بھی دو چار لفظ ایسے نظر آجائیں گے جو آج زبان میں داخل نہیں۔

ہوش ملیح آبادی

انتخاب کلام مطبوعۂ مصحفی

کئی دن مصحفی ہمسائے تک سکھ نیند سوئے تھے ‏ ‏ ‏ کیا نالوں نے تیرے پھر بپا ہنگامہ محشر کا
میں اسی رشک سے مرتا ہوں کہ کل غیر نے ہائے ‏ ‏ ‏ ہاتھ ہنگام قسم کیوں ترے سر پر رکھا
جھڑ پڑا داغ چمن میں جو کوئی لالے کا ‏ ‏ ‏ ہم نے وہ داغ اُٹھا اپنے جگر پر رکھا
مصحفی چاہئے کیا پھر اُسے اُٹھ چلنے کو ‏ ‏ ‏ جس مسافر نے کہ دل اپنا سفر پر رکھا
تیرے بیٹھے جو ہمیں یاد بھی آیا کوئی کام ‏ ‏ ‏ ہم نے موقوف اُسے وقت دگر پر رکھا

آج کچھ سینہ میں دل ہے خود بخود بیتاب سا ‏ ‏ ‏ کر رہا ہے بیقراری پارۂ سیماب سا
جون گل ترکیا ہے اُس سے جھلکے ہے اُس کا بدن ‏ ‏ ‏ وہ جو پیراہن گلے میں اُسکے ہے اک آب سا
میں ہوں اور خلوت ہی اور پیش نظر معشوق ہے ‏ ‏ ‏ ہے تو بیداری ولے کچھ دیکھتا ہوں خواب سا
کل شب تاریک میں جوں ہی ہوا وہ بے نقاب ‏ ‏ ‏ جلوہ گر روئے زمیں پر ہو گیا مہتاب سا

کیا جانے کیا کرے گا یہ دیدار دیکھنا ‏ ‏ ‏ ایکدن میں آئینہ اُسے سو بار دیکھنا

خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا ‏ ‏ ‏ ہجر تھا یا وصال تھا کیا تھا

وصل میں ایسے سے ڈھونڈھے کوئی کیونکر واشد ‏ ‏ ‏ جن نے سو ناز سے اک بند قبا باز کیا
ملنے کا اُس کے ہم نے ذرا قصد جب کیا ‏ ‏ ‏ سو ناتوانیوں نے ہمیں جاں بلب کیا
اے مصحفی وہ دم میں نہیں اپنا آشنا ‏ ‏ ‏ تو نے جو اُس کو راہ میں ٹوکا غضب کیا

اسکو منظور یاں نہ آنا تھا ‏ ‏ ‏ تپ کا آنا بھی اک بہانہ تھا
یاد ایام بیقراری دل، ‏ ‏ ‏ وہ بھی یارب عجب زمانہ تھا

ہم سمجھتے تھے جس کو مصحفی یار ‏ ‏ ‏ وہ خانہ خراب کچھ نہ نکلا

یہ چاک گریباں تو داماں سے گزرا ‏ ‏ ‏ میں شوریدہ ایسے گریباں سے گذرا
اگر درد دل میں یہ لذت ہے یارو ‏ ‏ ‏ تو میں ان طبیبوں کے درماں سے گذرا

ملزم تری باتوں سے ہمیں آپ ہی ہونا
اور تجھ کو کسی بات میں الزام نہ دینا

کنج قفس میں جو کوئی مر گیا
ظلم بیاران دگر کر گیا
مصحفی کو دیکھتے تھے ہم بھی رات
جب وہ تیری بزم میں چھپ کر گیا

شمع صفت مصحفی اس بزم میں
جوں بنی ووں عمر بسر کر گیا
دل نہ لگا اُس کا کہیں ایک بار
جو تیرے کوچے سے گزر کر گیا
پیار تو آیا تھا مرے جی میں رات
پر میں تری وضع سے ڈر کر گیا

دل رات نپٹ غم سے ترے نالہ کناں تھا
سچ کہہ تو مری جان کے دشمن تو کہاں تھا
سوجھا نہ ہمیں خاک بھی کچھ بے بصری سے
یہاں ورنہ ہر ایک ذرے میں خورشید عیاں تھا
ایسا ہی گیا جلد کہ پھر منہ نہ دکھایا
وہ سروِ رواں اپنی مگر عمر رواں تھا
جی دینے میں صرفہ نہ کیا ہم نے کسی سے
ہر چند کہ اسبات میں اپنا ہی زیاں تھا
ہم سے خبر مصحفی خستہ نہ پوچھو
تم آپ ہی سوچو نہ میاں دلمیں کہاں تھا

کب میں نے کہا تو مجھے دیدار دکھا جا
ٹک آکے پس پردہ سے آواز سُنا جا
اے مصحفی گردن کشی اُس شوخ سے مت کر
جب کھینچے وہ تلوار تو گردن کو جھکا جا

جس کے نہ لگا زخم تری کج نظری کا
کیا ہووے الم اُس کو خراش جگری کا
کل قافلۂ نکہت گل ہوگا روانہ
مت چھوڑیو تو ساتھ نسیم سحری کا
ہے جی میں کہ یک چند خبر اپنی نہ لیجے
کہتے ہیں کہ عالم ہے عجب بیخبری کا

حادثے ہوتے تھے زمانے میں
اس قدر انقلاب کس دن تھا
مصحفی آج تو قیامت ہے
دل کو یہ اضطراب کس دن تھا

بھٹکا پھرے ہے تیرے دل اک ادا کا مارا
کہہ کس طرف کو جاوے اب یہ خدا کا مارا
کل مصحفی کو میں نے کوچہ میں اُسکے دیکھا
ٹکڑے ہوا پڑا تھا تیغ جفا کا مارا

ہرگز نہ رکا ہاتھ میرا جامہ دری سے
اک چاک نیا روز گریبان میں دیکھا
اے مصحفی افسوس کہاں تھا تو دیوانے
کل اُس کے تئیں ہم نے عجب آن میں دیکھا

تیغ قاتل کو میں کیوں ہاتھ پہ روکا افسوس
مصحفی میرے تئیں سینہ سپر کرنا تھا

اک برق کا سا جھمکا اس مہ لقا سے دیکھا
میں کیا کہوں کہ اس کو کل کس ادا سے دیکھا

معالج ہو سکے اب کیا کوئی غمخوار رونے کا
کہ ان آنکھوں کو اک مدت سے ہے آزار رونیکا

ہنسی آتی ہے تیری بات پر اے مصحفی مجھکو
نہ کر تو ذکر میرے روبرو ہر بار رونے کا

کل میں جو راہ میں اُسسے پہچان رہ گیا
کچھ وہ بھی مجھ کو دیکھ کے حیران رہ گیا

تجھے اے مصحفی کب ہے خبر درد محبت سے
نہ لے تو آگے میرے نام اے بیدرد درماں کا

ساقی شراب لایا مطرب رباب لایا
مجھ پر تو ایک قیامت عہد شباب لایا

افشائے عشق بعد خدا جانے کیا بنے
جب تک حجاب تھا یہی امید و بیم تھا

جس دم کہ وہ کمر میں رکھ کر کٹار نکلا
جس رہگذر سے نکلا عالم کو مار نکلا

تہمت ہے مصحفی پہ سیر چمن کی یارو
کب گھر سے اپنے باہر وہ سوگوار نکلا

دل سے خبر نہیں ہے مجھے اُس کی مصحفی
آنکھوں میں تو اشارہ کئی بار ہوگیا

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم
تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

منھ پھیرا کر جب چلا وہ مجھ سے ہنگام وداع
اُس کے چہرے پر میں حسرت کی نظر کر رہ گیا

غم تیرا دل میں میرے پھر آگ سلگانے لگا
پھر دھواں سا اس سے کچھ اُٹھتا نظر آنے لگا

عشق کے صدمے اُٹھائے ہیں بہت پر کیا کہیں
اب تو ان صدموں سے کچھ جی اپنا گھبرانے لگا

دیکھتے ہی اُس کے کچھ اُس کی یہ حالت ہوگئی
جو مجھے سمجھائے تھا میں اُس کو سمجھانے لگا

یا وہ عالم تھا کہ کوئی اُس سے واقف ہی نہ تھا
یا یہ عالم ہے کہ عالم اُس پہ مرجانے لگا

کان میں قاصد نے کچھ ایسا ہی آکر کہدیا
جس کو سنکر سر میں دیواروں سے ٹکرانے لگا

پاس میرے وہ تیرا پیار سے آنا نرہا
وہ محبت نہ رہی اور وہ زمانہ نرہا

مصحفی کا نہ نشاں پوچھ کہ مدت ہوئی میاں
پائنیتی گھس گئی تربت کا سرہانا نرہا

مصحفی گرچہ خفا ہم سے وہ رہتا ہے دلے
ذکر آجائے ہے اس بزم میں اکثر اپنا

مصحفی عشق کی وادی میں سمجھ کر جانا
آدمی جائے ہے اس راہ میں اکثر مارا

اے مصحفی کیوں ہوتا ہے اب گریہ کا منکر
اُس کے پس دیوار تو شب رو نہ رہا تھا

انگڑائی لیکر اپنا مجھ پر خمار ڈالا
کافر کی اس ادا نے بس مجھ کو مار ڈالا

مصحفی ڈر ہے کہ رسوا نہ کرے مجھ کو کہیں
اس کے کوچے میں یہ ہر وقت کا جانا تیرا

فغان بانگ جرس تھی نہ ایسی درد آمیز
قضائے قافلہ کوئی تو بیقرار رہا

چھپ چھپ کے وہ گھر غیر کے مہمان گیا تھا
چوری کی نظر میں وہیں پہچان گیا تھا

کیا یار کے دامن کی خبر پوچھو ہو ہم سے
یہاں ہاتھ سے اپنا ہی گریبان گیا تھا

میں عجب یہ رسم دیکھی کہ بروز عید قرباں
وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب اُلٹا

بھیگے سے تیرا رنگِ حنا اور بھی چمکا
پانی میں نگارین کفِ پا اور بھی چمکا

جوں جوں کہ پڑیں منھ پہ ترے مینھ کی بوندیں
جوں لالۂ تر حُسن ترا اور بھی چمکا

تیرے کوچے اس بہانے مجھے دن کو رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا کبھی اُس سے بات کرنا

سحر ہے رخ پہ ترے زلفوں کی بل کھانے کی طرح
سیکھے کوئی تجھ سے پیارے دل کے لبھانیکی طرح

کل جو رستے میں وہ ناگہ ملگیا تھی دیدنی
میرے رہ جانے کی وضع اور اُسکے رکجانیکی طرح

شب ایک جھلک دکھا کر وہ مہ چلا گیا تھا
ابتک وہی سماں ہے غرفے کی جالیوں پر

آتے تھے پاس تیرے جو دوڑ دوڑ ہردم
کم بخت دل کے ہاتھوں بے اختیار تھے ہم

پھٹ چکا جب سے گریباں تب سے
ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں

شیشۂ مے کی طرح اے ساقی
چھیڑ مت ہم کو بھرے بیٹھے ہیں

اسواسطے فرقت میں جیتا مجھے رکھا ہے
یعنی میں تیری صورت جب یاد کروں رو دوں

بن دیکھے جس کی پل میں آنکھیں بھر آئیاں ہوں
کیا قہر ہے جو اُس سے برسوں جدائیاں ہوں

ہم تو اُس کوچے میں گھبرا کے چلے آتے ہیں
دو قدم جاتے ہیں پھر جا کے چلے آتے ہیں

وہ جو ملتا نہیں ہم اُس کی گلی میں دل کو
در و دیوار سے بہلا کے چلے آتے ہیں

آستین اُس نے جو کہنی تک چڑھائی وقت صبح
آ رہی سارے بدن کی بے حجابی ہاتھ میں

جی میں آتا ہے کہ بوسہ کفِ پا کا لے لوں
رنگ ہونٹوں پہ ترے تازہ حنا کا لے لوں

رہنے دو میرے سینے میں پیکاں کو نہ چھیڑو
از بہر خدا ناوک جاناں کو نہ چھیڑو

ٹک رحم کرو چاک گریبان پہ میرے
یارو کوئی اُس شوخ کے داماں کو نہ چھیڑو

روٹھا ہوں جو میں اُس سے تو من لونگا پھر آپ ہی
جاؤ کوئی مجھ تازہ پشیماں کو نہ چھیڑو

رہنے دو پڑا مصحفی اس خاک بسر کو
اس غمزدۂ بے سر و ساماں کو نہ چھیڑو

کیا نظر پڑ گئیں وہ چشم خمار آلودہ
شفق صبح تو ہے زور بہار آلودہ

ایک دن رو کے نکالی تھی وہاں کلفت دل
اب تلک دامن صحرا ہے غبار آلودہ

اُٹھنے سے تیرے شور قیامت بھی گیا بیٹھ
اے فتنۂ برخاستہ از بہر خدا بیٹھ

کیا ہم نہیں پہچانتے یہ ساختہ صورت
غصہ سے ٹک ایک اور بھی تو منھ کو بنا بیٹھ

کھینچکر تیغ یار آیا ہے
اس گھڑی سر جھکا دے ہی بنی

یار کا صبح پر ہے وعدۂ وصل
ایک شب اور بھی جیے ہی بنی

نہ کہیں صبح ہی ہوتی ہے نہ خواب آتا ہے
رات کیا آتی ہے اک مجھ پہ عذاب آتا ہے

میں ترے واسطے سر پٹکوں ہوں دیواروں سے
چین کس طرح تجھے خانہ خراب آتا ہے

مصحفی کے بھی کچھ احوال سے ہے تجھ کو خبر
روز اس کوچے میں باچشم پر آب آتا ہے

کون آیا ہے نہانے لطف بدن نے کس کے
لہروں سے سارا دریا آغوش کر دیا ہے

گر ابر گھرا ہوا کھڑا ہے
آنسو بھی تلا ہوا کھڑا ہے

حیران ہے کس کا جو سمندر
مدت سے رُکا ہوا کھڑا ہے

اے جان نکل کہ مصحفی کا
اسباب لدا ہوا کھڑا ہے

اُس کی رفتار کا مذکور جب آجاتا ہے
جی کی ہوتی ہے یہ حالت کہ رندھا جاتا ہے

اے مصحفی نہ ہم نے رونے سے پائی فرصت
آنکھوں پہ ہاتھ رکھے گر آستیں اُٹھا لی

تو دیکھتے ہی اُس کو جو دیوانہ ہوگیا
سچ کہیو مصحفی ترے کیا جی میں آگئی

شب وہ ان آنکھوں کو شغل اشکباری دے گئے
لے گئے خواب اُنکا اور اختر شماری دے گئے

خطرا ہے مجھے اس دل کمبخت کی خو سے
ڈرتا ہوں کہ ہو جائے محبت نہ کسو سے

کبھی روئے کبھی پیٹے شب تنہائی میں
ہمکو ساتھ اپنے عجب طرح کی صحبت گزری

از بسکہ میری دیدۂ حیران میں کچھ ہے
ایک آن میں دل کچھ ہے تو اک آن میں کچھ ہے

جادو تو میں کہتا نہیں پر سمجھوں ہوں اتنا
واللہ تیری نرگسِ فتان میں کچھ ہے

جانے کا نہ لے نام کہ مر جائے گا کوئی
بیدرد ابھی جی سے گزر جائے گا کوئی

اُٹھتے تو ہیں یہ مجلسیاں پر میں ہوں حیراں
مجلس سے تری اُٹھ کے کدھر جائے گا کوئی

گل کو نسبت ہے اسی واسطے یا اہل جنوں
وضع میں اُس کی جو ایک جامہ دری نکلے ہے

کبھو تک کے در کو کھڑے رہے کبھو آہ بھر کے چلے گئے
ترے کوچے میں گر آئے بھی تو ٹھہر ٹھہر کے چلے گئے

شاہد رہیو تو اے شب ہجر
جھپکی نہیں آنکھ مصحفی کی

نہیں معلوم کہ کیا نام ہے اُس کا لیکن
کوئی اُس کوچے میں اک آہ تو بھر جاتا ہے

دیکھ اُس کو ایک آہ ہم نے کر لی
حسرت سے نگاہ ہم نے کر لی

درد و غم کو بھی ہے نصیبا شرط
یہ بھی قسمت سوا نہیں ملتا

اور سب کچھ جہاں میں ملتا ہے
لیکن اک آشنا نہیں ملتا

جی رات لبوں پہ آ رہا تھا — مرنے میں ہمارے کیا رہا تھا

ایسا بھی اتفاق زمانے میں کم ہوا — قاصد کو موت آ گئی جو نامہ رقم ہوا

سادہ لباس پہنا زیور اُتار رکھا — اس سادگی پہ تم نے لاکھوں کو مار رکھا

تو ملے یا نہ ملے اس سے تو کچھ کام نہیں — ہم کو کوچے میں ترے روز میاں ہو جانا

قصد کرتا ہوں جو اس در سے کہیں جانے کا — دل یہ کہتا ہے تو جا۔ میں تو نہیں جانے کا

کیا یار کے دامن کی خبر پوچھو ہو مجھ سے — یاں ہاتھ سے اپنا ہی گریبان گیا تھا

بہار آئی خدا جانے کہ کیا گزری اسیروں پر — نہیں معلوم کچھ اب کی برس احوال زنداں کا

ظالم دیار دل کا تجھے پاس ہے ضرور — ویران ہوا یہ گھر تو بسایا نہ جائے گا

میں اسی رشک سے مرتا ہوں کہ کل غیر نے ہائے — ہاتھ ہنگام قسم کیوں ترے سر پر رکھا

خیالِ یار مرا شب جو ہمکنار رہا — تمام شب میں اسی کے گلے کا ہار رہا

کافری عام ہوئی ہے یہ ترے عہد میں شوخ — ڈھونڈھیں کعبے میں تو ہووے نہ مسلماں پیدا

مے ٹپکی ہی پڑتی ہے آنکھوں سے ترے کافر — تو آج بہت ہم کو سرشار نظر آیا

جو سیر کرنی ہے کر لے کہ جب خزاں آئی — نہ گل رہے گا چمن میں نہ خار ٹھہرے گا

کب شب وصل وہ آیا کہ مرے اور اس کے — درمیاں میں شب ہجراں کا فسانہ نہ رہا

رکھا نہ خاک مصحفی کو — آرام تمام ہو چکا اب

متہم ہو گئے میاں مصحفی ان باتوں میں — کوچۂ یار میں ہر وقت کا جانا نہیں خوب

آنے کی تیری کہہ کے مرا دل تو خوش کیا — قاصد نے گو کہ اپنی طرف سے بنائی بات

کیا خطا مجھ سے ہوئی رات کو اُس کافر کا — میں نے خود چھوڑ دیا ہاتھ میں داماں لیکر

تھا سرخ پوش وہ گل شاید چمن کے اندر — شعلہ سا شب پھرے تھا سر دشمن کے اندر

وہی ٹھوکر ہے اور وہی انداز — اپنی چالوں سے تو نہ آیا باز

دیکھا تھا ایک دن کہیں اس گل کو باغ میں — آوارۂ چمن ہے نسیم و صبا ہنوز

ہم اسیران قفس لطف چمن کیا جانیں — کون لیجاتا ہے ہم کو گل و گلزار کے پاس

آ جائے ہے جب وہ سامنے سے — ہو جائے ہے سب گلا فراموش

ایسے سے داد خواہی محشر میں پھر ستم ہے — ہر ایک غمزہ جس کا ہو خونبہائے عالم

دو چار قدم جا کے پھر آتے ہیں ہمیشہ — رہتا ہے نیا روز سفر اُس کی گلی میں

یار کا صبح پر ہے وعدۂ وصل
ایک شب اور بھی سہی جئے ہی بنی

نہ کہیں صبح ہی ہوتی ہے نہ خواب آتا ہے
رات کیا آتی ہے اک مجھ پہ عذاب آتا ہے

میں تیرے واسطے سر پٹکوں ہوں دیواروں سے
چین کس طرح تجھے خانہ خراب آتا ہے

مصحفی کے بھی کچھ احوال سے ہے تجھ کو خبر
روز اس کوچے میں باچشم پر آب آتا ہے

کون آیا ہے نہانے لطف بدن نے کس کے
لہروں سے سارا دریا آغوش کر دیا ہے

گر ابر گھرا ہوا کھڑا ہے
آنسو بھی تلا ہوا کھڑا ہے

حیران ہے کس کا جو سمندر
مدت سے رُکا ہوا کھڑا ہے

اے جان نکل کہ مصحفی کا
اسباب لدا ہوا کھڑا ہے

اُس کی رفتار کا مذکور جب آجاتا ہے
جی کی ہوتی ہے یہ حالت کہ رندھا جاتا ہے

اے مصحفی نہ ہم نے رونے سے پائی فرصت
آنکھوں پہ ہاتھ رکھے گر آستیں اُٹھا لی

تو دیکھتے ہی اُس کو جو دیوانہ ہو گیا
سچ کہیو مصحفی تیرے کیا جی میں آ گئی

شب وہ ان آنکھوں کو شغل اشکباری دے گئے
لے گئے خواب اُنکا اور اختر شماری دے گئے

خطرا ہے مجھے اس دل کمبخت کی خو سے
ڈرتا ہوں کہ ہو جائے محبت نہ کسو سے

کبھی روئے کبھی پیٹے شب تنہائی میں
ہمکو ساتھ اپنے عجب طرح کی صحبت گزری

از بسکہ میری دیدۂ حیران میں کچھ ہے
ایک آن میں دل کچھ ہے تو اک آن میں کچھ ہے

جادو تو میں کہتا نہیں پر سمجھوں ہوں اتنا
واللہ تیری نرگسِ فتان میں کچھ ہے

جانے کا نہ لے نام کہ مر جائے گا کوئی
بیدرد ابھی جی سے گزر جائے گا کوئی

اُٹھتے تو ہیں یہ مجلسیاں پر میں ہوں حیراں
مجلس سے تری اُٹھ کے کدھر جائے گا کوئی

گل کو نسبت ہے اسی واسطے یا اہل جنوں
وضع میں اُس کی جو ایک جامہ دری نکلے ہے

کبھو تک کے در کو کھڑے رہے کبھو آہ بھر کے چلے گئے
ترے کوچہ میں اگر آئے بھی تو ٹھہر ٹھہر کے چلے گئے

شاہد رہیو تو اے شب ہجر
جھپکی نہیں آنکھ مصحفی کی

نہیں معلوم کہ کیا نام ہے اُس کا لیکن
کوئی اُس کوچہ میں اک آہ تو بھر جاتا ہے

دیکھ اُس کو ایک آہ ہم نے کر لی
حسرت سے نگاہ ہم نے کر لی

درد و غم کو بھی ہے نصیبا شرط
یہ بھی قسمت سوا نہیں ملتا

اور سب کچھ جہاں میں ملتا ہے
لیکن اک آشنا نہیں ملتا

جی رات لبوں پہ آرہا تھا
مرنے میں ہمارے کیا رہا تھا

ایسا بھی اتفاق زمانے میں کم ہوا
قاصد کو موت آگئی جو نامہ رقم ہوا

سادہ لباس پہنا زیور اُتار رکھا
اس سادگی پہ تم نے لاکھوں کو مار رکھا

تو ملے یا نہ ملے اس سے تو کچھ کام نہیں
ہم کو کوچے میں ترے روز میاں ہو جانا

قصد کرتا ہوں جو اس در سے کہیں جانے کا
دل یہ کہتا ہے تو جا۔ میں تو نہیں جانے کا

کیا یار کے دامن کی خبر پوچھو ہو مجھ سے
یاں ہاتھ سے اپنا ہی گریبان گیا تھا

بہار آئی خدا جانے کہ کیا گزری اسیروں پر
نہیں معلوم کچھ اب کی برس احوال زنداں کا

ظالم دیار دل کا تجھے پاس ہے ضرور
ویران ہوا یہ گھر تو بسایا نہ جائے گا

میں اسی رشک سے مرتا ہوں کہ کل غیر نے ہائے
ہاتھ ہنگام قسم کیوں ترے سر پر رکھا

خیالِ یار مرا شب جو ہمکنار رہا
تمام شب میں اسی کے گلے کا ہار رہا

کافری عام ہوئی ہے یہ ترے عہد میں شوخ
ڈھونڈھیں کعبے میں تو ہو وے نہ مسلماں پیدا

مے ٹپکی ہی پڑتی ہے آنکھوں سے ترے کافر
تو آج بہت ہم کو سرشار نظر آیا

جو سیر کرنی ہے کرلے کہ جب خزاں آئی
نہ گل رہے گا چمن میں نہ خار ٹھہرے گا

کب شب وصل وہ آیا کہ مرے اور اس کے
درمیاں میں شب ہجراں کا فسانہ نہ رہا

رکھا تہ خاک مصحفی کو
آرام تمام ہو چکا اب

متہم ہو گئے میاں مصحفی ان باتوں میں
کوچۂ یار میں ہر وقت کا جانا نہیں خوب

آنے کی تیری کہہ کے مرا دل تو خوش کیا
قاصد نے گو کہ اپنی طرف سے بنائی بات

کیا خطا مجھ سے ہوئی رات کو اُس کافر کا
میں نے خود چھوڑ دیا ہاتھ میں داماں لیکر

تھا سرخ پوش وہ گل شاید چمن کے اندر
شعلہ سا شب پھرے تھا سر دشمن سے اندر

وہی ٹھوکر ہے اور وہی انداز
اپنی چالوں سے تو نہ آیا باز

دیکھا تھا ایکدن کہیں اس گل کو باغ میں
آوارۂ چمن ہے نسیم و صبا ہنوز

ہم اسیران قفس لطف چمن کیا جانیں
کون لیجاتا ہے ہم کو گل و گلزار کے پاس

آجائے ہے جب وہ سامنے سے
ہو جائے ہے سب گلا فراموش

ایسے سے داد خواہی محشر میں پھر ستم ہے
ہر ایک غمزہ جس کا ہو خونبہائے عالم

دو چار قدم جا کے پھر آتے ہیں ہمیشہ
رہتا ہے نیا روز سفر اُس کی گلی میں

اے مصحفی میں روؤں کیا اگلی صحبتوں کو — بن بن کے کھیل ایسے لاکھوں بگڑ گئے ہیں
وہی دشت اور وہی گریباں چاک — جب تلک ہاتھ پاؤں چلتے ہیں،
جس بیابان خطرناک سے اپنا ہے گزر — مصحفی قافلے اس راہ سے کم نکلے ہیں
کٹتی نہیں رات بیکسی کی — کیا جانے کوئی کسی کے جی کی
تو دیکھے تو اک نظر بہت ہے — اُلفت تری اس قدر بہت ہے
حسرت پہ اُس مسافر بیکس کے رویئے — جو تھک گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے
ہے غریبی میں خبر کس کو وطن والوں کی — کیا گرفتارِ سے پوچھو ہو چمن والوں کی
کس بہانے سے ترے در تلک آئے کوئی — اور جو آئے بھی تو کیا بات بنائے کوئی
راہ میں کشتہ پڑے ہیں کئی ارمان بھرے — بچکے چلیو نہ ترا خون میں دامان بھرے
میں وہ نہیں ہوں جو اس بُت سے دل مرا پھر جائے — پھروں جو اس سے تو مجھ سے مرا خدا پھر جائے
خالی ہی چلے آتے ہیں ہم سیرِ چمن سے — داماں میں کچھ ہے نہ گریباں میں کچھ ہے
حالتِ عاشق شوریدہ ہے عبرت کی جگہ — کوئی دنیا میں پریشان نہو اتنا بھی
کیا کہوں کیسی خرابی میں ہوں میں یار بغیر — گھر کسی شخص کا سنسان نہو اتنا بھی
مری حالت سے جا کر یوں کرے اس کو خبر کوئی — کہ روتا ہے کھڑا تیرے لئے بیرونِ در کوئی

کب دردِ جگر مجھ کو بے تاب نہیں کرتا — کب ہوک کلیجے سے اک بار نہیں اُٹھتی
برقِ رخسارِ یار کیسی چمکی — اس چمن کی بہار پھر چمکی
دیکھیو پاؤں رکھ دیا کس نے — آج کیوں نوکِ خار پھر چمکی
کون اس باغ سے اے بادِ صبا جاتا ہے — رنگِ رخسار سے پھولوں کا اُڑا جاتا ہے
مصحفی عشق کی وادی میں گزر ہے کس کا — بھولا بھٹکا کوئی ادھر کو بھی آجاتا ہے
ہمتواے غیرتِ لیلیٰ تری خاطر اب تک — قیس کی طرح پڑے پھرتے ہیں بن بن مارے
شاہد رہیو تو اے شبِ ہجر — جھپکی نہیں آنکھ مصحفی کی

اڈیٹر

انتخاب کلام غیر مطبوعۂ مصحفی

نت جالی سے برقعے کے چھن چھن کے کرے جلوہ　　منہ تم نے چھپایا تو لیکن نہ چھپا جانا
کیا کام کیا تم نے، تھی یہ بھی ادا کوئی　　پردے سے نکل آنا اور جی میں سما جانا

ٹک جس سے کہ دل میں پیار رکھا　　دو نظروں میں اس کو مار رکھا،

کون سمجھا اس سے میری چشم تر نے کیا کہا،　　زیر لب پھر اس نگار سیمبر نے کیا کہا
سیکڑوں پروانے سن جسکو لگن میں رہ گئے　　وقت رخصت کیا کہوں شمع سحر نے کیا کہا

جانا بھی اس کے پاس کا میں کم کیا ولے　　ہرگز نہ درد عیش کا آزار کم ہوا

کچھ نہ پتنگے ہی کا تن جل گیا،　　شمع کی گرمی سے لگن جل گیا،

گہ روئے خون گہ اشکوں سے دامان بھر لیا　　ہمنے شب فراق میں چاہا سو کر لیا،
ایسی ادا سے کھینچا تھا کل اس نے مصحفی　　ہاتھ اس کا میں نہ ہاتھ میں بار دگر لیا،

خورشید جھکا پڑے تھا جس جا　　کیا جانئے کس کا وہ محل تھا

رات سنسان سی مجلس جو نظر آتی تھی　　اور سب تھے مگر اک مصحفی زار نہ تھا

دل میں کھبتی ہے نازنیں کی ادا　　ہائے ری چشم سرمگیں کی ادا
تیغ رکھ دے کہ قتل کرتی ہے　　خود ترے دست و آستیں کی ادا

ہے یہی عشق ترنم تو کبھی باغ کے بیچ　　جی نکل جائے گا بلبل کی صدا پر میرا

جب تک یہ محبت میں بدنام نہیں ہوتا　　اس دل کے تئیں ہرگز آرام نہیں ہوتا
کب وعدہ نہیں کرتیں ملنے کا تری آنکھیں　　کس روز نگاہوں میں پیغام نہیں ہوتا

دود جگر جو سلسلہ جنبان برق تھا　　شب دست صد تپش میں گریبان برق تھا
لیلی چلی تھی وادی مجنوں کو جس گھڑی　　ناقہ کی جست و خیز میں عنوان برق تھا
اب کیا ہوا جو آہ کی طاقت نہیں ہمیں　　سینہ کبھی تو عرصۂ جولان برق تھا
آپی انھوں کو آگ لگی آپی جل بجھے　　خرمن پہ اہل درد کے بہتان برق تھا
بلبل کا آشیانہ جلا پھول بچ رہے　　یہ سر پہ باغبان کے احسان برق تھا

ماتم میں اسکے جس کی نت آنکھوں سے خوں بہا　　مژگاں کو اپنی تم نے کیا نم تو کیا ہوا
تو آشنا رہے مجھے کچھ اس کا غم نہیں،　　بیگانہ مجھ سے ہو گیا عالم تو کیا ہوا

جاتا تھا جی چلا تری رفتار کے جو ساتھ
شب ہر قدم ترا مجھے کوسِ رحیل تھا

کس طرح کریں ضبط فغاں ہو نہیں سکتا
ہم سے تو غمِ عشق نہاں ہو نہیں سکتا

عاشق ہی مری جان گزر جاتے ہیں جی سے
ہر ایک سے یوں جی کا زیاں ہو نہیں سکتا

ہے مصحفی وا اگرچہ مری چشمِ بصیرت
اس پر بھی تماشائے جہاں ہو نہیں سکتا

آئی شبِ فراق تو اک بار مصحفی
چلنے سے رہ گیا یہ ہوا آسماں کو کیا

اے فلک رکھ نہ تو یہ بات روا میرے بعد
ہاتھ میں گل کے ہو دامانِ صبا میرے بعد

چُھریوں کو جس طرح کہ رکھے سان پر کوئی
آواز ہائے خوش کا یہ عالم ہے راگ پر

عشق و حُسن و سرود میں ہے لاگ
سچ جو پوچھے کوئی ہیں تینوں آگ

جنگل تمام پھنکنے لگا دودِ آہ سے
اے مصحفی لگے ترے دیوانہ پن کو آگ

جوش ایسا ہے پسینے کا، بھری تھی گویا
کوٹ کوٹ اُس گلِ رعنا کے بدن میں شبنم

شرمندہ تری رو سے ہیں اے زخمِ جگر ہم
قابل ہے رفو کے نہ تو شایستۂ مرہم

اس وقت کہ شاید تو ہمیں یاد کرے گا
جب جی سے تری یاد میں جاویں گے گزر ہم

کبھی پیدا کبھی ناپید ہیں ہم
غرض دامِ وفا کے صید ہیں ہم

دامن کشی کی ہاتھ کو اپنے سزا نہ دوں
جس عضو سے گناہ کیا ہے جلا نہ دوں

پیچھے پڑا ہے جان کی وہ میرے مصحفی
کس طرح زندگی کا یہ جھگڑا مٹا نہ دوں

خواریاں، بدنامیاں، رسوائیاں
عشق نے شکلیں یہ سب دکھلائیاں

ایک صورت کے لئے اس عشق میں،
سیکڑوں صورت کی ہیں رسوائیاں

ہم سے پوچھے کوئی عزلت کے مزے
گوشۂ صحرا ہے اور تنہائیاں

زیرِ نقاب آنکھوں ہائے رے اُن کی جالیاں
ہمکو تو بس ڈبو گئیں نیل کے کٹڑے والیاں[ل]

اک شرر آہ کا مرے باعث شور و شر ہوا
جگنو کو دیکھ جس طرح لڑکے بجائیں تالیاں

پائے جنونِ عشق ہے اب عزلت آشنا
پھرتا تھا جن میں اس نے وہ گلیاں ہیں بھولیاں

کچھ مصحفی سے خوب نہیں یہ لڑائیاں
جانے دیں قصہ آپ بھی اب درگزر کریں

جوں چراغِ سحری مجھ میں ہے اب کیا باقی
مصحفی سچ ہے کوئی دم ہی کا مہماں ہوں میں

(اڈیٹر)

ل نیل کا کٹڑا دلی کا ایک محلہ ہے